باسفورس کے کنارے

جدید ترکی بغاوت سے پہلے بغاوت کے بعد

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

نام کتاب	باسفورس کے کنارے
مصنف	مفتی ابولبابہ شاہ منصور
تعداد	۱۱۰۰
اشاعت اول	جنوری ۲۰۱۷
ناشر	الحجاز کراچی

ملنے کا پتہ

مکتبۃ الخلیج، دکان نمبر 11، سلام کتب مارکیٹ

نزد جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے
جو بڑا مہربان اور نہایت رحیم و کریم ہے۔
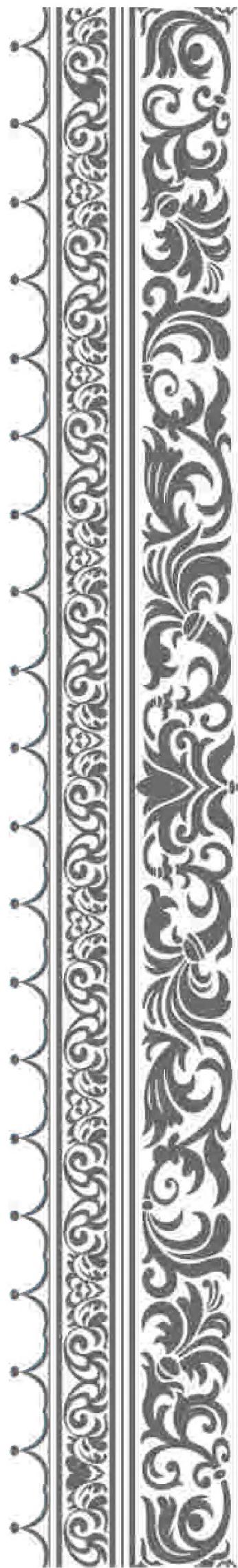
انتساب...

14 جولائی کی رات

اور

اس میں ہونے والے شہیدوں، زخمیوں اور غازیوں کے نام

جنہوں نے ''ترکِ ناداں'' کے ایک وارث کی بغاوت ناکام کر کے

''ترکِ دانا''

کی وراثت زندہ کرنے کی کوشش کرنے والوں کا سفر ستر سال پیچھے

لے جانے سے روک دیا۔

اللہ تعالیٰ ان کی قربانیاں قبول فرما کر ان کی توقعات

کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

آمین

فہرست

بغاوت سے پہلے

☆☆☆☆

بغاوت کے بعد

ناکام بغاوت: عالمی لکھاریوں کی نظر میں

باسفورس کے دو کنارے

مقدمہ

باسفورس کا پرلا کنارہ آج تک ناممکن کو ممکن بنانے کے حوالے سے یادگار تھا اور اب اس کے اُرلے کنارے ایسا ایک واقعہ ظہور پذیر ہو گیا ہے کہ باسفورس رہتی دنیا تک ممکن کو ناممکن بنانے کے حوالے سے بھی یادگار رہے گا۔ آج سے تقریباً سات صدیاں قبل باسفورس کے کنارے سلطان محمد فاتح کے زمانے میں ایک تاریخ رقم ہوئی تھی جسے حال ہی میں ترکی کے اسلام پسندوں نے دہرایا۔ عثمانی مجاہدین نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا اور اردگانی رضا کاروں نے ممکنہ طور پر کامیاب ہوتی بغاوت کو ناممکن بنا دیا۔ یہ مماثلت دنیا کے مؤرخین کو باسفورس کا کنارہ کبھی بھلانے نہ دے گی۔

وہ تاریخ کا سنہری لمحہ تھا جب 21 سالہ نوجوان فاتح نے فیصلہ کیا: ''یا قسطنطنیہ مجھے لے گا یا میں قسطنطنیہ کو لے کر رہوں گا۔'' اس کے بعد وہ ایسی تدبیر سوچنے میں جت گیا جس کے ذریعے

قسطنطنیہ کے ناقابل تسخیر حصار کو توڑا جا سکے۔ ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے اس نے روحانی اور مادی ہر طرح کے اسباب و تدابیر کو اختیار کیا۔ وہ استخارہ کر کے عالم الغیب سے بھی مدد مانگتا تھا۔ چالیس دن سے زائد استخارے کے علاوہ وقت کے ممتاز ترین صوفیاء، بزرگان دین اور مستجاب الدعوات شخصیات سے دعائیں کرواتا تھا۔ یورپی ماہرین سے ایسی دور مار توپیں بنوائیں جن کی مثال اس وقت روئے زمین پر نہ تھی۔ آدمی جب کسی مقصد کے لیے فنا ہو جائے تو بالآخر مقصد میں حائل رکاوٹیں فنا ہو کر رہتی ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ خشکی پر جہاز کا نہ کوئی تصور تھا نہ خواب...... لیکن یہ تصور حقیقت بن گیا اور یہ خواب تعبیر پا کر رہا۔ قسطنطنیہ تو نوجوان سلطان کو نہ لے سکا لیکن سلطان نے بالآخر قسطنطنیہ کو حاصل کر کے ہی دم لیا۔ یہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریبا ساڑھے سات سو سال بعد کا واقعہ ہے۔

اس کے تقریبا مزید سات سو سال بعد اس خلیج کے دوسرے کنارے پھر ایک حیرت انگیز انقلابی واقعہ رونما ہوا۔ اس مرتبہ قسطنطنیہ پر حملہ نہیں، اس کا دفاع کرنا تھا۔ اقدام کی نہیں، تحفظ کی ضرورت تھی۔ اللہ کی شان کہ اس گئے گذرے دور میں اسلام پسند پھر بازی لے گئے۔ امریکی ریاست پنسلوانیا میں بیٹھا ایک جلاوطن شخص مغربی دنیا کی مدد کے سہارے اپنی تربیت یافتہ فوجی اور غیر فوجی طاقت لے کر ایک ایسے معمار وطن شخص پر چڑھ دوڑا جو مصطفیٰ کمال پاشا کی جگہ سلطان محمد فاتح کو اپنا ہیرو سمجھتا تھا۔ وہ ہر سال یہاں ایک مثالی تقریب منعقد کر کے مسلمانوں کو ان کی تاریخ یاد دلاتا اور آیات و احادیث پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ سیکولر لوگوں کے ہاتھوں خلافت ساقط ہونے اور قسطنطنیہ ہاتھ سے جاتے رہنے کے بعد دوبارہ اسے اذانوں اور تکبیروں کے سائے میں لانا چاہتا تھا۔ اس غرض کے لیے وہ اس شہر کی میئر شپ سے لے کر اس ملک کی صدارت تک کا کٹھن سفر طے کر چکا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ مساجد کی تعمیر، اوقاف کی بحالی،

حجاب کا احترام، شراب پر جزوی پابندی، دنیا کے مظلوموں کی ہر ممکن مدد، مہاجرین کی خدمت، اپنی قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے مقدور بھر کوشش...... اس کے سفر کی رفتار اور کارکردگی پر اہل توحید دعا گو اور مہربان دشمن سخت نامہربان تھے۔ اس کی یہ ادا ان لوگوں کو پسند نہ تھی جو کمال پاشا کے سرپرستوں کی باقیات تھیں اور کمال پاشا کی باقیات کو باقی رکھنے پر مصر تھیں۔ انہوں نے پنسلوانیا کے اس جلاوطن رہنما کی مکمل پشت پناہی کی جو قسطنطنیہ کو دوبارہ لینے اور آیا صوفیہ میں پھر سے اذان جاری کرنے کی کوشش کرنے والے کو ناکام بنانا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس کی غیر موجودگی میں مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ شب خون مارا گیا۔ خشکی پر جہاز کو لا کر باسفورس میں ڈالنا ان کے بس میں نہ تھا۔ انہوں نے باسفورس پل پر ٹینک چڑھا دیے۔

لیکن پھر قدرت کی شان ظاہر ہوئی۔ مظلوموں کی دعائیں رنگ لائیں۔ مخالفین کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ ایک فون کال نے ترک قوم میں جذبے کی آگ بھر دی۔ وہی آگ جس نے خشکی پر جہاز چلوا دیے تھے۔ اسی آگ نے اسی باسفورس پل پر انہیں ٹینکوں کے سامنے لیٹ جانے کی جرأت دے دی۔ گولن صاحبان کی بغاوت کامیابی کی دہلیز چومنے کے بجائے مثالی ناکامی کا داغ لے کر باسفورس پل پر پچھاڑ دی گئی۔ آسانی سے ممکن نظر آنے والی چیز قطعاً ناممکن دکھائی دینے لگی۔ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ پچھلی مرتبہ آگ اور خون کا معرکہ صبح سے ظہر تک جاری رہا تھا۔ اس مرتبہ رات سے صبح تک جاری رہا۔ جرأت کمینگی پر اور غیرت خیانت پر غالب آئی۔ باسفورس کا کنارہ دنیا کو پھر ایک یادگار واقعہ دے گیا۔ قربانیاں دینے والے سربکف سربلند اور ضمیر فروش شرمندہ و رسوا ہو گئے۔ عصر حاضر کی امت مسلمہ ایک بڑی چوٹ کھانے سے، سخت دھچکا لگنے سے بچ گئی۔ اللہ نے اسلام پسندوں کی لاج رکھ لی۔ اب دشمن اگلے معرکے کی تیاری میں ہے، لہٰذا دوستوں کو چاہیے کہ جشن فتح کو طول دینے کے بجائے فکر فردا پر زور دیں۔

اسی خاطر یہ کتاب پہلے واقعے کی یاد زندہ کرنے اور دوسرے کو یادگار بنا کر زندہ رکھنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے آدھے مضامین بغاوت سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ جو تیسری مرتبہ ترکی قیام کے دوران تاثرات و مشاہدات اور مطالعے و ملاقات کے حوالے سے لکھے گئے تھے۔ دوسری قسم کے مضامین میں راقم کے لکھے گئے کالموں، انٹرویوز اور بیانات کے علاوہ وہ تحریریں بھی ہیں جو بغاوت کے دنوں میں دنیا بھر سے لکھی گئیں۔ یہ تاریخ کی اس گواہی کو محفوظ کریں گی جو باسفورس کے کنارے خونِ شہیداں سے رقم ہوئی تھی۔ دنیا اسلام پسندوں کو طعنے دے دے کر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ کلمہ گو مظلومانِ عالم کو یاد دلایا جائے کہ ان کی قدیم تاریخ میں جس طرح باسفورس کے کنارے خشکی پر جہاز چلنے کے واقعات ہوتے تھے، اسی طرح معاصر تاریخ میں باسفورس کے پل پر لوہے کے ہاتھی نما ٹینکوں کو نہتے جسموں سے روکنے جیسے واقعات بھی ہوتے ہیں۔ انہیں یاد رہنا چاہیے: اللہ آج بھی آسمانوں پر موجود ہے اور وہ ایک حد سے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ لہٰذا ہم بھی اس حد کو عبور نہ کریں جس کے بعد وہ آئی ہوئی نعمتوں کو کسی اور کی گود میں ڈال دیتا ہے۔

سلطان فاتح کی مسجد میں:

آخر میں وہ واقعہ لکھنا چاہوں گا جو سلطان فاتح کی مسجد میں پیش آیا اور اس کتاب کی تالیف کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔ یہ احقر جن دنوں ترکی میں ''آپ ہدایہ کیسے پڑھیں؟'' کے نام سے دورہ کروا رہا تھا۔ اس زمانے میں وہاں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو شاگرد تشریف لے آئے۔ ایک تو شام کے مشہور عالم شیخ محمد عوامہ صاحب دامت برکاتہم جن سے اجازت حدیث کا یادگار واقعہ راقم اسی کتاب میں تحریر کر چکا ہے۔ دوسرے عراق کے مشہور عالم شیخ عبدالسمیع انیس صاحب۔ میزبانوں سے درخواست کر کے ان کی زیارت اور ان سے اجازت

حدیث حاصل کرنے کی ترتیب بنائی گئی۔ اللہ کی شان کے سلطان محمد فاتح کی مسجد میں ملاقات طے ہوئی۔ اس کے ایک کنارے بیٹھ کر ہم نے شیخ کی ترتیب دی ہوئی سو احادیث پر مشتمل کتاب "الأوائل الحديثية المئة" کی قرأت اور سماع کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ شیخ نے اس کتاب میں حدیث مبارک کی سو کتابوں سے پہلی حدیث جمع کی ہوئی ہے۔ پہلی حدیث وہ خود پڑھتے اور پھر باری باری سب حاضرین ایک حدیث پڑھتے۔ پھر شیخ خود وہ حدیث پڑھتے جو حاضرین کی باری ختم ہونے کے بعد ان کے سامنے آتی پھر دوبارہ باری شروع ہو جاتی۔ اس دوران اٹھارہویں کتاب ''مسند احمد'' کی پہلی حدیث شریف آ گئی۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت اور اس لشکر اور اس کے امیر کی تعریف پر مشتمل حدیث مسند احمد میں ہے۔ (حدیث: 18957-

حدثنا عبد الله بن محمد بن أبي شيبة، قال عبد الله بن أحمد: وسمعته أنا من عبد الله بن محمد بن أبي شيبة، قال: حدثنا زيد بن الحباب، قال: حدثني الوليد بن المغيرة المعافري، قال: حدثني عبد الله بن بشر الخثعمي، عن أبيه أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: "لتفتحن القسطنطينية، فلنعم الأمير أميرها، ولنعم الجيش ذلك الجيش." قال: فدعاني مسلمة بن عبد الملك فسألني، فحدثته، فغزا القسطنطينية. (مسند الإمام أحمد بن حنبل)

ترجمہ: امام احمد اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن بشر خثعمی سے اور وہ اپنے والد بشر بن ربیع خثعمی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو فرماتے سنا: ''تم ضرور بالضرور قسطنطنیہ فتح کر لو گے تو اس کا امیر بہت اچھا انسان ہوگا اور وہ لشکر بھی بہت اچھا لشکر ہوگا۔''

شیخ نے فرمایا: دیکھیے! اللہ تعالیٰ کا کیسا فضل و کرم ہے کہ ہم اسی سلطان کی مسجد میں بیٹھ کر یہ حدیث پڑھ رہے ہیں جس کے متعلق یہ بشارت وارد ہوئی ہے۔ محدثین کا قاعدہ ہے کہ ایک

عادل کے تزکیہ کو بھی معتبر سمجھ کر روایت کو قبول کرتے ہیں۔ سلطان فاتح کی خوش قسمتی ہے کہ اس کا تزکیہ وتعدیل خود امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ تمام حاضرین اس حسن اتفاق پر حیران رہ گئے اور ہر طرف سے ''سبحان اللہ'' کی صدائیں بلند ہوئیں۔ واقعی ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس حدیث کی اجازت اس مسجد میں نصیب ہوگی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی فضل وکرم باسفورس کے کنارے ظہور ہونے والے حیرت انگیز واقعات کی برکات میں سے ایک ادنیٰ برکت ہے جو ان شاء اللہ اس کتاب کے ان قارئین کو بھی نصیب ہوگی جو اپنی زندگی کا مقصد اللہ کے دین کی سرفرازی کو بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کی خدمت کا سچا جذبہ نصیب فرمائے اور دین کی خدمت کرنے والوں کی خدمت اپنا شعار بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شاہ منصور

ربیع الاول: ۱٤٣٨ھ

سلطان فاتح کے شہر میں

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ اُمّت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ ہے
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تُربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

علامہ محمد اقبال

"بغاوت سے پہلے"

اللہ خیر رکھے

عقل و فراست اور تدبیر و حکمت کے ساتھ شجاعت و جرأت جمع ہو جائے تو سمجھیے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسانوں پر تمام ہو گئیں۔ اس جملے میں راقم الحروف نے ''انسان'' کے بجائے ''انسانوں'' اس لیے کہا کہ ایسا شخص جس میں یہ صفات جمع ہوں اگر انہیں خیر کے راستے میں خلق خدا بھلائی کے لیے استعمال کرے تو یہ صفات اس کے آس پاس والوں کے لیے بھی نعمت ہوتی ہیں۔ ایسی صفات والے لوگ اپنے جیسے دوسرے ہزاروں، لاکھوں بے زبان انسانوں کے لیے قائد ہوتے ہیں اور وہ کچھ کر جاتے ہیں جو ان کے ماتحت انسان صرف سوچ رہے ہوتے ہیں، کر نہیں پاتے...... یا سوچ بھی نہیں سکتے، محض آرزو لیے دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

ترکی کے موجودہ صدر رجب طیب اردگان...... اللہ خیر رکھے...... ایسے ہی نادر قسم کے لوگوں میں سے لگتے ہیں۔ ان کی جو ''حرکتیں'' انہیں انسانی تاریخ کے اس قسم کے لوگوں میں شمار کرتی

ہیں، وہ دونوں قسم کی ہیں: اندرون ملک بھی بیرون ملک بھی۔ انہیں اگر ترتیب سے گنوانا شروع کیا جائے تو مبالغہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اندرون ملک صورتحال اس وقت یہ ہے کہ طیب اردگان ترکی کی معاصر تاریخ کے مقبول ترین اور ہردل عزیز حکمران شمار ہوتے ہیں۔ ترک عوام میں ان کی شہرت ومقبولیت کا عالم یہ ہے کہ وہ اس وقت مسلسل منتخب ہونے کا عالمی ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ شروع کے دو تین انتخاب میں تو انہیں محض مقامی حریفوں کا سامنا تھا۔ آخری دو مرتبہ تو وہ تمام عالمی قوتیں اور ان کے مقامی ہرکارے جس کی آنکھوں میں یہ ''پینٹ پتلون'' میں ملبوس ''غیر متشرع آدمی'' کھٹکتا تھا، کھل کر میدان میں آگئے۔ نامعقول ہتھکنڈوں اور بے ہودہ الزامات کا طوفان بدتمیزی تھا جو برپا ہوا۔ غیر ملکی سرمائے کا انبار تھا جو اردگان کو ناکام کرنے کے لیے بے دریغ لٹایا گیا۔ عدلیہ، پولیس اور انتظامیہ میں موجود ''گولن نواز'' نفری تھی جسے گزشتہ عشرے میں مخصوص تعلیمی اداروں میں تیار کیا گیا تھا، اس کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ اسٹاک ایکسچینج سے سرمایہ نکالنے سے لے کر لوگوں کو سڑکوں پر بکھیرنے تک اردگان کو کمزور کرنے کا کوئی ہتھکنڈا نہ تھا جو آزمایا نہ گیا ہو، مگر اس وقت اس شخص کی ہمت واستقامت اور تدبیر وفراست کی داد دشمن بھی دیے بغیر نہ رہ سکے جب اس نے سب کو نیچا دکھاتے ہوئے پہلے سے زیادہ نمایاں کامیابی حاصل کی اور اقتدار میں آتے ہی پہلے سے زیادہ محنت کے ساتھ ملک کی بہتری کا کام کرنے کے ساتھ مخالفین کو رام ہونے یا واپس بلوں میں چھپ جانے پر مجبور کر دیا۔

جس طرح پسماندہ ممالک کے بدعنوان حکمرانوں کا کوئی نہ کوئی اسکینڈل وقتاً فوقتاً عوام کے سامنے آتا رہتا ہے اور ان کی بدنامی اور غیر مقبولیت کا سبب بنتا رہتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس کے برعکس ترکی میں وقتاً فوقتاً اردگان کے ایسے منصوبے اور کارنامے سامنے آتے رہتے ہیں جو اس کی مقبولیت اور ہردل عزیزی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ دنیا کے سب

سے بڑے ایئرپورٹ کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہوتے ہیں جسے انہوں نے ''سلطان صلاح الدین ایوبی'' ایرپورٹ کا نام دیا ہے۔ کبھی وہ آبنائے باسفورس میں زیرآب تیز رفتار ترین ریل کی پہلی روانگی کے وقت اپنے وزراء کے ساتھ ہنستے مسکراتے ترک عوام کو اپنے سچے اور دیانت دار ہونے کا یقین دلاتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ایک منصوبہ تو کبھی دوسرا۔ کبھی ایک حیرت انگیز کارنامہ اور کبھی دوسرا۔ غرض کہ تسلسل کے ساتھ خبریں آتی رہتی ہیں کہ اردگان کے مخالف جو کچھ کہتے رہیں، وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ یہ خبریں ایسی پے در پے ہوتی ہیں کہ نہ مخالفین کو سر اٹھانے، زبان کھولنے کا موقع ملتا ہے نہ عوام کو کسی کے پروپیگنڈے پر کان دھرنے کا۔

اردگان نے ترکی کو محدود کر کے سمیٹنے والے ''بابائے ترک'' مصطفیٰ کمال پاشا کے بجائے ترکی کو وسعت دینے اور تاریخی فتح دلوانے والے تاریخ کے عظیم حکمران ''سلطان محمد فاتح'' کو اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے۔ حال ہی میں جب مئی (2015ء) کو قسطنطنیہ کی فتح کا یادگار دن آیا تھا اس نے ''شاخ زریں'' (گولڈن ہارن) کے کنارے عظیم الشان تقریب منعقد کی۔ اس میں سب سے پہلے خود "إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا" والی آیت پڑھی۔ پھر وہ حدیث شریف انتہائی خوب صورت عربی لہجے میں پڑھی جس میں قسطنطنیہ اور فاتح قسطنطنیہ کے متعلق بشارت دی گئی ہے۔ اس کے بعد حاضرین کو اس فتح کے یادگار مناظر دکھائے گئے اور ترک عوام کو جنگ عظیم دوم میں ترکی کو شکست دلوانے والوں کے بجائے خلافت عثمانیہ کے دنوں میں ان کو فتح دلوانے والوں سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔

اندرون ملک کامیابیوں کا تناسب اس قدر عظیم الشان اور حیرت انگیز ہے کہ بیرون ملک ''اردگان'' کی عالم اسلام کے لیے خدمات سے قطع نظر کر لیا جائے تو بھی وہ معاصر تاریخ کا مضبوط ترین اور قابل ترین حکمران نظر آتا ہے۔ اگر بیرون ملک اس کی مسلمانوں کے لیے اور

مظلوم انسانیت کے لیے خدمات کا جائزہ لیا جائے تو موجودہ مسلمان حکمران بونے نظر آنے لگتے ہیں۔ دنیا کے کسی مسلم ملک میں زلزلہ، طوفان، سیلاب آئے یا دہشت گردی و مسلم کشی کی لہر۔ آپ اردگان کو اور اس کی ٹیم کے ارکان کو سب سے پیش پیش، سب سے زیادہ فعال اور متحرک پائیں گے۔ پاکستان کے زلزلے سے لے کر صومالیہ کی قحط سالی تک، سب سے نمایاں اور معیاری خدمات ترک رضا کاروں کی ہوتی ہیں۔ شام کے مسلمانوں کو تو اردگان کی صورت میں لگتا ہے کوئی فرشتۂ رحمت مل گیا ہے کہ ہجرت کی معاصر تاریخ میں مہاجرین کی اتنی خدمت اور ایسی معیاری سہولتوں کی فراہمی کی مثال نہیں ملتی۔ عرب قومیت کا نعرہ لگانے والے تو کہیں نظر نہ آئے اور اردگان نے آگے بڑھ کر شام کے مہاجرین کو اس انداز میں گلے لگایا کہ ''مواخات مدینہ'' کی یاد تازہ کر دی۔ برما کے غریب اور دور دراز بستے مسلمان جب مسلمانوں سے بلکہ انسانیت کے نام سے مایوس ہونے لگے تھے تو اردگان سامنے آیا اور برما کے مظلوموں کو یوں گلے لگایا کہ ان کے غم اور دکھ گویا آبِ شفاء سے دھو ڈالے۔ ان بے چاروں کی تین نسلیں ظلم سہتے سہتے گزر چکی تھیں۔ اب انہیں نہ زمین پناہ دے رہی تھی نہ سمندر۔ پوری دنیا خاموش تماشائی تھی کہ اتنے میں اردگان اور اس کے وزیر آ پہنچے اور رہتی دنیا تک مثال قائم کر دی۔

دراصل ہمارے حکمرانوں کو مرنے کا اتنا شوق نہیں ہوتا جتنا زمانہ ظالم ہوتا ہے۔ ظلم اور جانبداری کی انتہا یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا کا میڈیا یہ کہتا نظر آتا ہے کہ اردگان نے ایک ہزار کمروں کا محل بنوایا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ محل بنایا نہیں، ایک متروک اور اجاڑ محل کو بسایا ہے۔ اور یہ ذاتی استعمال کا محل نہیں، صدارتی عملے اور وزراء اور ان کے کثیر التعداد معاونین کے دفاتر ہیں۔ اس ''پرتعیش رہائش گاہ'' میں صرف اردگان اور ان کا خاندان نہیں رہتا اور نہ دورِ صدارت کے بعد اردگان اس میں آ سکیں گے۔ اس میں تو ان کا وہ بکھرا ہوا عملہ یک جا مصروف کار ہے

جس کی کارکردگی کو منظم اور تیز رفتار کرنے کے لیے انہوں نے اس صدارتی عمارت کو چھتری کے طور پر استعمال کیا۔ اس تلے ہونے والے کام جس طرح دنیا کو پسند نہیں، اسی طرح وہائٹ ہاؤس کے طرز پر منظم انتظام بھی مغرب نواز گولن گروپ کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ ان کے سیاسی حریف کمال کلیچ دار اولو نے دعویٰ کیا تھا کہ نئے صدارتی محل میں (جبکہ یہ صدر ہاؤس ہے نہ کہ صدارتی محل) سونے کا پانی چڑھی ٹوائلٹ لگائی گئی ہیں۔ اردگان نے کمال کلیچ دار اولو کے اس الزام کی تردید کی ہے کہ انہوں نے ٹیکس دہندگان کے پیسے سے اپنے غسل خانے کو سجایا ہے۔ اردگان نے کہا: ''میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور محل کا دورہ کریں۔ اگر انہیں ایک بھی سونے کی ٹوائلٹ سیٹ ملتی ہے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ اگر انہیں نہ ملی تو کیا وہ ریپبلکن پارٹی کو استعفیٰ دیں گے؟'' مخالفین کو سانپ سونگھ گیا اور سمجھ نہ آیا کہ اس چیلنج کے نتیجے میں ہونے والی سبکی سے کیسے جان چھڑائیں؟

انسانیت کے خیر خواہوں کو مرسی صاحب سے بھی اتنی ہی ہمدردی ہے جتنی الجزائر کے منتخب اور پھر معزول ہو کر فوجی حکومت مسلط کیے جانے والے صدر سے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلم حکمرانوں کو نظریے کی سچائی، سوچ کی بلندی، کردار کی پختگی کے ساتھ حکمت و شجاعت دونوں اوصاف سے ایسا نوازے کہ وہ اپنوں کی امیدوں پر پورا اتریں، دشمنوں کی سازشوں کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں اور ملک و ملت کی ترقی کے لیے دیانت و اہلیت کے ساتھ تادیر کام کرتے رہیں۔ اللہ خیر کرے، خیر رکھے اور ہم سب کو خیر کے دن دکھائے۔

ایک یادگار دن کی روئیداد

28رشوال 1436ھ بمطابق 14راگست 2015ء اس فقیر کی زندگی کے باسعادت ترین دنوں میں سے ہے۔ احقر یہاں استنبول میں ہدایہ شریف کی ''کتاب البیوع'' کے 25 روزہ دورے کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ اس دورے میں حضرت الاستاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی مایہ ناز کتاب ''فقہ البیوع'' کا آخری حصہ جس میں اسلامی مالیاتی قوانین یا اسلامی اقتصادی ستور 235 دفعات کی شکل میں دیا گیا ہے، بھی شامل درس ہے۔ فقیر کا ہدایہ پر مقدمہ "ارشاد الطالب الی مافی الھدایۃ من المطالب" اور قواعد الفقہ بھی پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ شرکاء میں کئی ملکوں کے علماء اور دکتور حضرات شامل ہیں۔ چونکہ استنبول میں اس وقت عراق، شام، مصر اور یمن کے کبار مشائخ موجود ہیں، اس لیے فجر کے بعد اور عصر تا عشاء ان حضرات کے حلقات درس میں حاضری اور ان سے ''اجازت

حدیث'' کی برکت وسعادت حاصل کرنے کا سلسلہ بھی رہتا ہے۔ پچھلے ہفتے جب علامہ کوثریؒ کے آخری اجازت یافتہ شاگرد جناب شیخ امین سراج حفظہم اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حصولِ اجازت کے لیے حاضری دی تو انہوں نے تعارف اور کارگزاری سننے کے بعد فرمایا کہ کچھ دنوں تک آتے رہو۔ ہم روز ظہر کی نماز حضرت کے ہاں سلطان فاتح مسجد میں پڑھتے تھے۔ آخر کار انہوں نے اجازت سے مشرف فرمایا۔ اب ہمیں عادت ہوگئی کہ اپنا درس ختم کرتے ہی سلطان فاتح مسجد چل پڑتے اور ظہر حضرت کے ہاں پڑھتے ہیں۔

ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ مشہور محدث ومصنف شیخ الشیوخ حضرت عبدالفتاح ابوغدہؒ کے مایہ ناز شاگرد جناب شیخ محمد عوامہ صاحب دامت برکاتہم کسی کانفرنس کے سلسلے میں تشریف آوری کے موقع پر اپنے دیرینہ رفیق اور استاذ بھائی شیخ امین سراج صاحب سے ملنے کے لیے ان کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ ایک ہی آستانے پر غیر متوقع طور پر آفتاب وماہتاب کی اکٹھی زیارت ایسی نعمت غیر مترقبہ تھی جس پر مارے خوشی کے ہمارے رفقاء پھولے نہ سماتے تھے۔ اس دن تو بات فقط زیارت ودست بوسی تک محدود رہی، کیونکہ ان حضرات کا مزاج اجازت حدیث کے حوالے سے ذرا منضبط اور تعمیم کلی کے بجائے تخصیص وتقیید قسم کا واقع ہوا ہے۔ بروز جمعہ سلطان محمد فاتح میں ''کلیۃ العلوم اسلامیۃ'' کے عمید (Dean) دکتور احمد طوران صاحب کا فون آیا کہ دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ تناول کریں۔ ملاقات کے لیے جامع سلطان محمد فاتح میں نماز جمعہ طے ہوئی۔

جمعہ کی پرشکوہ اجتماع میں حاضری، سلطان فاتح کے مختصر دورے اور ''شاخ زریں'' (گولڈ بارن) کے کنارے پرتکلف ظہرانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی زیرسرپرستی چلنے والے ادارے ''مولوی خانہ'' کی زیارت کے لیے گئے۔ یہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے زمانے کی

متروکہ خانقاہ تھی جسے اردگان حکومت نے تعمیرِ نو کے بعد اصلاحی اور علمی سرگرمیوں کے لیے دکتور احمد طوران صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ وہاں چائے کی محفل کے دوران اس عاجز نے اپنے میزبان سے عرض کیا کہ آپ کے استاذِ محترم جناب شیخ امین سراج صاحب کے رفیقِ خاص جناب شیخ عوامہ صاحب حفظہم اللہ مدینہ منورہ سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آج جمعہ کا دن ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ان سے ملاقات اور خدمت میں حاضری ہو جائے۔

آگے کے واقعات جن غیبی فتوحات کے تحت پیش آئے، اس کا ہم نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی پے در پے نعمتوں کی ایسی برسات ہوئی کہ ہمارا کوتاہ دامن چھوٹا پڑ گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تو آج میزبانِ رسول سیّدنا حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مرقد مبارک پر میرے شیخ اور چند خواص کے ساتھ اکٹھے ہوں گے۔ میں ابھی رابطہ کر کے اجازت لے لیتا ہوں۔ چند منٹوں میں منظوری آ گئی اور ہم خوش خوش ''سلطان ایوب'' کے قدموں کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ہمارے دل کی بات منہ پر آ ہی گئی۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ زیارت کے دوران اگر حضرت کے مزاج پر گراں نہ ہو تو موقع دیکھ کر اجازتِ حدیث کی درخواست پیش کرنے میں حرج تو نہ ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ تو میری بھی دیرینہ خواہش تھی۔ شاید آپ کی معیت میں آج پوری ہو جائے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جناب شیخ امین سراج صاحب حفظہم اللہ تعالیٰ نے ہمیں چند دن حاضری کے بعد اجازت عطا فرما دی تھی اور ان سے محبت و عقیدت کا اچھا خاصا قلبی تعلق اور لگاؤ ہو گیا تھا۔

ہم جب پہنچے تو اکابر مشائخ کی محفل جاری تھی۔ سلام کر کے چپکے سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اب مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ جمعہ کا دن، مغرب کے قریب وقت اور سیّدنا حضرت ابوایوب

انصاریؓ کے قدم مبارک جیسا مقام۔ اگر آج گوہر مقصود ہاتھ آجاتا تو اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوتی؟ آخر دکتور احمد طوران نے ہمت کر کے ہماری طرف سے درخواست پیش کر دی۔ حضرت الشیخ نے حسب عادت عذر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس کا کہاں اہل ہوں؟ فقیر اور اس کے رفقاء خاموش تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس عاجز نے ہمت کر کے تمہید باندھی کہ خادم اس شہر میں مسافر و مہاجر ہے۔ بڑوں کے حکم پر ہدایہ شریف کی تدریس کے لیے حاضر ہوا ہے۔ مختصر قدروی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ اور ردالمحتار پر تھوڑا بہت کام کر چکا ہے جو زیر طبع ہے (خدام سے پتا چلا تھا کہ حضرت ہدایہ شریف کے عاشق ہیں) آنجناب کی دو کتابیں ''اثر الحدیث علی اختلاف الفقہاء'' اور ''أدب الاختلاف'' آپ کے دو شاگردوں جناب مفتی اسحٰق بانا صاحب اور جناب مفتی بلال صابر صاحب سے پڑھ کر پڑھا بھی چکا ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے قرابت ہے اور ان کے شاگرد علامہ محمد یوسف بنوریؒ کے مدرسے کا فارغ التحصیل ہوں جن کو حضرت کشمیریؒ نے اپنے داماد مولانا خاں بجنوریؒ کے ساتھ علامہ کوثریؒ کی خدمت میں مصر بھیجا تھا کہ ''نصب الرأیۃ'' اور اس پر علامہ کوثریؒ کے مقدمے کی شایان اشاعت کا انتظام کریں۔

اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہاں مولانا بجنوریؒ کے گھر والے ہمارے ہاں آئے تھے۔ ان معروضات سے حضرت کا التفات کسی قدر حاصل ہوا، لیکن بات اب بھی نہ بنی۔ اجازت سے عذر کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب شیخ امین سراج صاحب یہاں موجود ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے میں کیسے یہ جرأت کر سکتا ہوں؟ حضرت شیخ امین سراج صاحب کی خدمت میں حصول اجازت کے لیے حاضری کے دوران چونکہ اچھا خاصا تعارف ہو چکا تھا اور وہ ''ہدایہ شریف'' کی تدریس اور اس پر مختصر حاشیہ و معجم کی بنا پر اس عاجز سے انسیت کا اظہار کرتے اور شفقت فرماتے تھے، اس لیے ان کے دو شاگردوں دکتور احمد طوران اور دکتور حمدی ارسلان نے ان سے عرض کی

کہ آپ حضرت سے ہماری سفارش فرمادیں۔ انہوں نے بہت ہی محبت سے فرمایا کہ میں ان مہمانوں کو اجازت دینے کی بھرپور تائید کرتا ہوں۔ اس پر جناب شیخ عوامہ صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ یہ تو میرے بارے میں ایسا ہی سمجھتے ہیں، لیکن میں ان کی موجودگی میں ایسی جرأت مناسب نہیں سمجھتا۔ اب مغرب کا وقت قریب ہورہا تھا۔ بات بن نہیں رہی تھی اور اگر یہ بابرکت محفل برخاست ہوجاتی تو پھر ایسا مبارک وقت، ایسی مبارک جگہ اور ایسا نایاب موقع پھر کہاں ہاتھ آتا، لہٰذا فقیر نے اب وہ بات رکھنے کی جرأت کی جس کے متعلق سنا تھا کہ یہ حضرات اسے رَد نہیں فرماتے۔

فقیر نے ہمت مجتمع کرکے آخری کوشش کے طور پر عرض کیا: ''حضرت! ہم طلبہ آپ کی خدمت میں رحم اور صدقہ کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ ہم مسافر اور مہاجر فی سبیل اللہ فقیروں پر رحم فرماتے ہوئے اپنے علم کا صدقہ عطا فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت میں اپنی بارگاہ خاص سے اس کا خاص اجر عطا فرمائیں گے۔ یہ فقیر آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتا ہے اور آپ کی جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاندانی و روحانی انسیت ہے، اس کی بنا پر سائلانہ و عاجزانہ مکرر درخواست کرتا ہے۔'' حضرت چونکہ خود شام کے مشہور سادات خاندان سے تعلق رکھتے اور صاحب شجرہ، نجیب الطرفین سید ہیں، اس لیے یہ آخری جملہ کام کرگیا۔ حضرت نے شفقت و محبت کا اظہار فرمایا اور بڑی بشاشت اور فرحت سے ہمیں اجازت سے نوازا۔ مسنون خطبہ کے بعد اپنی تمام ''ثبت'' بیان کرکے اجازت دینے کے ساتھ آخر میں پانچ وصیتیں بھی فرمائیں جن کا ترجمہ ان شاء اللہ اگلے شمارے میں پیش کیا جائے گا۔

اس دوران حاضرین پر جو کیف و سرور طاری تھا، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آپ تصور کیجیے، کہاں مدینہ منورہ میں قیام پذیر حدیث شریف کے علم میں مہارت اور تصنیف کے لحاظ

سے دنیا کے چند گنے چنے لوگوں میں شمار ہونے والے مایہ ناز محدث، کہاں استنبول میں میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں نووارد پاکستانی طالب علم۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت غیر مترقبہ مقدر میں رکھی بھی تو کیسی مبارک جگہ، کتنے مبارک وقت اور کیسی منتخب صحبت میں؟ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ بِحَمْدِہٖ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔ مالک الملک اپنی قدرت و کرم نوازی کے کیسے کیسے مظاہر دکھاتا ہے، لیکن ہم نالائق بندے اس کا شکر بجالانے اور شکر گزاری کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور اپنے شکر گزار بندوں جیسے اعمال و خدمات کی توفیق نصیب فرمائے،

آمین یارب العالمین!

جامع مسجد سنگی یدم

انسان کی نیت درست، حوصلہ بلند اور عزم راسخ ہو تو وہ معمولی صلاحیت اور کمیاب وسائل کے باوجود کیا کچھ کرسکتا ہے؟ یا کیا کچھ نہیں کرسکتا؟ اس کی مثال لکڑیوں سے بنی ہوئی ''جامع مسجد سنگی یدم'' ہے۔ ''سنگی یدم'' کے معنی ترکی زبان میں ہیں: ''گویا کہ میں نے کھالیا'' عربی والے زائر اس مسجد کو'' جامع مسجد کأنی أکلت'' کہتے ہیں۔ یہ مسجد ترکی کے شہر استنبول کے مشہور محلہ 'فاتح'' میں ہے جو سلطان محمد فاتح کے نام سے موسوم ہے اور دیندار اور خانقاہی حضرات کا مسکن کہلاتا ہے۔ ترکی کے مشہور شیخ جناب حضرت محمود آفندی صاحب دامت برکاتہم کی خانقاہ اسی علاقے میں ہے اور سلطان فاتح کی قائم کردہ عالی شان مسجد بھی یہیں ہے جو مرجع خاص و عام ہے۔ اس عجیب وغریب نام والی مسجد کے بارے میں راقم نے ایک مرتبہ سنا تھا کہ کس قابل تحسین جذبے اور کیسے عجیب طریقے سے تعمیر ہوئی؟..... اس وقت سے اس کی مکمل تاریخ سے واقفیت اور براہ راست معلومات کے حصول کا شوق تھا۔ حالیہ سفر میں اس کی زیارت اور دوگانہ نفل پڑھنے کا

موقع ملا۔ چونکہ ایسے واقعات ان روایات کو جنم دیتے ہیں جو قوموں کے مزاج کی تعمیر کرتی اور ان کی ترقی کی ضامن ہوتی ہیں، اس لیے ان کو زندہ رکھنا نیکی کی روح کو زندہ رکھنے کے مترادف ہے۔ مسجد کے متولی اور ایک مقامی عالم جو ترکی کے آثارِ قدیمہ بالخصوص مساجد و خانقاہوں کی تاریخ کے ماہر تھے، سے جو معلومات حاصل ہوئیں، انہیں دستیاب تاریخ سے موازنہ کے بعد قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مؤمن کی نیک اور خالص نیت میں جو برکت اور قبولیت کی تاثیر ہوتی ہے، اس کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمائے گا۔

عجیب و غریب نام اور تاریخ رکھنے والی یہ مسجد 1750ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کی تعمیر کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ خیر الدین کیجی آفندی نامی ایک غریب اور مفلوک الحال شخص روز دیکھتا تھا کہ اس کے علاقے کے غریب باسی مسجد تعمیر نہ کرسکنے کے سبب پریشانی کا شکار ہیں۔ یہ نمازی اور دیندار لوگ تھے، لیکن محلّے کے نمازیوں کی گنجائش کے مطابق مسجد تعمیر کرنے کے وسائل ان کے پاس نہ تھے۔ خیر الدین آفندی روز کام کاج سے فارغ ہو کر شام ڈھلے گھر لوٹتا تو اس کی عادت تھی حسب حیثیت پھل، مٹھائی یا کھانے پینے کی چیز بچوں کے لیے لے لیتا تھا۔ ایک دن اسے مسجد کے لیے درکار رقم کی عجیب و غریب ترکیب سوجھی۔ اس دن وہ گھر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں پھل مٹھائی کے بجائے بچت جمع کرنے کا گلہ تھا۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ آیندہ جب اس کا دل کوئی چیز خریدنے کو چاہے گا تو وہ اپنے دل کو بہلا وا دے کر سمجھائے گا کہ گویا وہ اسے کھا چکا ہے، اس کا ذائقہ لے چکا ہے اور حلق سے پیٹ تک اس کی تاثیر سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔ اس کے بعد وہ اس رقم کو گلّے میں ڈال دے گا۔ خیر الدین آفندی نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد پوری استقامت سے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اب جب بھی وہ شام کو پھل فروش کے پاس سے گذرتا تو اپنے آپ سے کہتا: ''سنگی یدم'' (گویا میں نے کھا لیا) اور وہ پیسے بچا کر گلّے میں محفوظ کر دیتا۔ اس

پورے عرصے میں اس نے گوشت یا دوسری مہنگی چیزیں کھانا بھی چھوڑ دیں اور جب بھی اس کا یا اس کے گھر والوں کا دل ان مرغوبات کے لیے مچلتا تو وہ اس جملے (سنگی یدم) سے نفسیاتی تسکین حاصل کر لیتے کہ گویا ہم نے یہ چیزیں کھالی ہیں۔ ریاضت، زہد اور عزم کا یہ سفر جاری رہا حتی کہ ایک دن ایسا آیا جب خیر الدین اس قابل ہو چکا تھا کہ اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کر سکے۔ یہ مسجد آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے لکڑیوں سے تعمیر ہوئی۔ اس کی تعمیر میں تمام علاقے والوں نے رضا کارانہ حصہ لیا۔ چونکہ وہ خیر الدین کی مالی حیثیت اور پیسہ جمع کرنے کے طریقے سے واقف ہو گئے تھے اس لیے تعمیر مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اسے ''سنگی یدم'' کا نام دے دیا۔ مسجد چھوٹی سی ہے۔ اس میں تقریباً 200 نمازیوں کی گنجائش ہے۔ راقم جب اس کی زیارت کو گیا تو معلوم ہوا کہ جنگ عظیم دوم میں اس مسجد کو نقصان پہنچا تھا۔ گولہ باری سے لکڑیاں جل گئی تھیں۔ 1959ء میں جنگ کے خاتمے کے تقریباً دس سال بعد مقامی لوگوں نے اس کی تعمیر و مرمت کا عمل انجام دیا۔ طیب اردگان کی حالیہ حکومت چونکہ اسلامی آثار و شواہد کی حفاظت کا خوب اہتمام کرتی ہے، اس لیے اس نے اس کی دیکھ بھال کا خصوصی انتظام کیا ہے۔ یہ تاریخی مسجد انسانی عزم، خلوص نیت، زہد و مجاہدہ اور نیک کام کے لیے حسب حیثیت قربانی دینے کا زندہ درس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا اور نیک جذبہ وسائل کا محتاج نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ اگر وسائل کی حفاظت کی جائے اور انہیں اسراف یا سہولت پسندی سے بچا کر کام میں لایا جائے تو کم ذرائع سے، کم وقت میں بڑے بڑے کام ہو سکتے ہیں۔ راقم کو کچھ ایسے ملکوں کے دورے کا موقع ملا جہاں کے مسلمان بھائی وضو کے بعد تولیہ یا ٹشو کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ متولی حضرات ان کی اس عادت کو با سہولت پورا کرنے کے لیے فراخ دلی سے روز دھلے ہوئے چھوٹے بڑے تولیے اور ٹشو کی مختلف اقسام مہیا کرتے تھے۔ بعض ممالک میں ہر نمازی کے سامنے یا ہر تین چار نمازیوں کے سامنے ٹشو

کے رنگارنگ ڈبے دھرے ہوتے تھے۔ سلام پھرتے ہی ہر نمازی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ حسب عادت نرم وملائم اور خوشبودار کاغذ کھینچ کر فرضی تھوک، بلغم کو حقیقی خرچ کی قیمت پر اگلتا تھا۔

ایک دن جمعہ کے بعد یہ حقیر مسجد سے دیر سے نکلا تو دیکھا کہ خادم صاحب بڑے بڑے ڈرم استعمال شدہ کاغذی تولیوں سے بھرے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ اس ڈھیر کو اسی جیسے ۵۲ ڈھیروں سے تصور ہی تصور میں ضرب دیا (سال میں ۵۲ جمعے ہوتے ہیں) تو اندازہ ہوا کہ اس سے تو غریب ممالک میں پوری مسجد تعمیر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالی اسراف سے بچنے اور اعتدال کے ساتھ اجتماعی اموال کو خرچ کرنے کی توفیق اور سمجھ عنایت فرمائے۔ آمین!

جامع مسجد سنگی یدم باہر سے سادہ سی ہے۔ سنگ مرمر کی آویزاں تختی پر ترکی زبان میں اس کا نام، سنِ تعمیر اور مختصر تاریخ درج ہے۔ اس کے دائیں بائیں عام مکانات ہیں۔ ہم جب امام صاحب سے ملاقات کر کے فارغ ہو کر نکلے تو رہنما نے بتایا کہ خیر الدین آفندی بانی مسجد کی غربت اور جگہ کی تنگی کے باوجود شدید خواہش تھی کہ مسجد کے ساتھ ''دار القرآن'' بھی ہو۔ مسجد کا رقبہ بہت کم تھا، اس لیے اس نے یہ خواہش پوری کرنے کے لیے مسجد کو دو منزلہ تعمیر کروایا۔ نچلی منزل میں آدھا حصہ ''دار القرآن'' یعنی بچوں کے مکتب قرآنی اور آدھا حصہ مسجد کی ضروریات، طہارت خانہ وغیرہ کے لیے وقف ہے اور اوپر کا حصہ مسجد اور چھوٹا سا کتب خانہ ہے۔ ہم جب ''دار القرآن'' کے قریب گئے تو بچوں کے پڑھنے کی دل ربا آواز آ رہی تھی۔ ہمیں احساس ہوا کہ خیر الدین کی روح تک جب ان معصوم آوازوں کی بازگشت اور نہ ختم ہونے والا ثواب پہنچتا ہو گا تو وہ کس قدر خوش وخرم اور کس قدر شاداں وفرحاں ہوتی ہو گی۔ انسان نے تو دنیا سے چلا جانا ہے۔ خوش نصیب ہے جو اپنے پیچھے نیک کام اور نیک نام چھوڑ جائے۔ خصوصاً ایسا نام وکام جو دوسروں کے لیے بھی ترغیب کا باعث ہو۔

18 مارچ 1915ء یونیورسٹی

سید دنباشی کی کہانی انسانی تاریخ میں ایمان و استقامت اور عزم و حوصلے کی ناقابل فراموش داستان ہے۔ ایسی داستان جس کی عقلی و منطقی توجیہ ممکن نہیں۔ بس یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کا ایمان اور جذبہ ناممکن کو بھی ممکن کرسکتا ہے اور تمام مادی مشکلات کو پھلانگ کر حیرت انگیز نتائج حاصل کرسکتا ہے۔

سید دنباشی کی داستان عزیمت وشجاعت کا تعلق جنگ عظیم اوّل میں اتحادیوں کی طرف سے خلافت عثمانیہ کے مرکز استنبول پر بحری حملے سے ہے۔ آپ ایک نظر جغرافیہ پر ڈالیں تو دکھائی دے گا کہ ترکی کے شمال میں تین سمندر ہیں جنہیں دو درّے ملاتے ہیں۔ بحر اسود اور بحر مرمرہ کو آبنائے باسفورس ملاتی ہے اور بحر مرمرہ کو بحر ایجہ (Aegean Sea) سے درۂ دانیال ملاتا ہے۔ گیلی پولی کی تاریخی جنگ میں برطانیہ کا بحری بیڑہ درۂ دانیال سے گزر کر بحر مرمرہ میں آ گیا تھا۔

اس بیڑے میں وہ جنگی جہاز بھی شامل تھا جو اس وقت تک بنائے جانے والے جہازوں میں سب سے بڑا اور تباہ کن جہاز سمجھا جاتا تھا۔ اس کی قیادت میں برطانوی بحری بیڑے نے سمندر میں آگ اور بارود کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اس طوفان کے سائے میں اتحادی افواج کی پیش قدمی مسلسل جاری تھی اور وہ یورپی ساحل پر ترکی کا آخری قلعہ جو ''چنک قلعہ'' کہلاتا تھا، تک جا پہنچی تھیں۔ یہ آخری دفاعی حصار تھا جس کے ٹوٹنے کے بعد استنبول اتحادی افواج کے لیے تر نوالہ ہوتا اور اسے ہزیمت سے بچانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ سید دنباشی کی ذمہ داری اس عثمانی جہاز پر تھی جس کو اس قلعے اور قریب موجود بحری درّے کی حفاظت سونپی گئی تھی۔ اس قلعے کو ''چنک قلعہ'' اس لیے کہتے تھے کہ اس کی شکل بھی تالے جیسے تھی اور یہ حقیقت میں بھی استنبول کا تالا تھا۔ یہ عثمانی افواج کے دفاع کا آخری مرکز تھا اور اس کا بند ٹوٹنے کا مطلب پہلے استنبول اور پھر ترکی کا اتحادی یلغار کے ریلے میں بہہ جانا تھا۔

سید دنباشی کے مدافعتی جہاز کا برطانوی بحری جہاز سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ برطانوی جہاز کی مسلسل گولہ باری سے دنباشی کے جہاز میں شگاف پڑ گئے تھے۔ اس کی توپیں دبے دبے انداز میں خود بھی گولے داغ رہی تھیں۔ آخر برطانوی جہاز کا ایک گولہ ایسا آ کر لگا کہ دنباشی کے ساتھ موجود تمام عثمانی سپاہی شہید ہو گئے۔ سوائے دنباشی اور ایک زخمی جوان کے کوئی نہ بچا۔ عثمانی جہاز کی توپیں خاموش ہو چکی تھیں۔ ان کی طرف سے رہی سہی مدافعت ختم ہو چکی تھی اور برطانوی بحری بیڑے کی کشتیوں اور جہازوں نے بے دھڑک درّے میں داخل ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ سید دنباشی کا چھوٹا سا جہاز آخری ہچکی لے رہا تھا۔ اس میں سوار تمام عثمانی مجاہد شہید ہو چکے تھے۔ ایک زخمی اور ایک سید دنباشی دو آدمی باقی تھے۔ اس جہاز میں جو توپ تھی اس سے 140 کلو کا گولہ پھینکا جاتا تھا۔ اس گولے کو ایک چھوٹی سی کرین اُٹھا کر پٹڑی نما آلے پر ڈالتی

تھی۔ وہاں سے وہ آگے بڑھتا اور توپ کی نال تک پھسلتا چلتا جاتا۔ دنباشی نے دیکھا کہ برطانوی جہاز اطمینان سے آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ عثمانی جہازوں کی مدافعت دم توڑ چکی ہے اور اتحادی افواج اب استنبول تک بغیر مزاحمت کے جارہی ہیں۔ اس کے ایمان اور غیرت نے برداشت نہ کیا۔ اس نے ہمت کی اور گولہ لوڈ کرنے والی کرین تک گیا۔ وہ ناکارہ ہو چکی تھی، لیکن دنباشی ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ عام طور پر 6 میٹر طویل اس توپ کو چلانے کے لیے 10 آدمی ڈیوٹی دیتے تھے۔ دنباشی نے بسم اللہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں سے گولہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ گولہ اس کے ہاتھوں سے کندھے پر منتقل ہوا۔ آپ تصویر دیکھیے۔ گولہ دنباشی کے کندھے پر ہے۔ دنباشی نے کندھے پر گولہ اُٹھا کر توپ تک پہنچایا۔ برطانوی بحری جہاز کو نشانے پر لیا جو خراماں خراماں فاتحانہ شان سے چلا آرہا تھا اور ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' کہہ کر گولہ داغ دیا۔ گولہ نشانے پر لگا۔ برطانوی ششدر رہ گئے۔ پھر استنبول کا رُخ چھوڑ کر دنباشی کے جہاز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دنباشی نے دیکھا کہ برطانوی جہاز قریب آرہا ہے۔ ایک اور کوشش کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر ایک اور گولہ اُٹھالیا جو عام حالات میں اس جیسے کئی آدمی نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ پھر اس کو نشانہ باندھ کر داغ دیا۔ یہ وار کاری تھا۔ برطانوی جہاز میں آگ لگ گئی۔ فتح کے نعروں کی جگہ چیخ و پکار نے لے لی۔ دنباشی کے ایمان نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ آج تک اس شکست کی خفت مٹانے کے لیے اتحادی صحافی اور برطانوی تاریخ نگار لکھتے ہیں کہ برطانوی جہاز بھنور میں پھنس گیا تھا۔ اس علاقے میں بھنور کبھی تھے نہ آج ہیں۔ اس جگہ برطانوی جہاز ایک مجاہد کے ایمان کے سامنے شکست کھا گیا نہ کہ سمندری بھنور میں پھنس کر۔

عثمانی افسران کو یقین تھا کہ ہمارا کوئی جوان زندہ باقی نہیں ہے اور استنبول کو وہ ہاتھ سے جاتے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ کایا پلٹتے دیکھ کر بھاگم بھاگ دنباشی کے جہاز پر پہنچے تو

دیکھا کہ دنباشی زخمی ساتھی کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ انہوں نے جائزہ لیا کہ دو گولے کس طرح چلائے گئے؟ زخمی نے بتایا کہ دنباشی نے چلائے ہیں۔ انہوں نے دنباشی سے کہا گولہ اُٹھا کر دکھاؤ۔ دنباشی جیسے دو آدمی ایسے گولے کو ہلا بھی نہ سکتے تھے، لیکن پٹڑی پر نشان موجود تھے۔ کرین خراب کھڑی تھی۔ وہ استعمال نہیں ہوئی تھی، لیکن گولے یقیناً چلائے گئے تھے۔ ہدف سے اُٹھنے والی آگ بھی گواہ تھی کہ ایمان ابراہیمی نے آتش نمرود میں آج پھر انداز گلستان پیدا کر دیا ہے۔ تمام افسران نے ایک گولہ خالی کروا کے دنباشی سے کہا: ''گولہ اُٹھاؤ اور توپ تک لے جاؤ''۔ دنباشی نے کہا: ''جناب! اس جیسی صورت حال ہو تب شاید پھر اٹھا لوں۔ عام حالت میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا۔'' زخمی سپاہی کی گواہی، پٹڑی اور توپ کی نال پر نشانات کی موجودی بتا رہی تھی کہ ''ہمت مرداں مدد خدا'' کے علاوہ یہ کام ممکن نہیں۔ ہم تمہارے اس کارنامے کو عثمانی قوم اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے سبق آموز یادگار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن سید دنباشی کے کارنامے کو بچہ بچہ جانتا ہے۔

راقم نے جب پہلی مرتبہ یہ ماڈل ایک دکان کے شوکیس پر دیکھا تو تعجب ہوا کہ کندھے پر گولہ اُٹھائے سپاہی کی توپ تک روانگی کا ماڈل کس غرض سے بنایا گیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ 18 مارچ 1915ء کے دن دنباشی کے کارنامے کی یادگار ہے۔ اس یادگار میں ترکی میں ''18 مارچ یونیورسٹی'' (18 March University) کے نام سے عظیم تعلیمی ادارہ بنایا گیا۔ یہ اس جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں اس واقعے کے چند دنوں بعد 2 لاکھ عثمانیوں نے جمع ہو کر عید کی نماز پڑھی۔ شکرانہ ادا کیا اور دنباشی کے کارنامے کو تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی خاطر یہاں ادارہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں اس ادارے کے مشاہدے کا موقع ملا۔ سیکولر دور میں یہاں دینیات پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ شراب سستے داموں بکتی تھی۔ ترکی کے موجودہ انقلابی حکمران طیب

اردگان نے یہاں ''علوم اسلامیہ'' کا شعبہ جاری کیا اور افتتاحی خطاب میں اس جملے کو موضوع بنایا گیا کہ ہم یہاں مجاہدین اور شہداء کی قربانیوں کو تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیں گے۔ دنباشی ایک عام مجاہد تھا، لیکن اس کی جراءت ایمانی نے وہ ناقابل فراموش تاریخ رقم کی جس کی کوئی عقلی و منطقی توجیہ نہیں کی جا سکتی، لیکن اہلِ ایمان کو ہمیشہ ایمان کی تازگی کا ذریعہ فراہم کرتی رہے گی۔

انصاف کی بات

آج کی تحریر کا اصل موضوع تو ترکی کے انتخابات اور ان کے ماقبل و مابعد کی صورتحال ہے، لیکن اس سے پہلے میں دو واقعات سنانا چاہوں گا کہ ان کی بنیاد پر اصل موضوع سے متعلق کچھ کہنے میں آسانی رہے گی۔ نیز اس افراط وتفریط کے درمیان راہِ اعتدال سمجھ آسکے گی جو ترکی کے حوالے سے ہمارے ذرائع ابلاغ میں دیکھنے میں آرہا ہے۔

جگر مرادآبادی سے اردو دنیا کا ہر فرد بشر واقف ہے۔ یہ اپنے زمانے کے نہایت مقبول اور ہردل عزیز شاعر تھے۔ غزل سے ان کو خصوصی مناسبت تھی۔ اسی وجہ سے انہیں اردو دنیا میں ''رئیس المتغزلین'' یا ''سلطان تغزل'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کے اشعار ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ جتنی شہرت ان کی غزلوں کو حاصل تھی، اتنی ہی یا اس سے کچھ کم و بیش ان کی رندی و سرشاری کو بھی تھی۔ بلانوشی کی اصطلاح شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے وضع ہوئی

ہو۔ان کی رندی، سرشاری اور بادہ خواری کے سیکڑوں واقعات مشہور ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ وصف بھی تھا کہ خواہ وہ کتنی بھی پیے ہوئے ہوں، کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ ہمیشہ سنجیدگی کے دائرے میں رہتے تھے۔ علما اور بزرگوں کا ہر حال میں اور بے حد احترام کرتے تھے۔

جگر صاحب ایک روز مظفر نگر یا سہارن پور کے کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے جارہے تھے۔ اسٹیشن پر ان کی ملاقات حضرت تھانویؒ کے مشہور خلیفہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ سے ہوگئی۔ خواجہ صاحب بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ پوچھا: ''کہاں کا ارادہ ہے؟'' حضرت مجذوبؒ نے بتایا: ''تھانہ بھون جارہا ہوں، حضرت مرشد سے ملاقات کے لیے۔'' جگر صاحب بے چین ہوگئے اور کہا: ''میری بھی دیرینہ خواہش ہے کہ حضرت کی خدمت میں حاضری دوں، لیکن کیا کروں، اپنی بلانوشی کی وجہ سے ہمت نہیں کرپاتا۔'' مجذوب صاحب نے فرمایا: ''ہاں! یہ بات تو درست ہے۔ حضرت کے ہاں اس سلسلے میں بڑی سختی ہے۔ اس حال میں کبھی مت آجانا۔'' کچھ دیر میں دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ عصر بعد کی مجلس میں مجذوب صاحبؒ نے حضرت مولانا تھانویؒ کے سامنے جگر صاحب سے ہونے والی گفتگو نقل کی۔ حضرت نے فرمایا: ''واہ خواجہ صاحب! ہم تو سمجھے تھے آپ ہمارا طریق سمجھ چکے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ میرے ہاں سختی و پابندی زیادہ ہے، لیکن یہ پابندیاں یا سختیاں شخصیتوں کو دیکھ کر عائد ہوتی ہیں۔ تمہیں جگر صاحب کو آنے دینا چاہیے تھا۔ کیا عجب کہ یہاں آنا ہی ان کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا۔''

یہی واقعہ ایک دوسری روایت سے کچھ یوں ہے: جگر صاحب نے پوچھا: ''کیا مجھ جیسا شرابی بھی تھانہ بھون جاسکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ میں تو وہاں بھی پیوں گا کیونکہ اس کے بغیر میرا گزارا نہیں۔'' خواجہ صاحبؒ تھانہ بھون پہنچے اور کہا: ''جگر صاحب اپنی اصلاح کے لیے آنا

چاہتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ میں خانقاہ میں بھی پیے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' حضرت تھانویؒ ہنسے اور فرمایا: ''جگر صاحب سے میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ اشرف علی ان کو اپنے مکان میں ٹھہرائے گا۔ خانقاہ تو ایک قومی ادارہ ہے، اس میں تو ہم اجازت دینے سے مجبور ہیں، لیکن ان کو میں اپنا مہمان بناؤں گا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان میں جب کافر کو بھی مہمان بناتے تھے، تو اشرف علی ایک گنہگار مسلمان کو کیوں مہمان نہ بنائے گا جو اپنے علاج اور اصلاح کے لیے آ رہا ہے۔'' جگر صاحب نے جب یہ سنا تو رونے لگے اور کہا: ''ہم تو سمجھتے تھے کہ اللہ والے گنہگاروں سے نفرت کرتے ہوں گے، لیکن آج پتا چلا کہ ان کا قلب کتنا وسیع ہوتا ہے؟'' بس تھانہ بھون پہنچ گئے۔ عرض کیا: ''حضرت! اپنے ہاتھ پر توبہ کرا دیجیے اور چار باتوں کے لیے دُعا کر دیجیے: سب سے پہلے تو یہ کہ میں شراب چھوڑ دوں، پرانی عادت ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے کرم سے اب چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے...... دوسری دُعا یہ کہ مجھ کو حج نصیب ہو جائے۔ تیسری درخواست کی کہ میں ڈاڑھی رکھ لوں اور چوتھی درخواست کی کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔'' حضرت تھانویؒ نے دُعا فرما دی۔ جگر صاحب تھانہ بھون سے واپس آئے تو شراب چھوڑ دی، توبہ کر لی، شراب چھوڑنے سے بیمار ہو گئے، مگر ڈٹے رہے اور ڈاکٹروں کے کہنے کے باوجود توبہ نہ توڑی۔

دوسرا واقعہ خود فقیر کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ یہ عاجز صبح سویرے کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ باہر نکل کر ادھر اُدھر سواری دیکھ رہا تھا کہ ایک ہم سفر نے پوچھا: ''مولانا! کہاں جانا ہے؟ چلیے! میں آپ کو چھوڑتا چلوں۔'' میں نے آنجناب کو چہرے مہرے سے قابل اعتبار پایا تو ناں نہ کی۔ سوچا اسی بہانے ہمارا جامعہ دیکھ لیں گے۔ کچھ دین کی باتیں ہو جائیں گی۔ نماز فجر ہوائی اڈے پر ہی پڑھ کر نکلے۔ مدرسے پہنچے تو فجر کے بعد طلبہ تلاوت کر رہے تھے۔ کچھ صبح کا وقت، کچھ مدرسے کا روحانی ماحول، کچھ طلبہ کی نورانی صورتیں۔ ان صاحب نے گھوم پھر کر مدرسہ

دیکھا۔ تو نہایت متعجب ہوئے۔ گاڑی میں فقیر ان کا مہمان تھا۔ اب وہ فقیر کے مہمان تھے۔ بوقت رخصت فرمانے لگے: ''مولانا! سچی بات یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا: مدرسہ تو بس یتیم خانہ ہوتا ہے۔ آج مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے نئے سرے سے ایمان کی دولت حاصل ہوئی ہے۔'' یہاں تک تو ہمارے ان بھائیوں کی اکثریت کہتی ہے جو دنیاداری کے ماحول سے دین کے ماحول میں آئے، لیکن میں آپ کو ان کا اگلا جملہ سنانا چاہتا ہوں جو ہماری آج کے موضوع کی تمہید ہے۔ وہ مدرسے کے ماحول سے متاثر ہو کر جذباتی انداز میں گویا ہوئے: ''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں بھی اچھا مسلمان بنوں گا، کیونکہ مسلمانوں میں ابھی اچھے لوگ اور اچھے ادارے موجود ہیں۔ میں سمجھتا تھا مسلمان تو بس شکست خوردہ لوگوں کا نام ہے۔ میں اچھا مسلمان بننے کی خاطر آئندہ کبھی شب براءت کا حلوہ اور رجب کا کونڈہ قضا نہیں کروں گا۔ میرے والد بھی ایسا ہی کرتے تھے۔''

پہلے تو یہ سوچے کہ حضرت حکیم الامتؒ کی اتنی اصول پسندی کے باوجود ان کے دل میں اصلاح خواہوں کے لیے کتنی گنجائش تھی؟ پھر اندازہ لگایئے ہمارے اس ''نو مسلم'' دوست کی اسلام شناسی اور والہانہ محبت کے اظہار کا معیار کیا تھا؟ یہی بات میں اپنے قارئین کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ ستر سال تک جابرانہ سیکولر نظام کے تحت گھٹ گھٹ کر سانس لینے والے ترکی کے متعلق جیسے یہ سمجھنا غلط ہے کہ وہاں فوراً شراب اور قحبہ خانوں پر پابندی لگ گئی ہوگی، سیکولر دور میں غیر ملکی سیاحوں کے پروان چڑھائے گئے مغربی ماحول کو یک لخت ختم کردیا ہوگا، جمہوریت کا خاتمہ کرکے امارت کا اعلان کردیا گیا ہوگا اور جیسے ہی ہم میں سے کوئی وہاں جائے گا تو اسے ہر طرف اسلامی نظام کی بہاریں اس شکل میں دیکھنے کو ملیں گی جس کا خاص تصور وہ باندھ چکا ہے۔ جیسے یہ توقع درست نہیں اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ وہاں اسلام اور اس کی بتدریج تنفیذ کے حوالے

سے کوئی کام ہی نہیں ہو رہا اور وہ فاسقوں فاجروں کا گڑھ یا مغربیت زدگان کی کھڈ ہے۔

ترکی کے حالیہ اسلام پسندوں (جن کی اسلام پسندی کو محاورۃً آپ اسی جیسا ابتدائی دور میں سمجھیں جیسے میرے مہمان کے حلووں اور کونڈوں والی شریعت سے محبت تھی) کی کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ اسلام کے نام سے کام کرنے والوں کو انتخابات جیت کر بھی بار بار اسمبلی کی معطلی اور جماعت پر پابندی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو انہوں نے یہ طے کیا کہ اسلام کا نام لیے بغیر آپ وہ کام اپنا شعار بنائیں جو اسلام آپ سے کروانا چاہتا ہے، چنانچہ کچھ تو وہ اپنے جبری سیکولر نظام سے مجبور ہیں اور کچھ یہ کہ وہ اپنی رفتار دھیمی رکھنے اور فی الحال نام لینے یا دعوے کرنے کے بجائے کام کرتے رہنے پر توجہ دے کر اچھے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ ترک عوام کو ریاست کی طرف سے ترقی اور انصاف...... ہر قیمت پر، ہر شکل میں، ہر حالت میں...... فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی ریاست اور فاروقی عدالت کی ذمہ داری ہیں...... اور کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ بنیادی ذمہ داری ہیں...... تو یقیناً یہ سیکولر اور قوم پرست ترکوں کے دل میں اسلام اور اسلام پسندوں کے لیے نرم گوشہ اور نیک جذبات جنم دیں گی۔ تب داعیوں اور مبلغوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام کریں۔

ہمارے ہاں کی ترتیب یہ ہے کہ اسلام کے نام پر ووٹ لیا جائے پھر کام کیا جائے اور چونکہ اسلام پسندوں کو کام نہیں کرنے دیا جاتا اس لیے مزید ووٹ مانگے جائیں۔ مجبوری کا یہ ادھ جماد ہی اس وقت تک بھینٹا جائے جب تک لوگ بیزار نہ ہو جائیں۔ اس کے برخلاف ترکی میں ترتیب یہ ہے کہ اسلام کے بتائے ہوئے کام کر کے ووٹ لیا جائے پھر اقتدار کی طاقت مل جانے پر ان کاموں میں تیزی لائی جائے اور اسلام کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ دیر لگتی ہے تو لگتی

رہے۔ اسلامی کام تو رکے نہیں۔ صرف نام لینے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جب کام نہیں کرتے اور ناکام ہو جاتے ہیں تو بدنام اسلام ہوتا ہے۔ وہ جب کام کرتے ہیں اور نیک نام ہوتے ہیں تو اچھی شہرت خود بخود اسلام اور اسلام پسندوں کے حصے میں آتی ہے۔ بس ہم میں اور ان میں یہ فرق ہے، لہٰذا انصاف یہ ہے کہ ہم ان کا موازنہ خلافت راشدہ یا سلطنت عثمانیہ سے نہ کریں، نہ انہیں ماڈرن اسلام کا ماڈل قرار دے کر ان چند ممنوع عشقیات کی پیروی شروع کریں جو فی الحال ان کی مجبوری ہیں۔ اور نہ ان بے ہودگیوں کا اتنا چرچا کریں جو ان کو ورثے میں ملی اور جن کے تصفیے میں وقت لگے گا۔

فرق کی بنیاد

ترکی میں اسلام پسند یا انصاف وترقی پسند مسلسل کامیابیوں کا ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ دنیا بھر کی دینی سیاسی جماعتوں اور اردگان کی جماعت کے طریق کار میں فرق تو بہت سے بیان کیے جاتے ہیں۔ راقم الحروف بھی اپنے سفرنامے "ترک ناداں سے ترک دانا تک" کے آخر میں فرق بیان کر چکا ہے۔ یہاں مزید ایک دو فرق جو اس عاجز نے ملاحظہ کیے، انہیں بیان کرتا ہوں۔ کچھ تو سب کے سامنے ہیں۔ کچھ تک عام دنیا کی رسائی کم ہوتی ہے۔

پہلا تو مہاجرین کی خدمت کا ہے۔ اس وقت ترکی میں دنیا کے سب سے زیادہ مہاجر یا اپنے ملک کے حالات سے مجبور ہو کر نقل مکانی کرنے والے افراد پائے جاتے ہیں۔ شام اور عراق تو خیر ہیں ہی ابتلا کی لپیٹ میں (اللہ تعالیٰ ان کے لیے اور سب مظلوم و بے گھر مسلمانوں کے لیے آسانی کی صورت پیدا فرمائے) اس کے علاوہ وسطی ایشیا کے کئی ملکوں کے مسلمانوں نے جو اپنی

حکومتوں کے سخت گیر رویوں سے ستائے ہوئے ہیں، جیسے تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان وغیرہ...... سب نے ترکی کی راہ لی ہے۔ اس کے علاوہ چینی ترکستان کے مسلمان ہوں یا برما کے، سوڈان ہو یا صومالیہ، کیمپوں کے پناہ گزین ہوں یا سیلاب وزلزلہ کے متاثرین، ترکی سب سے پہلے، بلکہ یوں کہیے اردگان اور اس کی جماعت، بلکہ یوں کہیے ترکی کے اسلام پسند سب سے پہلے آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہیں۔ تعاون یا مدد چھوٹے لفظ ہوگئے ہیں۔ یہ اس سے آگے بڑھ کر دل و جان سے فرض مذہبی سمجھ کر ان کی ایسی خدمت کرتے ہیں کہ اسے اپنے مہاجر ہونے پر فخر ہونے لگتا ہے۔ مہاجر کے لفظ کو "انصار" جیسے لفظ جیسی عزت اگر اس دور میں کسی نے لوٹائی ہے تو وہ بھی ترکی کے اسلام پسند ہیں یا معاف کیجیے، ترقی و انصاف پسند ہیں جن کو ورثے میں ملی ہوئی مجبوریاں ہمارے صحافی حضرات کو سمجھ میں نہیں آ رہیں۔

آپ شام کے مہاجرین کے کسی کیمپ میں چلے جائیں۔ آپ کو ریڈ کارپٹ پروٹوکول جیسا سلوک اور رویہ دیکھنے کو ملے گا۔ مہاجرین کے لیے رہائش، طعام و علاج کے علاوہ تعلیم اور ہنر کی تربیت کا اعلیٰ بندوبست ہے۔ خود انہی میں سے جو شخص تعلیم یافتہ یا ہنرداں ہے حکومت اس کو وظیفہ دیتی ہے کہ وہ بچوں کا وقت ضائع نہ ہونے دے، انہیں تعلیم دینے یا کوئی مفید پیشہ سیکھنے میں لگائے۔ ان مہاجرین کے قیام و طعام کا معیار اور ان کی خدمت پر ترک کارکنوں کے فخر و شکر کے جذبات دیکھ کر بلاشبہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہم نے بھی افغان مہاجرین کی خدمت کی، لیکن شاید وہ ایسی نہ تھی کہ میزبان اور مہمان میں مہاجرین و انصار جیسا قریبی تعلق قائم کر سکے جو ترکی اور شام کے عوام میں قائم ہوا اور اس نے ترکی کے ووٹرز پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ ترک عوام نے یہ سوچا ساری دنیا کی مظلوم عوام جس ترک حکمران سے محبت کرتی ہو اسے اپنا قائد نہ بنانا یا سمجھنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے؟

دوسرا فرق اس دن ملاحظہ کرنے کو ملا جب فقیر کو "دارالشفقۃ" کے اندر جانا نصیب ہوا۔ جب ہم سلطان سلیم کی مسجد سے حدیث شریف کی اجازت لینے سلطان فاتح مسجد جاتے تھے تو راستے میں ایک بہت بڑی متروکہ عمارت کی تعمیر نو ہو رہی تھی۔ یہ قدیم زمانے کی طویل و عریض عمارت تھی جس کی کئی منزلہ تعمیر نو بڑے اہتمام سے جاری تھی۔ اس کے اندر ایک شعبہ فعال بھی ہو چکا تھا۔ بقیہ حصوں کی تعمیر و مرمت جاری تھی۔ ایک دن دروازے کے قریب ایک شناسا صاحب مل گئے، انہوں نے اندر آنے کی دعوت دی جو اس خاکسار نے بصد اشتیاق قبول کی۔ اندر گئے تو پرانے ترکی خط میں "دارالشفقۃ" لکھا تھا۔ جسے نیا سنہری رنگ دیا گیا تھا۔ کتبے کی زمین ہرے رنگ کی تھی۔ جیسا کہ روضۂ اقدس پر ترک ماہرین کے ہاتھوں خطاطی کی گئی ہے، بالکل ویسا ہی منظر اور آنکھوں کو بھاتا انداز تھا۔ ایک طرف پرانے زمانے کا اسی خط میں ایک چھوٹا سا نادر کتبہ بھی تھا جو یادگار سنبھالنے کے انداز میں رکھا تھا۔ بتایا گیا کہ عثمانی دور میں یہ "دارالیتامیٰ" تھا۔ آج اسے پھر زندہ کر کے دوبارہ یتیم بچوں کی اعلیٰ تربیت گاہ بنایا جا رہا ہے۔ دنیا بھر کے یتیم خانوں میں جیسی تیسی تعلیم اور گذارے لائق تربیت کو اس شعبے میں خدمت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ان یتیم بچوں پر اس انداز میں محنت کی جاتی ہے، اور اس معیار کے خطیر اخراجات کیے جاتے ہیں کہ ان سے قوم کے قائد و رہنما اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیدار جنم لیں۔ گھوم پھر کر جائزہ لینے سے محسوس ہوا کہ ان بچوں کی ایسی نفسیاتی تربیت اور ذہن سازی کی گئی ہے کہ انہیں کسی قسم کی محرومی کا احساس ہی نہیں۔ ان کی عزت نفس اس درجہ بحال رکھی گئی ہے کہ وہ نہایت خود اعتمادی سے ہر وہ چیز سیکھ رہے ہیں جو انہیں آگے چل کر معاشرے کا عام فرد نہیں، اعلیٰ اور ممتاز شخصیت بننے میں مدد دے سکے۔ اس سے کم ان کو ہدف ہی نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ یہ اندازِ خدمت کم ہی کہیں اور ہوگا کہ ایک دو نہیں، طلبہ کی ساری جماعت ہی کا مقصد حیات اعلیٰ معیار کی قومی خدمت میں حصہ داری ہو اور اس کے لیے اعلیٰ مناصب کے حصول کو بطور ذریعہ نصب العین بنایا گیا ہو۔

ارادہ تو دو فرق لکھنے کا تھا مگر ایک تیسرا فرق لکھ دینا بھی ان شاء اللہ بے معنی نہ ہوگا۔ تیسرا اہم فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب تعلیمی یا فلاحی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں تو انہیں ان کے منطقی نتیجے تک پہنچائے بغیر اچھی اُمیدیں لگالی جاتی ہیں۔ ترکی میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں پہلے سے ہدف واضح ہوتا ہے اور ان کی خدمات کا اندازہ اسی ہدف کو سامنے رکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی کامیابی یا نتائج کے حصول کا تناسب بہت بہتر بلکہ قابل رشک ہے۔ اس بات کو فقیر ایک اور انداز میں کہتا ہے۔ ہمارے ہاں جماعتیں افراد سازی کے بجائے رُکن سازی کی مہم چلاتی ہیں۔ رکن کوئی بھی بن جائے تو وہ عہدیدار بھی بن جاتا ہے، لیکن مطلوبہ فرد اکثر نہیں بنتا۔ ان کے ہاں اسکول کی سطح سے افراد سازی ہوتی ہے پھر کوئی جماعت کا رکن بنے نہ بنے، مطلوبہ فرد اکثر بن جاتا ہے۔ وہ سیاست وسفارت، تعلیم و انتظام، عدلیہ، فوج و پولیس، صحت، غرض جس شعبے میں جائے، جماعتی نظریات اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ جماعتی نظریات اس معنی میں نہیں ہوتے کہ بڑے ہوکر کسی مخصوص جماعت سے وفاداری نبھائی جائے۔ یہ حقیقی انسانی واسلامی نظریات ہوتے ہیں اور انسان کو حق و سچ کا ساتھ دینے اور ترقی و انصاف کا بول بالا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ نتیجہ آخرکار انہی کی جھولی میں گرتا ہے جنہوں نے اس کو تعلیمی منصوبے کے تحت تعلیم دی یا ٹیوشن پڑھائی تھی یا فلاحی مہم کے تحت کوئی خدمت کی تھی یا پیکیج دیا تھا۔ خون اور سوچ میں رچ بس جانے والی چیز کبھی جدا نہیں ہوتی۔ ایسے شخص سے ووٹ مانگنا تو نہایت کمتر بات ہے وہ تو اس سے بہت زیادہ لٹانے پر تیار ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب اردگان نے...... مذکورہ بالا فرق ملحوظ رکھ کر کام کرنے کے بعد...... ایئرہوسٹس کو حجاب کی اجازت دی جو موجودہ ترک قانون کے سراسر خلاف تھی، تو اگرچہ یہ خالص

اسلامی فعل تھا، لیکن ''ترقی وانصاف'' کے اسلامی کام کرنے کے بعد تھا، لہٰذا فوج جو سیکولر قانون کی محافظ تھی، آڑے نہ آئی۔ یہ حجاب خیر خواں خواتین کے سر پر بھی آ گیا۔ پھر ہوتے ہوتے اسمبلی کی رکن خواتین کے سروں تک جا پہنچا۔ واضح رہے کہ یہ ''اجازت'' تھی، ''حکم'' نہ تھا۔ حتیٰ کہ اب یہ عظیم واقعہ رونما ہوا ہے کہ اردگان نے فوج میں نماز کی اجازت دے دی ہے...... میں دہراؤں گا: حکم نہیں صرف اجازت دی...... تو پہلی نماز میں سیکڑوں فوجی سربسجود نظر آئے۔ کسی نے یہ تاریخی منظر محفوظ کر لیا جو اس کالم کے ہمراہ قارئین کی نذر ہے۔

حضرات محترم! یہ ہیں وہ فرق جو سرسری مشاہدات سے سامنے آئے اور یہ ہیں وہ رویے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ممبر اسمبلی، براڈ کاسٹرز اور ایر ہوسٹس سے لے کر فوجی تک (جو قانوناً سیکولرازم کے محافظ ہیں) اسلام پسندوں سے متاثر ہیں اور یہ ہے وہ انداز جس کی بنا پر حالیہ انتخابات کے دوران شام کے مہاجرین اردگان کے لیے ہمہ وقت دعا بلب تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اردگان کی کامیابی میں جہاں اس کی فلاحی سیاست اور مؤمنانہ فراست کا دخل ہے وہیں ان مہاجرین اور یتامیٰ کی دعائیں بھی رنگ لائی ہیں۔ جو سیاست دان اسلام کا نام لیے بغیر یہ سب اسلامی صفات حاصل کر لے، بلاشبہ وہ آج اور کل کے ترکی میں حقیقی فرق کی بنیاد رکھنے والا ہے۔

تلاش کا سفر

حال ہی میں ہمارے ہاں بلدیاتی انتخابات کروائے گئے ہیں۔ اس دوران وہ تمام نعرے بازیاں، ہلڑ بازیاں، وعدے وعید، دعوے دلائل اور شکوہ و جواب شکوہ دیکھنے سننے کو ملے جو اس موقع پر ہماری روایت ہیں اور جن سے متعلق سب کو یقین ہوتا ہے کہ کھوکھلے، بے جان، سطحی اور بے حقیقت ہوتے ہیں۔ احقر راقم الحروف چونکہ برادر ملک ترکی میں یہ سارے مناظر دیکھ کر آیا تھا کہ وہاں کے اسلام پسند (آپ اصلاح پسند یا انقلاب پسند کہہ لیں) جو موجودہ حکمران جماعت کی طرف سے مسلسل کامیابیوں کا ریکارڈ قائم کر چکے ہیں، کس طرح سے کام کرتے ہیں؟ اس لیے ہمارے ہاں کے ووٹ مانگنے یا مہم چلانے کے مروجہ طریق کار کو دیکھ کر ہنسی بھی آتی تھی اور افسوس بھی ہوتا تھا۔ وہاں کے کارکن کسی کو بے وقوف بناتے ہیں نہ خود بے عزت ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کے عوام نہ بے وقوف بنتے ہیں نہ آنکھوں دیکھ کر بھی اندھی کھائی میں رائے دہی کا

حق گراتے ہیں۔ ہمارے ہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ انتخابی مہم کے دوران امیدواروں کی طرف سے جھوٹے وعدوں، فرضی دعووں کا سیلاب آیا ہوتا ہے۔ ''سنتے جاؤ اور شرماتے جاؤ'' کی کیفیت ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہر مرتبہ دھوکا کھا کر اور اس مرتبہ انقلابی تبدیلیوں کا عزم لے کر نکلنے والے عوام بھی ہنسی خوشی ایک بار اور دھوکا کھانے پر پوری طرح آمادہ و تیار ہوتے ہیں۔

ترکی کا موجودہ حکمران معاصر تاریخ میں مقبولیت اور فتح مسلسل کا وہ ریکارڈ قائم کر چکا ہے جس کو توڑنا دنیا بھر کے بونے حکمرانوں کے لیے ممکن نظر نہیں آتا۔ اگرچہ اس بات کو ریکارڈ شناس عالمی میڈیا زیادہ بیان نہیں کرتا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی قریب میں اس تناسب سے مسلسل کامیابی کے کوئی اور قریب بھی نہیں آسکا۔ اس شخص نے غربت زدہ بچپن کے دوران استنبول کی سڑکوں پر آئس کریم بیچنے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسکول میں اچھے طالب علم اور اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے نام بنایا۔ پھر سیاست میں استاذ نجم الدین اربکان کی شاگردی کی اور آخر کار اس کی جماعت کی طرف سے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا۔ پھر قدرت کو ترکی پر رحم آ ہی گیا۔ بدعنوانی، بداقتصادی اور سستی و کاہلی کے مارے ہوئے ترکی کے ''مردِ بیمار'' کے جسم میں اس شخص نے ایسی انقلابی روح پھونکی کہ اس نے نہ صرف اپنی جماعت کے طرزِ سیاست میں انقلابی اور نتیجہ خیز تبدیلیاں کیں، بلکہ ترک معاشرے میں بھی ایسا سدھار لایا کہ کٹر ترک قوم پرست بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے اس عاجز نے خود سنے، حالانکہ ان میں اور اس شخص کے نظریات میں بُعد المشرقین تھا، لیکن ان کا کہنا تھا کہ ہماری جماعت میں سے کوئی شخص حکمران ہو کر ترکی اور ترک قوم کو دنیا میں ایسا مقام نہیں دلوا سکتا جیسا اس شخص نے دلوایا ہے۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اور کمال وہ جس کی دشمن بھی گواہی دے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ سیاست دان لوگ بولتے زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ فیتے زیادہ کاٹتے، بیچ میں کھڑے ہو کر تصویریں زیادہ کھنچواتے اور اس حساب سے عوام میں مقبولیت

کھوتے اور ان کے دل سے اترتے جاتے ہیں۔ اگر وہ خود دیانتدار ہوں اور کام بھی کرنا چاہتے ہوں تو ان کے ساتھ ایسے لوگ (وزیر، ارکان اسمبلی، سیاسی عہدیدار) منتھی ہوتے ہیں کہ اس کے پر بھی کاٹ دیتے ہیں اور یہ بیچارہ شوقِ پرواز دل میں لیے انتخابی مدت سدھار جاتا ہے۔ موجودہ ترک حکمران کو خدا نے ایسی سحر انگیز مقناطیسی شخصیت دی کہ اس نے نہ صرف اپنی خداداد قابلیت و دیانت سے ایک نئے ترکی کی بنیاد رکھی، بلکہ اپنی جماعت کی ذہن سازی میں بھی کامیابی حاصل کی، لہٰذا کچھ عرصہ قبل گولنسٹ حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی وہ الزامات ثابت نہ کر سکے جن کی بنیاد پر وہ اس کا تخت الٹ کر امریکا و اسرائیل کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔

انتخابات قومی وصوبائی ہوں یا بلدیاتی، ہمارے ہاں ووٹ مانگنے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے ایسے ایسے بھونڈے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں کہ عقل وتہذیب اپنا سر پیٹتی رہ جاتی ہے۔ اگر نفسیاتی اصولوں کے تحت غور سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہر امیدوار کہہ رہا ہو ''مجھے ووٹ دینا'' اپنی عقل کو گالی دینے کے مترادف ہے۔ ووٹ مانگنے کے حوالے سے سادہ سا اصول وہ ہے جو ایک فارسی کی ایک مثل میں کہی گئی ہے: ''عطر آں است کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید'' ...... ''خوشبو وہی ہے جو خود مہک کر اپنا آپ منوائے۔ عطر فروش کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہو۔'' ترکی میں ترقی وانصاف پارٹی نے سب سے پہلے تو اپنی اہلیت منوائی۔ ان کی جماعت کے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ماحول کے برخلاف ہاسٹلز میں ان کی ایسی ذہن سازی کی جاتی ہے کہ وہ وہاں سے محبِ وطن بن کر نکلتے ہیں۔ انہیں اپنی ذات یا جماعت سے زیادہ ملک اور ملت کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ اہلیت وقابلیت کے بعد انہوں نے غیر معمولی دیانت کا مظاہرہ کیا اور بدعنوانی سے بچتے ہوئے فلاح عامہ کے ایسے کام کیے کہ ترقی یافتہ فلاحی ریاستوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اردگان کا نظریہ تھا کہ آپ عوام سے ووٹ نہیں مانگو۔ بس اپنی قابلیت اور دیانت دو چیزیں

ثابت کر دو، تمہیں ووٹ مانگنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس عاجز نے استنبول کی ایک مشہور سڑک پر ترک مٹھائی اور چائے کی وہ دکان دیکھی ہے جس میں اردگان مٹھائی کھانے اس وقت داخل ہوا جب وہ اس زیر تعمیر سڑک پر جاری کام کی نگرانی سے تھک کر چائے پینا چاہتا تھا۔ دکان کے مالک نے اس موقع کو محفوظ کر کے دیوار پر آویزاں کر رکھا تھا اور یہ منظر گواہی دے رہا تھا کہ سیاست دان تبھی کامیاب ہے جب خود بھی کام میں جُتا ہوا ہو اور اپنے ساتھ چلنے والوں میں بھی یہی جذبہ پھونک سکتا ہو۔ ہمارے سیاست دانوں میں سے اکثریت ان موروثی حضرات کی ہے جو اپنی قابلیت سے قوم کو متاثر نہیں کر سکے۔ بقیہ تعداد ان حضرت کی ہے جنہوں نے اپنی ''صلاحیتوں'' سے قوم کو اس قدر متاثر کر دیا ہے کہ وہ اب ان کی دیانت پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں، لہٰذا یہ بے توفیقے قائدین اس لٹی پٹی قوم کی رہی سہی آرزوؤں کو ہر نئی مرتبہ ڈبو ڈبو کر اُبھارتے ہیں اور پھر اُبھار اُبھار کر ڈبوتے ہیں۔ اس قوم کا حافظہ بھی اتنا کمزور ہے کہ وہ جنگ آزادی کے بعد انگریز سے فی مرد مجاہد ایک مربع زمین یا بیس چاندی کے روپے (اس زمانے میں ایک مربع زمین بیس نقرئی روپوں کی آتی تھی) لینے والوں کو جس طرح بھول جاتی ہے، اسی طرح اسمبلی میں کھلم کھلا منڈی میں اپنا بھاؤ تاؤ کرنے والوں کو بھی فراموش کر دیتی ہے۔ تبھی تو ہر طرف ''دم مست قلندر'' ہے، لیکن قلندر ہے کہ نہ دم پکڑتا ہے نہ مستی میں آ کر دیتا ہے۔

ہم میں اور ترکی کے انقلاب پسندوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہم اس وقت انتخابی مہم شروع کرتے ہیں جب انتخابات سر پر آتے ہیں۔ اردگان کی جماعت اس دن اگلی انتخابی مہم شروع کر دیتی ہے جس دن وہ پچھلی انتخابی مہم جیتتی ہے۔ انتخابات کے دنوں میں تو وہ فقط یہ کرتے ہیں کہ ایک ایک ووٹر سے یہ پوچھتے ہیں: ''بس یہ بتائیں کہ ایسی کون سی خدمت ہے جو ہم نہیں کر سکے اور آپ ان سے کروانا چاہتے ہیں جن کو ووٹ دیں گے؟'' ان کے کارکن

آخری دنوں میں بس اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں جو انہیں انتخابات والے دن مثالی کامیابی کی شکل میں ملتا ہے۔

انگریز جاتے وقت ہماری افسر شاہی میں کاہلی اور بدعنوانی کا اور ہمارے سیاست دانوں میں مفاد پرستی اور مال بٹوری کا جو بیج بو کر گیا تھا، وہ ہمیں پستی کی ''درست سمت'' پر قائم رکھنے کے لیے کافی شافی ہے۔ اگر پاکستانی قوم کو ان دو چیزوں سے نجات مل جائے تو اس جیسے امکانات رکھنے والا ملک اور اس جیسی صلاحیت والی قوم دنیا میں نہیں، مگر یہ صفات کسی اردگان کی تلاش میں ہیں۔ نجانے تلاش کا یہ سفر کب مکمل ہوگا اور خدا جانے ہمارے ہاں ایسا نجات دہندہ کب آئے گا؟

غازی خسرو بیگ کا مدرسہ

''غازی خسرو بیگ'' سرائیوو کا پہلا گورنر تھا۔ بلقان یعنی موجودہ بوسنیا، سربیا، کوسووو وغیرہ فتح ہوا تو خلافت عثمانیہ کی طرف سے اسے یہاں کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا۔ غازی خسرو نہایت بیدار مغز، منصف مزاج، اور دور رس نظر رکھنے والے حکمران ثابت ہوا۔ اس نے یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جہاں اور بہت سے اقدامات کیے، وہاں ایک کام بلکہ ایک کارنامہ یہ کیا کہ 1531ء میں ایک عظیم الشان جامعہ تعمیر کروایا۔ اس نے دیکھا کہ بلقان خشکی میں مسلمانوں کے لیے ایسا جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف متعصب عیسائیوں کا سمندر ہے۔ اگر خدانخواستہ کبھی یہاں خلافت کی گرفت کمزور ہوگئی تو یہ مسلمان چاروں طرف سے گھیرے میں آ جائیں گے، لہٰذا یہاں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو ایسے لوگ تیار کرے جو زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی راہنمائی بھی کریں اور حفاظت بھی۔ اس زمانے میں یہاں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے دمشق

اور بغداد جایا کرتے تھے۔ غازی نے یہیں ایک ایسا ادارہ بنا دیا جو یہاں کے مسلمانوں کو علماء بھی دے اور سپہ سالار بھی۔ سائنس داں بھی اور سیاست دان بھی۔ نظریہ بھی دے اور نظریاتی لوگ بھی۔ ایسے مدارس و جامعات جہاں دینی علوم اور دنیوی فنون یکجا کیے جاتے ہوں، دنیا میں جابجا موجود تھے، لیکن اس جامعہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی تعمیر سے پہلے ایسے اوقاف کا انتظام کیا گیا جن کی آمدن سے یہ مدرسہ تعمیر کیا جائے پھر اسے چلایا جائے۔ عام طور پر مدرسہ کے لیے زمین وقف ہونے کے بعد اس پر مدرسہ کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں وقف زمین سے ایسی پیداوار حاصل کرنے تک انتظار کیا گیا جس سے مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد اخراجات کی کبھی تنگی نہ ہو۔ کسی بھی عمارت کی زمین اور تعمیر کے لیے رقم زیادہ درکار ہوتی ہے اور چلانے کے لیے نسبتاً کم، لہٰذا اگر اوقاف کی آمدنی اتنی ہو کہ مدرسہ تعمیر ہو سکے تو بعد میں اس کے اخراجات سے کئی گنا رقم بچتی رہتی ہے جو اس کی شاخوں کی تعمیر اور دیگر مقاصد میں کام آسکتی ہے۔

بہرحال غازی خسرو بیگ بلقان کے مسلمانوں کو یہ مدرسہ بھی تحفے میں دیا اور اس کے ساتھ خطیر آمدنی والے اوقاف بھی۔ اس نے یہ پیغام دیا کہ بیدار مغز حکمران کا ویژن بہت وسیع ہونا چاہیے اور منصوبہ بندی بھی۔ دنیا میں کامیاب وہ قوم ہے جس کا تصور بھی اپنا ہو اور اس تصور میں رنگ بھرنے کی منصوبہ بندی بھی اس کی اپنی ہو۔ اگر خواب قوم کا اپنا نہیں تو اس میں جتنے بھی رنگ بھر لیے جائیں، تعبیر کچھ اور ہی آئے گی۔ استعماری طاقتیں جب کسی سے اس کا مستقبل چھیننا چاہتی ہیں تو اسے ایک تصور دے کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ غیروں کا دیا ہوا تصور ایسا جال ہوتا ہے جس میں جتنا پھڑکا جائے وہ اتنا کھال کے اندر اترتا جاتا ہے۔ جب تک مکڑی کے اس جالے کے تار پود بکھیر کر صالح تصور کے تحت جینے کا عزم نہیں کیا جاتا، اس وقت تک جسمانی غلامی سے زیادہ بدتر چیز ''ذہنی غلامی'' سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔

غازی خسرو بیگ دنیا سے چلا گیا۔اس کا صدقہ جاریہ بلقان کے مسلمانوں کے اس وقت کام آیا جب کوئی اور چیز کام نہ آ رہی تھی۔تقریباً ساڑھے تین سو سال بعد 1880ء میں یہاں پہلی فرقہ وارانہ نسل کشی ہوئی۔مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت وہ لوگ مسلمانوں کی عزت و آبرو کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہوگئے جو اس مدرسے سے فارغ التحصیل تھے۔یعنی کئی سو سال بعد غازی خسرو بیگ کی مستقبل بینی اور مستقبل کی خاکہ گری کام آ گئی۔پھر جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں ایسی ہی کوشش کی گئی۔نسل کشی کی یہ مہمات یورپ سے مسلمانوں کے خاتمے کے لیے تھیں،لیکن غازی خسرو بیگ کا وژن نہایت واضح اور اس کا منصوبہ نہایت مکمل تھا۔اس کے بنائے ہوئے ادارے سے مسلمانوں کے نظریاتی وجود اور قومی تحفظ کے ذمہ دار پیدا ہوتے رہے اور ان کا نام ونشان مٹانے کی کوشش کرنے والے ناکام ہوتے رہے۔1992ء میں چوتھا اور عظیم ترین قتل عام ہوا۔منصوبہ یہ تھا کہ اسپین کی طرح بوسنیا سے بھی مسلمانوں کا نام مٹا دیا جائے،لیکن یہ مدرسہ نہ صرف یہ کہ ایک نظریے کے تحت تعمیر ہوا تھا، بلکہ وہ نظریے کے تحت جینے والے ایسے افراد بھی تیار کرتا تھا جو اپنی فنا میں قوم کی بقا کا راز سمجھتے تھے۔ جو اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد قربان کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔وہ جان دیتے رہے،قوم کو حیات ملتی رہی۔بندے گرتے رہے،لیکن جھنڈا بلند رہا۔

بوسنیا کے صدر عالی جاہ عزت بیگ اور مشہور کمانڈر زائن اماموویچ اسی مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے۔ان لوگوں نے بغیر کسی بیرونی امداد کے نسل کشی کی بین الاقوامی مہم کا سامنا کیا اور اپنی قوم کو بچانے میں کامیاب رہے۔آج مدارس کی تعلیم کا یہ طریقہ اور مدارس کے اخراجات پورا کرنے کا یہ طریقہ دونوں ہم سے رخصت ہوگئے ہیں۔البتہ دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اسی وژن کے تحت چل رہی ہیں اور ان کے اربوں ڈالر کے اوقاف ان کو خود کفیل بھی بنائے ہوئے

ہیں۔ مغرب کی یونیورسٹیوں میں تیسری دنیا کی قیادت کی تیاری کا نظریہ وقف کے اس نظام سے پورا کیا جارہا ہے جو ہمارے آباء واجداد کا نظریہ اور نظام تھا۔ ہمارے اسلاف دینی قیادت اپنی سرزمین سے تیار کرتے تھے اور اپنے وسائل کے بل بوتے پر تیار کرتے تھے۔ ہمارے ہاں کی دنیوی قیادت باہر سے تیار ہوکر آتی ہے اور دینی قیادت کی تیاری کا نظام خودکفالتی ذرائع پر مبنی نہیں۔اس لیے ہمارے مسائل ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ ہمارے بحران ہیں کہ ان کے جنم لینے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی اگلے بحران کے ختم ہونے میں۔ مسئلہ غیروں سے سیکھنے کا نہیں، اپنی میراث کو زندہ کرنے کا ہے۔ دوسروں کی تقلید کا نہیں، اپنی متاع گم گشتہ کی دریافت کا ہے۔

آسمانوں پر نظر کر، انجم ومہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

کامیابی کی کلید

اس دنیا میں مواقع سے فائدہ اُٹھانا......یعنی قدرت کے فراہم کردہ مواقع سے جائز فائدہ اُٹھانا...... کامیابی کی کلید ہے، لیکن مواقع ضائع کرنے میں ہمارا ثانی کوئی نہیں۔ آپ ترکی کی مثال لے لیجیے۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے نتیجے میں جو نئے ممالک قائم ہوئے ان کی تعداد اس وقت (بشمول متنازع ترک قبرص) 40 بنتی تھی۔ ضرب المثل ہے کہ ہاتھی مر کے بھی سوالاکھ کا ہوتا ہے۔ 40 ملکوں کے وارث کو انقلابی مہمات سے باز رکھنا آسان نہ تھا، لہٰذا 24 / جولائی 1923ء کو سوئٹزلینڈ کے شہر لوزان میں جنگ عظیم اول کے اتحادیوں اور ترکی کے درمیان ایک معاہدہ کروایا گیا۔ اس معاہدے کی اصل روح ترکی میں خلافت کا خاتمہ اور جمہوریت کا قیام تھا۔ اور پھر اس نوزائیدہ جمہوریت کو اس وقت تک تحت القہر رکھنا تھا جب تک وہ جاں بلب نہ ہوجائے۔ اس معاہدے کے تحت یونان، بلغاریہ اور ترکی کی سرحدی حدود متعین کی گئیں۔ قبرص،

عراق اور شام پر ترکی کا دعویٰ ختم کر کے آخر الذکر دونوں ممالک کی سرحدوں کا تعین کیا گیا۔ اسی معاہدے کے تحت نو آموز جمہوریہ ترکی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ گویا خلافت کے سابقے کو ختم کروا کر اور غیر خلافتی طرز حکومت کو قبول کر کے احسان عظیم کیا گیا۔ چند ماہ بعد 3/مارچ 1924ء کو خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ سلطان اور ان کے اہل خانہ کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر جلاوطن کر دیا گیا۔ آخری سلطان محمد ششم وحید الدین (1861ء تا 1926ء) 17/نومبر 1922ء کو ملک چھوڑ گئے۔ 50 سال بعد 1974ء میں ترک قومی مجلس اعلیٰ نے سابق شاہی خاندان کو ترک شہریت عطا کرتے ہوئے وطن واپسی کی اجازت دے دی۔

اب حال ہی میں ترکی کے ریکارڈ ساز لیجنڈ صدر رجب طیب اردگان نے آسٹریا کے شہر ہنگری میں جلاوطن عثمانی خاندان کے آخری افراد کو واپس ترکی میں آبادی کے ساتھ ان کے آباء و اجداد کی باقیات کو بھی بصد عزت و احترام واپسی کا حق دے دیا۔ الغرض معاہدہ لوزان کے بعد ترکی لمبی تان کر سو گیا تھا۔ اس کی اخلاقیات و معاشیات دونوں کا تنزل ضرب المثل بن چکا تھا۔ وہ یورپ کے سائے میں بستا تھا، لیکن یورپی ترقی سے کوسوں دور تھا۔ سیکولرازم اور بدعنوانی کے فالج خیز انجکشن نے اسے "مرد بیمار" کے لقب سے متعارف کروا کر چھوڑا تھا۔ ان حالات میں نرگس کی بے نوری پر قدرت کو رحم آ گیا اور ترکی کے چمن میں اردگان جیسا دیدہ ور پیدا ہو گیا۔ اس نے صحیح معنوں میں "مسیحائے قوم" کا کردار ادا کرتے ہوئے وعدوں اور نعروں کو ایک طرف رکھتے ہوئے "مرد بیمار" کی اصل نبض پکڑ لی اور اس کے دست شفا نے اس بیمار کے ہاتھ کو اس وقت تک تھامے رکھا جب تک شفا کے آثار نہ ظاہر ہونے لگے۔ ان حالات میں اہل پاکستان جن کے آباء و اجداد کے "تحریک خلافت"، "تحریک ریشمی رومال" اور "تحریک ترک موالات" کے زمانے سے ترک بھائیوں کے ساتھ مضبوط ایمان اور تاریخی رشتے استوار چلے آ رہے تھے، کو

چاہیے تھا کہ اس کے ہاتھ کو تھام لیتے تاکہ خود بھی شفا پاتے اور شاید ترک بھی ہم سے کچھ نہ کچھ دوا پا لیتے۔ لہٰذا دونوں ملکوں کے درمیان دو سطح پر کام کی ضرورت تھی جو پوری نہیں ہو رہی اور ایک صدی بعد آنے والے تاریخ کے اس نادر موقع کو مزید ضائع کیا گیا تو پھر چڑیاں کھیت چگ جائیں گی اور ہاتھ ملنے سے کچھ نہ ہووت۔

ایک تو علمی و نظریاتی اعتبار سے علمائے پاکستان کو علمائے ترک سے روابط بڑھانے اور افادے و استفادے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہاں قسما قسم لوگوں اور رنا رنگ داعیوں کی ایسی یلغار ہے کہ الامان الحفیظ!! کل کے منفی تبصروں سے آج کی مثبت کوششیں بہتر ہی نہیں، لازم بھی ہیں اور ہماری روایت بھی۔ نیز فرض بھی ہیں اور قرض بھی۔

دوسرے تجارتی سطح پر تعلقات بڑھانے اور باہمی تجارت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ترکی کی مصنوعات عالمی معیار کی ہوتی ہیں اور ان میں سے متعدد اشیائے صرف کی پاکستان میں بے تحاشا کھپت ہے۔ دوسری طرف پاکستان کی چند چیزوں کی ترکی میں بہت مانگ ہے اور کئی شعبے (جن کی نشان دہی میرا میدان نہیں، تاجر حضرات کا اپنا میدان ہے اور اپنا کام ہے۔ وہ چاہیں تو چند لمحوں میں سب کچھ جان سکتے ہیں۔) ایسے ہیں جن پر فی الفور توجہ نہ دی گئی، تو آثار بتا رہے ہیں کہ بھارت ان منڈیوں پر قبضہ کر لے گا، لہٰذا اس وقت پاک ترک تجارت نہ صرف بے تحاشا آمدنی کا ذریعہ بلکہ قومی و ملّی فریضہ بھی ہے۔ ذیل میں ایک نقشہ جاتی رپورٹ پیش کی جا رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ مواقع سے فائدہ اُٹھانے میں کتنے سست اور کاہل اور ہمارے حریف کتنے تیز و طرار اور چابک دست ہیں۔ شاید کہ فقیر کی دہائی کسی صاحبِ دل پر اثر کر جائے۔ علمائے کرام اور تاجر حضرات اپنا اپنا فرض پہچان کر اپنا اپنا میدان سنبھالیں اور ہم کفِ افسوس ملنے کے بجائے گمشدہ بہاروں کو لوٹتا ہوا دیکھ سکیں۔

ترکی میڈیا پر قدغن: حقیقت یا افسانہ؟

ڈاکٹر دُرمش بُلگر

کچھ عرصے سے بعض پاکستانی اخباروں میں ترکی کے حوالے سے یہ خبریں وقفے وقفے سے گردش کر رہی ہیں کہ حکومت ترکی نے (یہاں مراد صدر رجب طیب اُردوگان کی ذات سے ہے) میڈیا پر قدغنیں لگا کر آزادانہ اظہار رائے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ ناپسندیدہ کالم نگاروں کو عدالتی کارروائی کے ذریعہ نہ صرف جیلوں میں بھیجا جا رہا ہے بلکہ اخباری انتظامیہ کو ہٹا کر ان کی جگہ ہم خیال میڈیا نمائندوں کو مقرر کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں دو ترک روزناموں ''زمان'' اور ''جمہوریت'' کی مثالیں دے کر یہاں کے کچھ کالم نگار ترکی حکومت پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ حکومت اپنے مخالفوں کی آواز دبانے کے لیے یہ حربہ استعمال کر رہی ہے۔ پاکستانی میڈیا میں ترکی مخالف خبروں کی ترسیل حیرت انگیز بات ہے۔ یہاں کے کالم نگار حضرات یقیناً ایسا جان بوجھ کر نہیں کر رہے، اس کی وجہ ترکی کے سیاسی و معاشرتی حالات سے ان کی کم خبری ہے۔

چوں کہ وہ اپنے کالم کا پیٹ بھرنے کے لیے یورپی میڈیا کا سہارا لیتے ہیں اور یورپ ہمارا کتنا مخلص ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے وہ ترکی کے موجودہ حالات کی یک رخی تصویر کشی کررہے ہیں۔ یہ ناقابل سمجھ بات ہے۔ کسی بھی باوقار میڈیا کے لیے روانہیں کہ وہ کسی برادر ملک کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصدقہ ذرائع کو اختیار نہ کرے۔ ایک ایسا ملک جس نے یہاں وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کررکھی ہو، اس ملک کے حالات کی یک رخی تصویر دکھانا کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔ اس سے دونوں ملکوں کے عوام میں غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے تاکہ لوگوں کے سامنے صحیح صورتحال آسکے۔

ترکی حکومت پر لگائے جانے والے الزامات کی اصل حقیقت درج ذیل ہے:

''زمان اخبار'' نام نہاد اسلامی تنظیم جو پوری دنیا میں گولن تحریک کے نام سے معروف ہے، کا نمائندہ اخبار ہے۔ اس تحریک کے کرتا دھرتا امریکا میں پناہ گزیں ہیں۔ ترکی کی ایک عدالت نے چند مہینے پہلے ان کے ریڈ وارنٹ جاری کیے تھے۔ ان پر الزام ہے کہ وہ ترکی میں ایک ایسی دہشت گرد تنظیم کے سربراہ ہیں جس نے موجودہ ترکی حکومت یعنی جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کا تختہ جبر اور تشدد کے ذریعے اُلٹنے کی کوشش کی ہے۔

ایک عدالتی فیصلے کی رو سے مذکورہ ''متوازی ریاستی ڈھانچہ'' نے پولیس، عدلیہ اور فوج جیسے حساس ادارے میں اپنے حامی پیدا کیے، مسلح دہشت گرد تنظیم قائم کی، دھمکی کے ذریعے لوگوں سے پیسا لوٹا اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے خرچ کیا، قومی سلامتی کے متعلق ایسی معلومات جن کا اخفا میں رکھنا ضروری تھا، جاسوسی کی غرض سے انہیں حاصل کیا اور پھر انہیں اخبارات میں شائع کروایا گیا۔ ان الزامات کے ثابت ہونے پر عدالت نے ان لوگوں کو ملازمتوں سے برخواست کردیا۔ بعض کو جیل بھیج دیا گیا۔ چند لوگ جن میں ''زمان اخبار'' کے صحافی، چیف ایڈیٹر اور پبلک

پراسیکیوٹر بھی شامل ہیں، فرار ہو کر یورپ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ قومی سلامتی کے خلاف برسر پیکار ہونے کی وجہ سے ''متوازی ریاستی ڈھانچہ'' کو ملکی سلامتی کے خلاف عناصر کی کیٹگری میں شامل کرلیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ اخبار اور اس کی انتظامیہ مذکورہ بالا ''متوازی ریاستی ڈھانچہ'' کی سرگرمیوں میں ملوث تھی اور سہولت کار کے طور پر کام کر رہی تھی، اس لیے استنبول کے پبلک پراسیکیوٹر نے مارچ کے شروع میں ''زمان اخبار'' کی انتظامیہ کو مضبوط دلائل کی بنیاد پر ہٹا کر ان کی جگہ غیر جانب دار انتظامیہ کو مقرر کر دیا۔ جہاں تک ''جمہوریت اخبار'' کے کالم نگار جان دوندار، اَردم گل اور ان جیسے دیگر صحافیوں کا تعلق ہے، وہ بھی قریب قریب مذکورہ بالا الزامات کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیے گئے تھے۔

اب عدالتی کارروائی کے نتیجے میں یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ ترکی کی عدالتوں میں جن صحافیوں کے خلاف آج کل مقدمہ چل رہا ہے، ان میں سے کوئی بھی صحافتی یا پیشہ ورانہ سرگرمیوں کی وجہ سے جیل میں نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ مذکورہ بالا جاسوسی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل میں ہیں۔ رہی بات صدر رجب طیب اُردوغان کی طرف سے چند صحافیوں اور سیاست دانوں کے بارے میں عدالت میں چلائے گئے مقدمات کی، تو کوئی بھی غیرت منداور باوقار آدمی اپنی ذات یا اپنے کسی فیملی ممبر کے بارے میں ہتک آمیز زبان استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا عدالتی کارروائیوں کو ان صحافیوں اور سیاست دانوں کے ساتھ شخصی خصومت اور آمریت پسندانہ مزاج سے منسوب کر کے تنہا صدر رجب طیب اُردوغان کی ذات کو مجروح کرنے کی کوشش کیوں کی جارہی ہے؟ ان الزامات نے اس وقت جنگ کی صورت اختیار کیوں کی ہے؟ اس کا جواب ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔ یہاں اتنا بتانا ہی کافی ہے کہ اندرونی و بیرونی میڈیا نے دنیا بھر میں بسنے والے مظلوم مسلمانوں

کے حق میں بین الاقوامی سطح پر مسلسل آواز بلند رکھنے کی پاداش میں صدر رجب طیب اردوغان کو تختۂ مشق بنایا ہوا ہے۔

واضح رہے کہ "متوازی ریاستی ڈھانچہ" نامی دہشت گرد تنظیم سال 2012ء سے مسلسل جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کی حکومت کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے مختلف مزاجوں اور پیشوں کے لوگوں کو بطور آلہ استعمال کر رہی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنظیم ترکی کے خلاف عالمی سازش کا بھی حصہ ہے۔ آخری بات یہ کہ حال ہی میں ہونے والی ایک رائے شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی عوام کی بڑی اکثریت "متوازی ریاستی ڈھانچہ" کے خلاف کی جانے والی عدالتی کارروائی کی حمایت کرتی ہے۔

ان دنوں کی کہانی

ترکی میں چار دہائیوں سے قیام پذیر ایک پاکستانی شہری کی سبق آموز داستان

☆ آج کے ہمارے مہمانِ خصوصی ایک ایسی شخصیت ہیں جو کل پاکستان سے ایک طالب علم کی حیثیت سے برادر اسلامی ملک ترکی گئے اور آج وہاں ایک معزز شہری کی حیثیت سے پاکستان اور ترکی دونوں حلقوں میں معروف ہیں۔ آج سے تیس پینتیس برس قبل جب وہ ترکی پہنچے تو وہاں کے حالات قطعاً کچھ اور تھے۔ ان تین چار دہائیوں کا جو عرصہ انہوں نے وہاں گزارا۔ اس دوران وہاں کے حالت میں مختلف موڑ آئے اور اس دوران خود ان پر کیا بیتی؟ اس دوران ترکی میں انہوں نے کیا کچھ ہوتے ہوئے دیکھا؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ سوالات کو مختصر رکھیں اور معزز مہمان کو بولنے کا پورا موقع دیں۔ آج کی محفل کا آغاز اس نکتے سے کریں کہ اس وقت کیا عوامل تھے کہ جن کی وجہ سے آپ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ترکی کا انتخاب کیا؟ وہاں جانے کے بعد آپ کو بحیثیت مسلمان اور مہمان آتے ہیں کیا کچھ دیکھنا پڑا؟ کس طرح سے

آپ نے اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا اور کس طرح اپنے ملک کے وقار، نظریات اور مذہبی ترجیحات کا خیال رکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ لیکن اس سب کچھ سے پہلے بھی یہ کہ ترکی جانے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

ڈاکٹر صاحب: آپ نے بڑی یادگار قسم کی کہانی چھیڑ دی۔ ترکی جانے کا اتفاق کچھ اس طرح ہوا کہ جب میرا ایف ایس سی اختتام کو پہنچا تو ہم کچھ دوست آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ اب آگے کیا ہوگا؟ اسی طرح ایک دفعہ میں اپنے دوست کے پاس سیالکوٹ گیا۔ میرے دوست اجمل نے بتایا کہ سلیم جو ہمارا ساتھی تھا وہ ترکی پڑھنے کے لیے جا رہا ہے تو تم کیوں نہیں جاتے؟ تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ رخ کہاں سے نکل آیا؟ میں نے کہا آپ بھی کوشش کرو۔ اس نے کہا کہ چلو کوشش کرتے ہیں۔ ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ میرے دوست اجمل کے کچھ دوست آئے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔ وہ آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اس وقت اجمل نے انہیں میرا تعارف یوں کروایا کہ یہ ہمارے دوست خاور ندیم صاحب ہیں۔ انہوں نے ابھی ایف ایس سی کی ہے اور یہ اب مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے ترکی جا رہے ہیں۔ یعنی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے مشورہ دے رہا تھا اور تھوڑی دیر میں اس نے خود ہی اعلان بھی کر دیا کہ یہ ترکی جا رہے ہیں۔ اب اس نے جس موقع ماحول میں یہ بات کی اس وقت مجھے انکار کی جرأت بھی نہ ہو سکی کہ میں کہوں کہ میں نہیں جا رہا۔ اس طرح میں نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے بھی میری طرف مدح سرائی نظروں سے دیکھا کہ واہ بھئی! یہ لڑکا تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جا رہا ہے۔ پھر جب میں گھر گیا تو بڑا پریشان تھا کہ یہ کیا مسئلہ ہو گیا؟ والد صاحب سے بات کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے اپنی والدہ سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ بیٹا! اگر تمہیں یہ ٹھیک لگتا ہے تو میں تمہارے والد سے بات کروں گی۔ والد صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے کہا کہ اس سے کہیں کہ جا کر معلوم کرے کہ حقیقت کیا ہے؟ اگر وہاں پڑھائی ٹھیک ہے تو سوچتے ہیں۔ اس طرح وہ سلسلہ

چل پڑا تو کچھ عرصے بعد ہم ترکی پہنچ گئے۔

☆اس وقت پاکستان میں ترکی کے بارے میں ایک پاکستانی طالب علم کا کیا تصور تھا؟

◄ اُس وقت اور اس عمر میں تو ذاتی طور پر کچھ معلومات نہیں تھیں۔ سوائے اس کے کہ سلیم ترکی جارہا ہے جو کہ نہیں گیا تھا اور یہ پتا چلا کہ کچھ دوست پہلے سے جاچکے ہیں۔ ان میں سے ایک میرا ہم سبق بھی تھا جو وہاں جاچکا تھا۔ ہمیں ترکی کے بارے میں کوئی خاص معلومات بھی نہیں تھیں۔ البتہ جو ہمارے بوڑھے حضرات دادا وغیرہ یا ان کی عمر کے لوگ تھے، ان کے ذہنوں میں لال ٹوپی والا، عثمانی سلطنت والا ترکی تھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہاں ہر کوئی سرخ ٹوپی پہنتا ہے۔ وہاں لوگوں کی اکثریت داڑھی، نماز والی ہے۔ یعنی کہ ان کے اپنے زمانے میں ترکی کا جو نقشہ تھا وہ ان کے ذہنوں میں تھا اور درمیان میں ترکی جو ایک لمبے عرصے تک اسلامی دنیا سے دور ایک سیکولر ترکی رہا، اس درمیانے عرصے کے بارے میں ان حضرات کو کوئی خاص معلومات نہیں تھیں کہ اب یہ ملک کیسا ہے؟ اور وہاں دین کا کیا حال ہو چکا ہے۔

میں نے کاغذات وغیرہ بنائے، جمع کروائے اور انقرہ یونیورسٹی ترکی پہنچ گیا۔ وہاں جب پہلے دن ہاسٹل تک رسائی ہوئی تو میرا وہ دوست جو مجھ سے پہلے جاچکا تھا، وہ گیٹ پر مجھے بڑی خوشی سے ملا۔ اسی نے میرے مختلف کام نمٹائے اور مسائل حل کروائے۔ نماز کا وقت ہوا تو میں نے نماز پڑھی تو میرے اس ساتھی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ دیکھو! یہاں پر کہیں اِدھر اُدھر کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھنی شروع کر دینا۔ میں نے کہا کیوں؟ اس نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ آپ کی پٹائی لگ جائے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نماز پڑھنے پر کیوں مار پڑے گی؟ بہرحال! بعد میں مجھے پتا چلا کہ یہاں تو رائیٹ اور لیفٹ کا جھگڑا چل رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کچھ سال پہلے کراچی میں ایک سلسلہ تھا کہ بوریوں میں لاشیں ملتی تھیں۔ اسی طرح ترکی میں بھی صبح کے وقت کچرے کے کنٹینروں میں سے لاشیں ملتی تھیں۔ میرے وہاں جانے سے دو ہفتے پہلے ہی ترکی

میں مارشل لا لگ چکا تھا۔ یہ 1980ء کی دہائی تھی۔ 12 ستمبر کو مارشل لا لگ چکا تھا اور میں 29 ستمبر کو وہاں پہنچا تھا۔ مارشل لا کی وجہ سے آپس میں لوگ تو گتھم گتھا تو نظر نہیں آئے، البتہ ایک افراتفری اور خوف و ہراس والی صورتحال ضرور تھی۔ مارشل لا والوں نے دونوں طرف سے سیکڑوں لوگ اٹھا کر جیلوں میں ڈالے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر ہر طرف فوج ہی فوج نظر آتی تھی۔ اسی لیے اس ساتھی کی مجھے یہی تلقین تھی کہ یہاں بعض محلے رائیٹ کے ہیں اور بعض محلے لیفٹ کے ہیں۔ اس لیے آپ کو پتا نہیں چلے گا کہ یہ کس طرف ہیں اور یہ کون سا گروپ ہے؟ مساجد بھی صرف اذان کے وقت کھلتی تھیں اور نماز کے بعد بند ہو جاتی تھیں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ 70 سال تک مسجدیں کھلی ہی نہیں؟ اذان پر پابندی تھی۔

◄ 1925ء کے بعد مختلف علاقوں کی مساجد کے ساتھ یہ ظلم ضرور ہوا، لیکن ساری کی ساری مساجد بند نہیں ہوئیں۔ البتہ 1932ء میں اتاترک کے ہوتے ہوئے ہی اس وقت کی حکومت نے اذان کو ترکی زبان میں دینے کا قانون بنا دیا تھا۔ عربی میں اذان دینا ممنوع تھا۔ ترکی زبان میں اذان اور اقامت کا ترجمہ پڑھ دیا جاتا تھا اور جو عربی میں اذان دیتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ 18 سال تک ہی رہا۔ پھر 1950ء میں دوبارہ عربی میں ہی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس دوران بہت سی مساجد غیر آباد ضرور ہو گئی تھیں۔ کچھ مساجد میں انہوں نے ڈپو وغیرہ بھی بنائے۔ یہ ریکارڈ میں موجود ہے۔ اسی طرح اتاترک کی طرف سے لکھا ہوا ایک خط بھی موجود ہے جو اس نے اس وقت کی حکومت کو لکھا تھا کہ جو مشرقی علاقوں کی بہت سی مساجد جو ڈپو یا گھوڑوں کے چارے کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں اس سے عوام کے اندر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے، لہٰذا انہیں خالی کیا جائے۔

اس بات سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کا کچھ ضرور ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح بعض مساجد کی دیواروں میں کنڈے وغیرہ بھی لگے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس سے لگتا ہے

کہ شاید ان میں گھوڑے وغیرہ مسجد کے اندر نہ سہی، لیکن مسجد کے صحن میں باندھے جاتے ہوں گے۔ بعض ایسی عمارتیں بھی دیکھیں کہ ایک بلڈنگ گری اور اسے کچھ دوستوں نے کسی مقصد کے لیے خریدا تو جب اس زمین کے متعلقہ ادارے سے جا کر سابقہ نقشے نکلوائے تو وہ مسجد نکلی، حالانکہ اب تو وہاں تین چار منزلہ عمارت تھی۔ اس طرح کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مساجد تباہ ہوئیں اور تبدیل بھی کی گئیں۔

☆...... استنبول کے ایک علاقے میں ایسی مسجد آپ نے مجھے دکھائی تھی۔ جہاں زبردستی تعمیر شدہ رہائشی مدت گزار کر کینٹین میں عارضی طور پر نماز پڑھی جا رہی تھی۔

◄...... جی آپ نے صحیح یاد دلایا۔ وہ عمارت اس ظلم کی زندہ مثال تھی۔ 1980ء میں مساجد تو تھیں۔ اذان کے وقت کھلتی تھیں اور نماز کے فوراً بعد بند کر دی جاتی تھیں۔ کسی مسجد کے باہر کوئی برآمدہ ہوتا تو ویسے ہی کھلا رہتا تو اور بات ہے، لیکن جو مسجد کا بند ہونے والا حصہ ہوتا تھا اسے بند کر دیا جاتا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہے، بلکہ موجودہ حکومت نے تو یہ حکم جاری کیا ہے کہ مساجد باقاعدہ کھلی رہنی چاہییں۔ البتہ رات کے ایک مخصوص وقت میں بند ہوتی ہیں جیسے عام طور پاکستان میں بھی ہوتا ہے۔ بہر حال! میرے اس دوست کی پہلی تنبیہ کہ نماز پڑھنے پر مار پڑ سکتی ہے۔ یہ میرے لیے ایک عجیب بات تھی۔ پھر ہم نے بھی دیکھا کہ وہاں کے دینی طبقے پر ایک خوف کی سی کیفیت طاری تھی۔ یعنی دیندار لوگ نماز پڑھتے بھی تھے تو چھپ کر پڑھتے تھے۔ کالج اور یونیورسٹیز میں ایسے لوگ بھی تھے جو پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے، لیکن ان کے حال حلیے سے پتا ہی نہیں لگتا تھا کہ یہ بھی نماز پڑھتے ہوں گے۔ انہوں ضرور کسی نہ کسی جگہ مصلٰی کی طرح کوئی چیز چھپائی ہوتی تھی اور وہ اپنا کمرہ مقفل کر کے اندر نماز پڑھا کرتے تھے۔

جب ایسے لوگوں سے میرا تعارف ہوا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں نماز پڑھتا ہوں تو کچھ لوگوں نے

مجھے بھی آفر کی تھی کہ نماز کے وقت اگر نماز پڑھنی ہو تو ادھر آؤ ہم تمہیں جگہ بتاتے ہیں۔ پھر انہوں نے وہ خفیہ جگہ تہہ خانوں کے ادھر ادھر ستونوں کے پیچھے دکھائی کہ یہاں نماز پڑھ لیا کرو۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ عمومی طور پر نمازی پر ایک دباؤ ضرور ہے۔ اگر بوڑھے مسجد جاتے رہیں تو انہیں کچھ نہیں کہتے تھے، لیکن کالج اور یونیورسٹیز میں نوجوانوں کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت تھی۔ چھوٹے دیہات، چھوٹے شہر کی طرف سے آنے والے نئے طلبہ جو کہ تھوڑا بہت دینی ذہن رکھتے ہوں تو ان کے لیے باقاعدہ سیکولر ماحول ترتیب دیا جاتا تھا۔ اور انہیں خراب کرنے کا یونیورسٹیز میں پورا انتظام ہوتا تھا۔ اس لیے کچھ ہی عرصے میں وہ بھی اس ماحول میں گھل مل جاتے تھے۔ البتہ وہاں بھی کچھ دوست ایسے مل گئے جو خاموشی کے ساتھ دین داری کو قائم کرنے کے لیے محنت اور کوشش کر رہے تھے۔ بعد میں پتا چلا ان کا تعلق جیسے آج کل کی حکومت کے لوگ طیب اردگان وغیرہ ہیں، ان کے ساتھ ہے۔ ہمیں بھی بعد میں پتا چلا کہ یہ لوگ بھی اسی طرح کے سلسلوں سے نکل کر یہاں تک آئے ہوئے لوگ ہیں۔ وہاں پاکستان کے مقابلے میں ایسا ماحول تھا کہ ایک دفعہ پاکستان لاہور سے ڈاکٹر طاہر اشرف صاحب ترکی تشریف لائے جو بالکل مکمل تبلیغی مزاج کے حامل تھے۔ وہ کچھ عرصہ وہاں رہے تو ہم نے ان کی صحبت میں ایک سہ روزہ لگایا۔ ہم استنبول گئے تو وہاں جا کر پتا چلا کہ یہاں بھی تبلیغی جماعت ہے۔ استنبول میں ایک چھوٹی سی مسجد کی دوسری منزل پر تھوڑے سے بزرگ اکھٹے ہوتے تھے اور وہاں کی پوری تبلیغی جماعت یہی تھی۔ یہ وہاں کا تبلیغی مرکز تھا۔ بہرحال! یہ بھی ہمیں بہت بڑی بات لگی اور اس زمانے میں ہم کہتے تھے کہ ایسے ماحول میں تبلیغ والے یہاں اتنا کام کرتے ہیں۔

☆ ...... تبلیغ کے ساتھ جڑنے کے بعد کیا گزری؟

◄ ...... ہم نے پاکستان میں پرورش پائی تھی اس لیے ایک دو سہ روزے لگانے کے بعد ہم نے تو داڑھی رکھ لی۔ اس سے وہاں کہرام مچ گیا۔ یونیورسٹی میں جو گیٹ کیپر ہوتا تھا وہی ہمیں روک لیتا۔ پروفیسر تک تو بات ہی نہیں جاتی تھی۔ اس پر ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ پاکستان میں تو کالج

لیول کے طالب علم سے پروفیسر بھی ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں کرتا جبکہ یہاں تو ایک چوکیدار بھی روک لیتا ہے۔ اس طرح کے حالات سے ہم کئی بار گزرے، لیکن جب میں نے باقاعدہ داڑھی رکھ لی تو میرے لیے تو مسائل کھڑے ہوگئے۔ وہاں پر اسٹوڈنٹ افیئر کی جو سیکریٹری تھی اس نے تو مجھے ایک دن پکڑ لیا اور کہا کہ ابھی جاؤ اور داڑھی کاٹ کر آؤ اور پھر مجھے آکر دکھاؤ۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تو وہ بضد ہوگئی۔ اس پر میں نے صاف کہا: میں تو داڑھی نہیں کاٹوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر نہیں کاٹو گے تو میں ابھی رپورٹ کردوں گی۔ چلو ڈین کے پاس۔ میں اس کے ساتھ ڈین کے پاس چلا گیا تو اتفاق سے وہ ڈین صاحب اس وقت مصروف تھے۔ ہمارے ڈین احمد سنیل صاحب تھے اور مجھے ان کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ خود بھی نمازی تھے۔ ظاہر ہے وہ بھی اسی طرح چھپ کر ہی نماز پڑھتے ہوں گے۔ بہرحال جب ڈین کے پاس یہ مسئلہ گیا تو مجھے ملاقات کا وقت دیا گیا۔ جب میں ڈین صاحب سے ملاقات کے لیے جانے لگا تو احساس ہوا کہ مجھے ترکی زبان پر دسترس نہیں ہے اس لیے میں کسی دوست کو ساتھ لے جاؤں۔ میرا ایک دوست تھا مصطفیٰ شاہین۔ وہ دیندار بھی تھا اور امام وخطیب اسکول کا بھی پڑھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ ہمارے ڈین احمد سنیل صاحب کے ساتھ ان کا وائس ابراہیم بھی بیٹھا ہوا تھا جو کہ کٹر سیکولر اور کمیونسٹ تھا۔ ان دونوں حضرات نے میرے ساتھ بات کی کہ مسئلہ کیا ہے؟ میں نے کہا میں پاکستانی ہوں۔ میں اپنے مذہب اور تہذیب کے حساب سے سوچتا ہوں اس لیے میں نے داڑھی رکھی ہے۔ اس نے کہا کہ تم نے داڑھی سنت کی نیت سے رکھی ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: بس! ٹھیک ہے، تمہیں ثواب مل گیا۔ اب یہاں کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا تم اسے کاٹو اور اس کا جو گناہ ہوا تو وہ مجھے رہا۔ مجھے یہ عجیب لگا۔ میں نے کہا کہ جناب میں اپنا گناہ تو کسی پر ڈالنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں تو اسے عملاً پورا کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا رکھنے کا ثواب کتنا ہے؟ کاٹنے کا گناہ کتنا ہے؟ میں اس سے غرض نہیں رکھتا میں اس سنت کو اپنی زندگی میں زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات پر وہ کافی بضد ہوگیا تو میرا دوست بھی

میرے ساتھ گفتگو میں شریک ہوا اور اس نے کچھ میری حمایت کی اور کچھ ان کی حمایت کی۔ اس طرح بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ اچانک مجھے یاد آیا میرے تبلیغ والے استاد صاحب کہا کرتے تھے کہ ایسے موقعے پر تیسرے کلمے کا ورد کیا کرو۔ میں نے خاموشی سے تیسرے کلمے کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ پروفیسر احمد سنیل صاحب کچھ دیر خاموش رہے اور پھر اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ جو افریقہ سے لوگ آئیں گے تو ان کے تو طرح طرح کے کلچر اور مذہب ہیں۔ ان کے کانوں میں بالیاں، گلے میں زنجیریں اور ہاتھ میں کڑے ہوتے ہیں اور سر پر عجیب وغریب قسم کے بال ہوتے ہیں تو کیا اس طرح کے جتنے بھی لوگ آئیں گے ہم ان کے کلچر اور مذہب میں دخل اندازی کریں گے؟ کیا انہیں بدل سکیں گے؟ اس نے کہا کہ ہاں یہ تو مسئلہ ہے؟ پروفیسر صاحب نے کہا کہ جب ہم افریقا والوں کی پسند ناپسند میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تو کیا اس بے چارے کا قصور مسلمان ہونا ہے؟ یہ بھی تو غیر ملکی ہے، مسلمان ہے۔ کس لیے ہم اسے پریشان کر رہے ہیں؟ یہ ٹھیک نہیں۔ وائس نے کہا: ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ بیٹا تم جاؤ۔ میں اوپر والوں سے بات کروں گا۔ میں ان سے کہا کہ سر آپ تو پتا نہیں کب بات کریں گے، لیکن مجھے صبح چوکیدار روک لے گا۔ تو اسی مخالف نائب نے کہا کہ نہیں آپ چلے جائیں، میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔ تو واقعی اس کے بعد مجھے کسی نے نہیں چھیڑا۔ اس واقعے کے چند ہی ماہ بعد میں نے سائن بورڈ پہ ایک نیا اعلان لکھا ہوا دیکھا کہ شق "اے" لڑکوں کے لیے۔ شق "بی" لڑکیوں کے لیے۔ اور شق "سی" غیر ملکیوں کے لیے۔ لکھا گیا تھا کہ جو غیر ملکی طلبہ ہیں وہ گہرائی میں جائے بغیر اپنے اپنے کلچر اور ثقافت کے مطابق سب کچھ کر سکتے ہیں۔ الحمدللہ! اس وقت اس عاجز کی استقامت کی وجہ سے ترکی کی یونیورسٹیز کے اندر ایک بہتر تبدیلی سامنے آئی۔

☆...... یہ تو داڑھی کی بات تھی۔ سنا ہے آپ شروع سے لباس بھی پاکستانی پہنتے تھے؟

◄...... اس کی بھی مستقل داستان ہے۔ چند سالوں کے بعد چوتھے سال کے لیے مجھے

استنبول یونیورسٹی منتقل ہونا پڑا تو انہیں پتا نہیں کیا سوجھا کہ میرے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔ میرے بارے میں کہا گیا یہ یونیورسٹی میں بالکل نہیں چل سکتا اور میری رجسٹریشن وغیرہ سب کچھ روک دیا۔ کیونکہ میں تو پاکستانی لباس بھی پہنتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ یہاں نہیں چلے گا۔ مجھے ایک نوٹس جاری ہوا کہ تم اپنا لباس اور داڑھی وغیرہ ٹھیک کر کے آؤ، ورنہ یہاں سے نکال دیے جاؤ گے۔ میں اپنے شعبے کے سربراہ کے پاس گیا تو میں نے انہیں دکھایا کہ یہ تو آپ کے قانون میں شامل ہے۔ اس نے کہا کہ کہاں ہے؟ فیکلٹی سیکریٹری کو یہ پتا نہیں تھا تو میں نے ان کو نکال کر دکھایا کہ یہ دیکھیں۔ اب اسے ماننا پڑا۔ لہٰذا میری رجسٹریشن تو جاری ہوگئی، لیکن ساتھ ہی مجھ پر ایک ڈسپلن کیس بھی بنا دیا گیا اور میرے سارے کام رک گئے۔ ڈسپلن کیس میں جب میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے کہا کہ تم یہ لباس یہاں نہیں پہن سکتے۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ تو ہمارا قومی لباس ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں پاکستان سے ضیاء الحق اور ان کے ساتھ آنے والے تو اس طرح کا لباس نہیں پہنتے۔ چونکہ صدر ضیاء الحق صاحب اکثر وہاں فوجی وردی میں جایا کرتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے تحریری طور پر لکھ کر دے دیں۔ انہوں نے مجھے تحریری شکل میں یہ اعتراض لکھ کر دے دیا۔ میں نے اس کا ترجمہ کروا کر ضیاء الحق صاحب اور فارن افیئرز کو بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ اوبجیکشن لگا دی کہ یہاں پاکستان کے لباس کی وضاحت کی جائے۔ مجھے دونوں طرف ریزیڈنسی سے بھی اور فارن منسٹری سے بھی لیٹر آیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے قونصلیٹ سے بھی فون آیا۔ پھر مجھے قونصلیٹ کے ایک آفیسر نے کہا کہ ہم نے آپ کے ڈین سے کل وقت لیا ہوا ہے۔ میں کل آرہا ہوں۔ اور قونصلیٹ آفیسر صاحب اگلے دن خود سفید خوبصورت شلوار قمیض اور اوپر سیاہ واسکٹ کے ساتھ تشریف لائے۔ اتفاق سے ان کی تھوڑی تھوڑی داڑھی بھی موجود تھی۔ اس

حلیے میں آکر جب انہوں نے فیکلٹی میں بات کی تو انہوں نے مجھے کہا آپ کا وہ کیس ہم نے ختم کر دیا ہے۔ بہر حال! اس طرح کی چیزیں ہم نے تو دیکھیں۔ الحمد للہ! اگر آج ہم اس دور کے ساتھ موازنہ کرنا چاہیں تو بہت زیادہ فرق ہے۔ آج ترکی میں تقریباً ہر یونیورسٹی میں پردے پر بھی پابندی نہیں ہے اور داڑھی والے کو بھی نہیں چھیڑا جا رہا ہے۔ نماز کے لیے ہر یونیورسٹی میں مخصوص جگہ موجود ہے۔ اور اکثر یونیورسٹیز میں جمعے کی با جماعت نماز کا اہتمام موجود ہے۔ یہ بہت بڑا فرق ہے کہ اس وقت ماحول کیسا تھا؟ اور آج کیسا ہے؟ یہ بہت بڑی مذہبی تبدیلی ترکی میں آئی ہے۔

☆......ایک مرتبہ آپ ٹائی کا قصہ سنا رہے تھے؟

◀......ہاں! ہمارے شعبے میں سرجری کی ایک برانچ تھی۔ اس کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر صاحب تھے۔ وہ اپنی کلاس میں ٹائی کے بغیر کسی کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کو میری داڑھی پہ کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن ان کا کہنا تھا: ٹائی ضرور پہنو۔ انہیں میری شلوار قمیض وغیرہ سے بھی کوئی گلہ نہیں تھا، لیکن ٹائی کے نہ پہننے پر ناراض ہوتے تھے۔ میں جب پہلی بار ان کی کلاس میں گیا تو ان کا لمبے سے قد کا ایک اسسٹنٹ باہر کھڑا تھا۔ وہ حاضری کے ساتھ ساتھ ہر کسی کی ٹائی بھی چیک کر رہا تھا۔ تو اس نے کافی جھک کر میری داڑھی کے نیچے ٹائی چیک کرنے کی کوشش کی اور پھر پروفیسر صاحب کے قریب جا کر کہا کہ اس لڑکے کی ٹائی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے کچھ کہنے کی بجائے اونچی آواز میں کہا کہ جس کی ٹائی نہیں ہے وہ کلاس سے نکل جائے۔ میں ان کی بات کو ایسے ہی سمجھا کہ جیسے انہوں نے کسی دیوار کو کہا ہے۔ مجھے تو کہا ہی نہیں ہے اور میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور کہا کہ ٹائی کے بغیر تم میری کلاس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ میں نے ان سے کہا کہ سر میرے پاس تو ٹائی ہے ہی نہیں۔ تو انہوں نے کہا جو لڑکا چھٹی پر ہے یا اس سے جس کی کلاس نہیں ہے اس سے لو یا پھر کسی دوست سے مانگو اور پہن کر آجاؤ۔ اس پر میں نے انہیں

صاف کہا کہ سر میرے پاس نہ صرف یہ کہ ٹائی ہی نہیں، بلکہ میں ٹائی استعمال ہی نہیں کرتا اور کرنا بھی نہیں چاہتا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ پھر نکل جاؤ یہاں سے۔ جب تک ٹائی نہیں پہنو گے اس وقت تک یہاں نہیں آسکتے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں یہاں آچکا ہوں اور کلاس میں موجود بھی ہوں۔ اگر آپ مجھے نہیں پڑھانا چاہتے تو میری حاضری لگا دیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں میں آپ کی حاضری بھی نہیں لگاتا۔ میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کے پاس چلا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں غیر ملکی ہوں۔ ہمارے لیے قانون مختلف ہے اور غیر ملکیوں کے لیے یہ چیزیں ضروری نہیں ہیں، لیکن پروفیسر صاحب کو اس پر اصرار ہے۔ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو بھی اس بارے میں معلومات تھیں کہ لباس کا یہ اہم جز ضروری نہیں ہے۔ انہوں نے پروفیسر صاحب کو بلا لیا۔ پروفیسر صاحب نے جب دیکھا کہ دروازے پر میں بیٹھا ہوا ہوں تو وہ آگ بگولا ہوگئے۔ میں باہر بیٹھا تھا اور آفس سے اونچا بولنے اور لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کہہ رہے تھے کہ غیر ملکیوں کے لیے قانون تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ اپنا لباس پہن سکتے ہیں۔ ان کے لیے ٹائی وغیرہ ضروری نہیں۔ پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ پاکستانی ہے اور میں جب انگلینڈ میں اسپیشلائزیشن کر رہا تھا تو میرے ساتھ دو پاکستانی اسسٹنٹ تھے، وہ دونوں ہی ٹائی لگایا کرتے تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ پاکستانی بھی ٹائی پہنتے ہیں تو یہ کیوں نہیں لگاتا؟ بہر حال! طویل بحث ومباحثے کے بعد انہوں نے سمجھوتہ کر لیا اور میری حاضری لگا دی اور کہا کہ یہ میری کلاس میں نہ آیا کرے۔ میں اس کی حاضری لگا دیا کروں گا۔ پھر میں نے خود ہی تیاری کی اور طلبہ سے نوٹس وغیرہ لے کر وہ امتحان پاس کیا۔ اس طرح کا بھی ایک ماجرا پیش آیا۔

☆.....آپ اس طرح کی مشکلات پر کیسے قابو پا لیتے تھے؟

◄.....میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس طرح کی مشکلات وغیرہ کا حل اللہ پر اعتماد، ہمت اور

حوصلہ ہے۔ ہم تبلیغی بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ فلاں ملک کی فوج میں داڑھی رکھنا منع تھا۔ فلاں شخص نے تبلیغ میں وقت لگایا اور داڑھی رکھ لی۔ پھر ان پر یہ یہ مشکلات آئیں، پھر بالآخر وہاں کا قانون بدلا اور اب وہاں مسلمانوں کے لیے داڑھی رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مجھے بھی ایسے ہی لگتا ہے کہ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ مجھے بھی کوئی اتنا شعور نہیں تھا، البتہ جو جذبہ تھا اس کے تحت ہی یہ سب کچھ کیا۔ واقعی تبدیلی بھی ہوئی۔ اس وقت اگر کوئی وہاں جائے تو اصل میں وہ قانون موجود ہے جس کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کچھ لوگ ویسے ہی وہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر یا خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو بدل لیتے ہیں۔ اپنی مرضی سے بدلتے ہیں تو ان کی مرضی لیکن اگر خوف سے بدلتے ہیں تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اب اگر آپ جائیں تو داڑھی والے اور پردے والی ٹھیک ٹھاک مقدار نظر آتی ہے۔ پرائیویٹ سیکولر یونیورسٹیوں کے اندر بھی اب اس قسم کی سختی نہیں ہے۔ کیونکہ اب عمومی طور پر فضا ہموار ہو چکی ہے۔ اگر شخصی طور پر کچھ لوگ مخالفت کرتے ہیں تو ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے۔

☆...... یہ ترکوں کی دینی حالت تھی جو رفتہ رفتہ تبدیل ہوئی اور داڑھی، ٹوپی اور پردہ کرنے والی خواتین کے لیے حالات سازگار ہوئے۔ البتہ معاشرتی طور پر طالب علمی کے دور سے ملازمت تک کے عرصے میں آپ نے ترک قوم کو کیسا پایا؟

◄...... دینی اعتبار سے دیکھا جائے تو ترک قوم کو زبردستی بے دین کیا گیا تھا۔ یہ بے دین ہوئے نہیں تھے، لیکن ان کا کچھ فیصد معاشرہ واقعی ایسا ہے جو مغربی ہے۔ یہ تقریباً 20 فیصد ہے اور دین سے بہت دور ہو چکا ہے۔ تقریباً 75 فیصد ترک قوم ایسی ہے جو کہ مسلمان ہے اور دین سے محبت رکھتی ہے، لیکن 70 سے 80 سال کے اندر زبردستی کرنے کی وجہ سے معاشرے میں جو شکل سامنے آئی اس کی وجہ سے مغربی اسٹائل آف لائف ان کا طرزِ زندگی بن گیا ہے۔ ورنہ یہ

اندر سے مغربی نہیں ہیں۔ ان کے معاشرے کی اکثریت مشرقی روایات کی حامی ہی نہیں بلکہ حامل بھی ہے۔ اگر آپ ان کے دیہی علاقوں اور قصبوں میں جائیں اور ان کے گھروں اور خاندانوں کا نظام دیکھیں تو وہ ہمارے معاشرے سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے۔ ان کے ہاں خاندانی نظام ابھی تک بہت مضبوط ہے۔ صرف 25 فیصد لوگ شہری آبادی میں ہیں جو اب زیادہ ماڈرن ہو رہے ہیں، وہ مغربی ذہنیت کا شکار ہوئے ہیں۔ شاید خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں زوال کا سبب بھی یہی لوگ بنے۔ ایسا گروہ ضرور ہے، لیکن عوام کی اکثریت میں دین بھی موجود ہے اور دین کا درد بھی ہے اور اپنی پرانی روایات بھی موجود ہیں۔

☆ ...... ترک معاشرے میں دین کی تجدید واحیا کا محرک کیا تھا؟ علما، تبلیغی جماعت، صوفیاء یا دینی سیاسی جماعتیں؟ یا پھر ترک قوم سے جبر کے خاتمے کے بعد ان کی طبیعت کے اندر موجود اسلام کی محبت کا واپس آجانا...... آخر بنیادی عنصر کیا تھا؟

◄ ...... اصل میں سب کا اس میں حصہ ہے۔ یہ جو سیکولر انقلاب تھا اس میں دینی قوت کو بہت زیادہ توڑا گیا اور انہیں پاش پاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ دینی درس گاہیں تو آئینی طور پر بند کر دی گئیں۔ خانقاہیں بند کر دی گئیں۔ ایسی تمام سرگرمیاں جن سے دینی زندگی یا دینی علم ملتا ہے، ایسے تمام چشمے بند کر دیے گئے۔ کچھ لوگ جو تحریکی صلاحیتوں کے مالک تھے ان میں صوفیاء یعنی روحانی نقشبندی سلسلے کے کچھ بزرگ تھے جنہوں نے گھر میں بیٹھ کر ہی سہی، لیکن انہوں نے اس محنت کو چھوڑا نہیں۔ ترکی میں صوفیاء کی جو محنت ہے وہ نظر آتی ہے۔ تحریکی ذہنیت کے لوگ بھی چھوٹے پیمانے پر اپنی طرف سے سعی و کوشش کرتے رہے اور جوں ہی اس کے لیے کچھ رستہ نکلا تو وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ علمائے کرام نے ایک طویل عرصے تک قانون و آئین میں موجود سختی کی بنا پر اپنی جدو جہد کو خفیہ رکھا۔ جیسے ایک امام حافظ نور الدین صاحب تھے۔ بہت ضعیف العمر تھے۔

وہ ہمیں بتایا کرتے تھے کہ جب میں نے حفظ کیا تو میں اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ ہم نے چھپ کر حفظ کیا۔ وہ اس طرح کے ہمارے گاؤں میں جو قاری صاحب تھے۔ ہم جوان کے پاس 10 سے 15 بچے حفظ کررہے تھے، ان میں سے دو کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ گاؤں سے باہر ٹیلے پر جا کر بیٹھا کرتے تھے اور اگر دور سے کوئی گاڑی یا سرکاری سرگرمی نظر آتی تو وہ بھاگ کر آتے اور اس کی اطلاع دیا کرتے تھے۔ قاری صاحب نے زمین میں گھڑے کھود کر ان میں برتن نصب کیے ہوئے تھے۔ قرآن مجید اور سپارے ان میں چھپا کر، اوپر پتے اور مٹی ڈال کر چھپ جایا کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ایسی مشکلات میں حفظ کیا تھا۔ اب وہ مولوی صاحب جنہوں نے اس حال میں بھی اس محنت کو جاری رکھا اور عوام میں سے بھی جن لوگوں نے اس حالت میں بھی مولوی صاحب کے پاس بچوں کو بھیجا جس میں سارے خطرات موجود تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سب کے سب تحریکی لوگ تھے۔ جن کے اندر ایمان اور دین کی محبت موجود تھی۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں چھوٹے چھوٹے پیمانے پر دین کی حفاظت کرتے رہے۔ یعنی دینی نظریات کو تو بالکل ختم نہیں کر سکے تھے۔ 1945ء تک تو ایک ہی پارٹی تھی۔ اسی کا الیکشن ہوتا تھا۔ دوسری کوئی پارٹی ہی نہیں تھی۔ یہ تو 1946ء کے بعد دوسری پارٹی بنانے کا رواج سامنے آیا۔ دنیا کے سامنے جو انہوں نے ڈھونگ رچا رکھا تھا اب وہ بھی قابلِ قبول نہیں رہا۔ جب دوسری پارٹی پیدا ہوئی۔ مسابقے کی سی صورت بنی تو دوسری پارٹی نے دینی رجحانات کے لوگوں کے لیے راہیں بھی کشادہ کرنی شروع کیں۔ لوگوں کا اس قدر رجحان بڑھا کہ اتاترک کی پارٹی کا ایک دم زور ٹوٹا اور برے طریقے سے ناکام ہوئی۔ انہیں سمجھ آ گیا کہ ہم نے جو اذانیں بند کر رکھی ہیں اور لوگوں پر جو جبری دباؤ ہے اس کی وجہ سے دوسری پارٹی نے آتے ہی انہیں اپاہج کر کے سویپ کر دیا۔ اور 70 سے 80 فیصد سیٹیں انہیں ملیں۔ اس طرح پھر 1950ء میں دوبارہ اذان مسجد

میں واپس آئی۔ اس کے بعد لوگوں کے لیے مساجد کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ اس طرح ان کے اندر تھوڑی سی جرأت آئی کہ اب دین کا کام کیا جا سکتا ہے۔ 1960ء کی دہائی کے اندر اس کی تھوڑی تھوڑی شکل سامنے آئی۔ لیکن جس وزیر اعظم عدنان میندرس نے اذان کا رستہ کھولا تھا اسے پھانسی دے دی گئی۔ فوج میں ایسے طاقت ور لوگ تھے جنہوں نے ان چیزوں کو بہانہ بنا کر اسے اور اس کے اہم وزیروں اور مشیروں کو پھانسی دے دی۔ اس کے بعد ایک بار پھر دین دار لوگوں کے لیے خطرہ کھڑا ہو گیا تو 1967ء میں طیب اردگان کا استاد نجم الدین اربکان میدان میں آیا۔ اس کے آنے کے بعد سیاسی سطح پر ایک بار پھر چھوٹی سی تحریک اٹھی جو کہ بالواسطہ دینی تحریک تو نہیں تھی اور نہ وہ ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ اس نے ''ملی نظام'' کے نام سے ایک پارٹی شروع کی۔ اس کے بعد جو دینی رجحانات کے لوگ اس سے پہلے منتشر تھے تو انہیں اکٹھے اور مل بیٹھ کر کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی طرح صوفیاء کے ارد گرد جو لوگ تھے انہیں بھی جمع ہونے کا موقع ملا۔ علماء بھی کھل کر میدان میں آنا شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کی تبلیغی جماعتوں کے سفر کی یہ حالت تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں سے نمازیں پڑھ کر ذکر اذکار کرتے ہوئے گزر جانا ہی اس وقت بہت بڑا کام ہے۔ مولانا انعام الحسن صاحب اور بڑے بزرگوں کے بھی سفر موجود ہیں۔ انہوں نے کرائے پر مکان لے کر وہاں قیام بھی کیا اور محنت بھی کی۔ برصغیر کی طرف سے صرف تبلیغی جماعت کی محنت ہے اور کچھ علماء کی کتب ہیں جن کا ترجمہ کیا گیا ہے، جیسے ''حیات الصحابہ'' یہ بہت زمانے سے وہاں موجود ہے۔ اسی طرح سید قطب اور حسن البناء، مولانا مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں کے ترجمے موجود ہیں۔ دیندار لوگوں کے گھروں میں یہ کتابیں نظر آتی تھیں۔ 1970ء کی دہائی میں یہ چیزیں تھوڑی سمجھ آنا شروع ہوئیں۔ پھر 1975ء کے بعد پہلے کی بنسبت قدرے اچھی شکل بنی۔

☆.....نجم الدین اربکان صاحب کے بارے میں ایک بار آپ فرما رہے تھے کہ وہ ایک واقعے کی بنا پر سیاست میں آئے۔ انہوں نے مرحلہ بہ مرحلہ دیکھا کہ ایک منزل طے ہونے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اصل رکاوٹ یا اصل میں اس چیز کی اجازت دینے والی طاقت یہ نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی آگے کی رکاوٹ یا طاقت ہے۔ پھر وہ اس سے بھی آگے گئے، تو پھر پتا چلا کہ اس سے بھی آگے کوئی ہے۔ شروع میں وہ ایک اچھے اور کامیاب انجینئر تھے۔ ایک حادثہ انہیں اس طرف لے آیا۔ وہ کیا داستان ہے؟

◄.....نجم الدین اربکان استنبول ٹیکنیکل یونیورسٹی کے قابل اور ذہین انجینئر تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہ وہیں پڑھاتے بھی رہے۔ اس کے بعد وہ پی ایچ ڈی کی تعلیم کے لیے جرمنی گئے تھے۔ یہ اصل میں موٹرز وغیرہ کے انجینئر تھے۔ جرمن کا جو مشہور ٹینک ہے اس کی موٹر پر بھی انہوں نے ہی کام کیا ہے۔ ہٹلر کے زمانے میں جب جرمن ٹینک روس وغیرہ کی طرف ٹھنڈے علاقوں میں گئے تو ان کا پٹرول جم جاتا تھا۔ اس پر نجم الدین اربکان نے یہ کام کیا کہ انتہائی سرد اور گرم ترین علاقوں میں یہ موٹر کس طرح کام کرسکتی ہے؟

ان کا اصل واقعہ یہ ہے کہ جب یہ جرمنی میں تھے، ایک دن ان کا اپنے سینئرز حضرات کے ساتھ کسی پلانٹ کا دورہ تھا۔ وہ دورہ ٹیکنیکل امور کے متعلق ہی تھا جو کہ شاید ان کی ٹریننگ کا حصہ تھا۔ ایک فیکٹری سے نکلتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی مشینوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس پر نجم الدین اربکان نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ یہ چھوٹی چھوٹی موٹریں ہیں۔ ترکی کے لیے بنائی گئی ہیں۔ ان کی ڈیمانڈ ترکی سے آئی ہے۔ نجم الدین کہتے ہیں کہ یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ یہ موٹریں کیا ہم نہیں بنا سکتے؟ ان کے ملک کے ٹینک کی موٹریں بنا رہا ہوں اور اتنی چھوٹی سی موٹریں جو پانی کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، وہ ہم جرمنی سے خرید رہے ہیں۔ ہمارا قومی سرمایہ کہاں خرچ ہو رہا ہے؟ انہوں نے اس بات پر بہت غور کیا اور جب وہ ترکی واپس آئے

تو ترک حکومت کے اعلیٰ حکام سے اس کا ذکر کیا۔ تب انہوں متعلقہ اداروں میں اس حوالے سے بڑی بے حسی اور سرد مہری کا مظاہرہ دیکھا۔ پھر وہ اوپر تک گئے اور انہوں نے متعلقہ وزارت تک جا کر بات کی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس موضوع پر پریزنٹیشنز دیں اور کانفرنسیں بھی منعقد کیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ کتنی آسان ہے؟ اور ہم کیسے بہت کم سرمائے سے اپنے ملک کی یہ ضرورت پوری کر سکتے ہیں؟ انہوں دیکھا کہ میں جہاں جہاں بھی جاتا ہوں، وہاں لوگ اسے سراہتی نظروں سے دیکھتے ہیں، لیکن کسی بھی طرح کام آگے نہیں بڑھ رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارا ملک خود کفیل ہو، ہم یہ موٹریں خود تیار کریں، لیکن انہوں نے بھانپ لیا کہ حکومت کے متعلقہ ادارے اس بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ حکومتی اداروں پر تکیہ کرنے کے بجائے ہم پرائیویٹ فیکٹری بنائیں اور اس میں خود یہ چیزیں بنائیں۔ اب اس کے لیے سرمایہ درکار تھا تو نجم الدین اربکان نے اپنے اردگرد جو دینی اور اسلامی حلقہ تھا اس میں یہ آواز بلند کی تو تقریباً دو سو کے قریب یا اس سے کچھ زائد لوگوں کے سرمائے سے ایک فیکٹری بنائی۔ "گُمش موٹرز" کے نام سے۔ "گُمش" چاندی کو کہتے ہیں۔ گویا کہ اس کا نام چاندی کی موٹر رکھا۔ انہوں نے جب موٹر کی یہ فیکٹری بنائی تو ان کے ساتھ بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ جرمنی، فرانس یا دیگر کسی ملک سے جو موٹر 10 ہزار کی آ کر فروخت ہو رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ یہ موٹر چار یا پانچ ہزار میں خود بنا رہے ہیں۔ لیکن اچانک یہ ہوا کہ جو موٹر باہر سے آ کر 10 ہزار میں فروخت ہو رہی تھی۔ ایک دم اس کی قیمت ساڑھے تین ہزار ہو گئی۔ یعنی جتنے میں یہ خود بنا نہیں سکتے اتنے میں وہ فروخت ہونے لگ گئی۔ لہٰذا سازشی عناصر نے انہیں اس کار آمد منصوبے میں ناکام کر دیا۔ اس پر انہوں نے حکومت سے رابطہ کیا۔ غالباً اس وقت عدنان میندرس کی حکومت تھی۔ ایک یادداشت کے مطابق اتنا ملتا ہے کہ عدنان میندرس نے ان کا بہت ساتھ دیا اور خاموشی سے ان کے اس پروجیکٹ کو کامیاب کرنے کے لیے ایک خطیر رقم بھی انہیں سبسڈی کے

طور پر ادا کر دی، لیکن مارکیٹ کے اندر اس کا مستقل مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ جسے باہر کی کمپنیوں نے ریٹ آگے پیچھے کر کے ناکام بنا دیا۔ انہوں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کون سی طاقت ہے جو ملک کے اندر سے بیرونی اداروں کا ساتھ دے رہی ہے؟ انہیں محسوس ہوا کہ چیمبر ڈیکس کے اندر جو ان معاملات کو ڈیل کرنے والا ہے وہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ اور وہاں سے ان کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا جا رہا تھا۔ اربکان چاہتے تھے کہ باہر کی موٹر پر ٹیکس لگوایا جائے تا کہ باہر والا مال اتنی آسانی سے کم قیمت پر نہ فروخت ہو۔ جب اربکان کسی صورت میں کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ چیمبر کے اندر خود آیا جائے۔ اور چیمبر کے اس ڈیکس کو خود سنبھالا جائے تا کہ یہ کام چل سکے۔ اس پیشرفت کے لیے چیمبر کا اگلا الیکشن انہوں نے خود لڑا۔ اور چیمبر کی وہ سیٹ انہوں نے حاصل کر لی، لیکن جب وہاں بیٹھ کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ اس سیٹ سے مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا۔ یہ تو اس سے بھی اوپر کا مسئلہ ہے۔ پھر انہوں نے استنبول چیمبر کا الیکشن لڑا۔ جب اسے بھی جیتا تو انہیں پتا چلا کہ اصل مسئلہ تو انقرہ میں پھنسا ہوا ہے۔ پھر انہوں نے انقرہ چیمبر کا الیکشن لڑا اور اس میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اب ان کا خیال تھا کہ یہ مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔ یہاں پہنچ کر انہیں پتا چلا کہ اس سے آگے اور بھی رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ کوئی ایسا ہاتھ موجود ہے جو ہر جگہ پر یہ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان پر کچھ تحفظات لگا کر ان کی گرفتاری یا نظر بندی وغیرہ کی سی صورت حال پیدا کر دی گئی۔ ان کا راستہ روکنے کی تمام تر تیاری ہو گئی۔ انہیں اس سے سمجھ آیا کہ یہاں تو مسئلہ کچھ اور رہی ہے۔

اس زمانے کا وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل ان کا کلاس فیلو تھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ جا کر مذاکرات کیے۔ انہوں دیکھا کہ وزیر اعظم ان سے خاطر خواہ بات کرتا ہے لیکن اس کے برعکس حکومتی مشینری جب حرکت میں آتی ہے تو کچھ اور ہوتا ہے۔ انہیں یہ بات سمجھ آ گئی کہ یہ مسئلہ اس کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ ہوم منسٹر اور وزیر اعظم بھی کچھ کرنا چاہے تو

نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے گہرائی سے ان معاملات کو پرکھنا شروع کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ حکومت باہر سے کنٹرول ہو رہی ہے۔ اور جب تک حکومت صحیح لوگوں کے ہاتھوں میں نہ آئے اس وقت تک ہمارے ملک کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا انہوں نے اس پر 1967ء میں ''پاک عرب پارٹی'' بنائی اور اس میں اپنے اردگرد کے لوگوں کو جو اس وقت تک کافی مایوس ہو چکے تھے، انہیں سمجھایا کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ نجم الدین اربکان بڑے قابل اور ذہین آدمی تھے۔ ان کا سالہا سال کا مطالعہ تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید گہرائی آتی گئی۔ چونکہ وہ نہایت ذہین، قابل اور ایماندار آدمی تھے۔ مشائخ سے بھی ان تعلق تھا اس لیے وہ سیاست کے دلدل میں اتر کر بھی کامیاب رہے۔ آگے بڑھتے بڑھتے 1970ء میں نائب وزیراعظم کے طور پر سامنے آئے۔ سائپرس کا جو مسئلہ ہے اس میں اگر وہ اس وقت نائب وزیراعظم نہ ہوتے تو آج جو شمالی سائپرس جو ترکوں کے ہاتھ میں ہے، شاید نہ ہوتا۔ ہمارے وہ دوست یا بزرگ جو اس وقت ان کے آخر دور میں انہیں ملتے رہے اور ان کی کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے، وہ بتاتے ہیں کہ وہ اس چیز کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے کہ ہمارے اسلامی ممالک اوپر سے صیہونی طاقتوں کے قبضے میں ہیں۔ اور یہ صیہونی طاقتیں ہمارے ہاں اس قدر اثر انداز اور طاقت ور ہیں کہ ہمارے وزراء اور وزراء اعظم وغیرہ بھی کچھ نہیں کر پاتے۔ ایسی صورت حال میں ترکی کے مسائل تب ہی حل ہو سکتے ہیں جب ایسے مضبوط قائدین ہوں جو اپنے مسائل خود حل کر سکیں۔ ان کے سیاست میں آنے کا سبب یہ تھا۔ ورنہ نجم الدین اربکان ایک بہت بڑے انجینئر، سائنٹسٹ اور بڑے صوفی تھے۔ یعنی ان کا نقشبندی سلسلے سے بھی تعلق تھا۔ وہ اس طرح کی سیاست میں مجبوراً ہی آئے تھے اور سیاست میں آنے کی بھی یہ وجوہات تھیں۔

س: ـــــ کہا جاتا ہے کہ بعد کے اسلام پسند سیاست دان سب ان کے شاگرد یا تربیت یافتہ تھے؟

وہ 30 سے 40 سال سیاست میں رہے، لیکن ان کا مطمح نظر صرف کرسی کا حصول نہیں تھا، بلکہ وہ ساتھ ساتھ ایک نظریاتی نسل بھی تیار کرتے رہے۔ جنہیں وہ دنیا کی سیاست کے مسائل سمجھاتے رہے اور بتاتے رہے کہ وہ کون کون سی قوتیں ہیں جو حکومتی سطح پر عمل پیرا ہیں؟ اور وہ اس نظام میں کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ وہ مستقل سیکھتے اور سکھاتے رہے۔ کئی ہزار کا گروہ ان کی تربیت سے گزرا۔ آج کل جو طیب اردگان اور دیگر حضرات وغیرہ ہیں یہ انہی کی تربیت سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ انہوں نے زمانے کے حالات کے مطابق اردگان کے طریق کار میں تبدیلیاں لاکر کامیابی حاصل کی ہے۔ اسی لیے اب وہ پوری دنیا کے سامنے بہت سے مسائل میں ڈٹ جاتے ہیں۔ ان کے اندر یہ جرأت بھی اسی لیے ہے کہ یہ اس ذہین اور نڈر استاد کے تیار کردہ ہیں۔ ان کی معلومات اور سوچ کی پرواز بہت دور تک ہے۔ گہرائی بھی ہے اور معاملہ فہم بھی ہیں۔ معاملہ شروع کیسے اور کہاں سے کرنا ہے اور اس کے پیچھے کیا کیا محرک ہیں؟ ان حضرات کو بہت جلدی سمجھ آجاتی ہے۔ کیونکہ ایک ماہر اور جہان دیدہ استاد کی 30 سے 40 سالہ محنت ان پر لگی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ خوب معاملہ فہم لوگ ہیں اور ان کے پاس "ایک امت" کا عظیم نظریہ بھی انہی سے آیا ہوا ہے۔ اور آج طیب اردگان اپنے اردگرد کے لوگوں کو یہ نظریہ دے رہا ہے کہ ترکی یا کوئی بھی ملک آج سے دس گناہ زیادہ حالت میں بھی مضبوط ہوجائے تو اپنی زنجیریں خود نہیں توڑ سکتا جب تک کہ اسے گلوبل امت کے نظریے سے نہ دیکھا جائے۔ اس امت کے نظریے کے ساتھ جب تک پانچ دس اسلامی ممالک اکٹھے نہ ہوجائیں۔ یعنی کہ کسی ایک اسلامی ملک کا موجودہ حالت سے دس گنا مضبوط ہونے کی بجائے ان چیزوں سے باہر نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ دس اسلامی ممالک کا اپنی حالیہ حالت سے صرف ایک ایک گنا آگے بڑھنا زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے طیب اردگان اپنے قریبی لوگوں کو اس فلسفے اور نظریے پر لا رہا ہے اور اسی نظریے کے تحت وہ ساری اسلامی دنیا کے

ملکوں میں کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے پاکستان کے اندر کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ وہ ''ترکش امپیریلیزم'' کی کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ قطعاً ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اصل میں موجودہ امپیریلیزم کے خلاف ہے۔ یہ جو موجودہ امپیریلیزم ہے اس کی زنجیروں سے نکلنے کے لیے ایک امت کے طور پر کھڑا ہونا ضروری سمجھتا ہے۔

☆......مشائخ نقشبند کا ترکی معاشرے میں دین کو دوبارہ زندہ کرنے اور عوام کو دین کی طرف لانے میں کیا کردار ہے؟ ان کی محنت کس انداز میں چلتی رہی اور اس کے کیا ثمرات نکلے؟

◄......ترکی میں سلسلے تو دوسرے بھی ہیں، جیسے قادری ہیں، لیکن اصل میں نقشبندی سلسلے کا بہت بڑا اور اہم کردار رہا ہے۔ کیونکہ نقشبندی سلسلے نے اس مجبوری کی حالت میں بھی چھوٹے چھوٹے گھروں میں اس سلسلے کو جاری رکھا۔ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں ہی سہی لیکن جاری ضرور رکھا۔ اور ان میں ایسے حلقے بھی تھے جنہوں نے تصوف کے ساتھ ساتھ علمی کام کو بھی ضروری سمجھا اور اس موضوع پر بھی محنت کرتے رہے۔ کیونکہ علمی درسگاہیں ختم کر دی گئی تھیں تو تعلیم کے کام کو بھی کسی درجے میں انہوں نے ہی زندہ رکھا۔ یعنی حالات نے انہیں جتنی اجازت دی اتنی وہ محنت ضرور کرتے رہے۔ یعنی وہ گدیاں تو نہ رہیں، لیکن کسی نہ کسی شکل میں درون خانہ خفیہ طور پر ضرور چلتی رہیں۔ اپنی اپنی سطح پر وہ کام کرتے رہے۔ اور جیسے جیسے حالات سازگار ہوتے گئے اتنا ہی وہ اپنے کام کو بڑھاتے رہے۔ 1980ء کے مارشل لا میں جب ہم ترکی گئے تو کچھ عرصے کے بعد ہمیں فلاسفی سمجھ آنے لگی۔ ہمیں پتا چلا کہ کچھ نقشبندی مشائخ پر اس مارشل لا کے دوران بھی کیس چل رہے تھے۔ اس وقت ان کے متعلق بھی عدالت سے پھانسی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ ان کے کاموں سے ناراض تھی۔ ان صوفیاء نے عوام کے فرائض، سنن اور دین داری کو زندہ رکھنے کی کاوش کو جاری رکھا۔

اسی محنت کے نتیجے میں پھر چھوٹے چھوٹے مدارس شروع کیے۔ اب تو سینکڑوں کی تعداد میں مدارس موجود ہیں۔ اسی طرح نقشبندی سلسلے کی جو خانقاہیں ہیں وہ سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اگرچہ وہ آئینی طور پر اب بھی اسے خانقاہ نہیں کہہ سکتے، بلکہ اسے بیٹھک یا کوئی بھی بیٹھنے کی جگہ کہہ لیں، لیکن جاری وساری ہیں۔ اور اپنا کام کر رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں اور ان سے یہ سنا گیا ہے کہ اس زمانے میں عثمانی مجاہدین تو ختم ہو گئے یعنی دین کا دفاع کرنے والی طاقت تو نہ رہی، لیکن دیا جلائے رکھنے والے صوفیاء کرام کے کام جاری رہے۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کسی ایک طبقے کا کام نہ رہے تو دوسرا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور مغرب میں ڈوبا سورج مشرق سے پھر نکل آتا ہے۔

طلبہ امن کے سفیر ہوتے ہیں.....!

یو ڈیف (U D E F) کے صدر و چیئر مین محمد علی بولاط کی
مفتی ابولبابہ شاہ منصور سے رسمی و غیر رسمی گفتگو

''پاکستان کے مدارس نے مجھے خلافت کے زمانے میں پہنچا دیا اور اب میں تاریخ میں بکھرے ان نقوش کو حقیقت کے روپ میں سمجھ چکا ہوں۔''

ہمارے آج کے مہمان جن کا پورا تعارف ہمیں حاصل نہیں ہے، ترکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں کی معزز، علمی اور انتظامی شخصیت ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارے پرانے کرم فرما ڈاکٹر خاور ندیم صاحب بھی تشریف فرما ہیں جو اکثر اس طرح کے مہمانوں سے ملاقات کا ہمارے لیے ذریعہ بنتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم آج کے مہمان کا تعارف کروائیں گے۔ پھر اس کے بعد ان کے یہاں آنے کے مقصد

پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ ہوگا۔ سب سے پہلے ان کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

ان کا نام محمد علی بولاط ہے۔ یہ ترکی کے ایک شہر کاسنی کے رہنے والے ہیں۔ استنبول یونیورسٹی میں طالب علم رہے۔ تاریخ کے موضوع پر گریجویشن کی اور اسی شعبے میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی کے اندر جو غیر ملکی طلبہ ہیں جنہیں یہ ''مہمان طلبہ'' کہتے ہیں۔ ان مہمان طلبہ کے لیے 12 سال پہلے ایک ادارہ بنایا گیا تھا، اس کے یہ صدر ہیں۔ اس وقت جو ادارہ ہے وہ ایک فیڈ ریشن ہے جسے ترکش میں ''یو دیف'' کہتے ہیں، یعنی ''انٹر نیشنل اسٹوڈنٹ فار آرگنائزیشن'' اس فیڈ ریشن کے تحت مختلف شہروں میں 52 ایسوسی ایشنز موجود ہیں جو طلبہ کے لیے بنائی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ ترکی کے مختلف شہروں میں کافی تعداد میں ہاسٹلز اور اسٹوڈنٹ ہاؤسز اس ادارے کے ماتحت ہیں۔ ترکی میں اس وقت 186 ممالک سے غیر ملکی طلبہ تعلیم کے لیے آتے ہیں جن کی کل تعداد ایک لاکھ دس ہزار ہے۔ جبکہ اس فیڈ ریشن کے تحت جو ایسوسی ایشنز ہیں ان میں تقریباً 20 ہزار طلبہ ہیں۔ ترکی کے اندر کسی بھی شکل میں جو غیر ملکی طلبہ ذاتی طور پر یا کسی گورنمنٹ کی اسکالرشپ کے طور پر آرہے ہیں، ہر پانچ میں سے ایک کے ساتھ ہمارا ادارہ رابطے میں ہے۔ ان میں سے تقریباً ہم دو ہزار طلبہ کو اسکالرشپ دے رہے ہیں۔ ترکی میں جو طلبہ آتے ہیں ان میں صرف مسلمان ہی نہیں، ان میں غیر مسلم کرسچن وغیرہ اور حتیٰ کہ بدھسٹ وغیرہ بھی موجود ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔

غیر ملکیوں کے ساتھ ترکی کے اچھے سلوک اور رویے سے متاثر ہو کر ابھی تک 34 غیر مسلم مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے لوکل طلبہ کے ساتھ تعاون نہیں کرتے، بلکہ ان

طلبہ کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو دوسرے ممالک سے صرف تعلیم کے حصول کے لیے تشریف لائے ہوں۔ یہ ادارہ صرف غیر ملکی طلبہ کے لیے ہی اپنی خدمات سرانجام دیتا ہے۔ ترکی میں تعلیم کے حصول کے لیے آنے والا طالب علم کسی بھی ملک، کسی بھی مذہب اور کسی بھی رنگ سے تعلق رکھتا ہو، ہم اسے ایک مہمان طالب علم کے طور پر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے دین اور ہماری مذہبی روایات نے بھی اور ہمارے کلچر نے بھی ہمیں یہی سکھایا ہے کہ آپ کا مہمان جو بھی ہے آپ اس کی میزبانی کا حق ادا کریں کہ وہ ایک مہمان ہے۔ اسی طرح مسلمان طلبہ ہیں ہم مہاجر اور انصار والے جذبے سے بھی ان کی خدمت اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا جن سے رابطہ ہو جاتا ہے، جب وہ ایئر پورٹ پر اترتا ہے تو ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہم انہیں وہاں سے ہی وصول کرلیں۔ اس نے کہاں رہنا ہے؟ اس کی سہولیات اور ضروریات کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم اس کی فکر کرتے ہیں۔ اگر اسے زبان فہمی کے مسائل ہیں تو ہم فکر کرتے ہیں کہ کس طرح سے انہیں ترکی سکھا سکتے ہیں؟ ان طلبہ کی کاغذی اور قانونی کارروائی، مثلاً: پولیس سے رجسٹریشن وغیرہ کے لیے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اگر کسی جگہ ان کی کفالت کا مسئلہ ہو تو ہم ان کے کفیل بن جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے یہ طالب علم ہمارے متعلقہ ہے۔

کچھ شعبے ایسے ہوتے ہیں جس میں انہیں ہاؤس جاب کرنی پڑتی ہے، جیسے انجینئرنگ وغیرہ تو ایسے مواقع پر جب وہ ہم سے رجوع کرتے ہیں تو ہم ان کے لیے ایسی جگہیں تلاش کرتے ہیں اور ان کے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب وہ اپنا تین یا چار سال کا دورانیہ ختم کرنے کے بعد ہم سے رخصت ہوتے ہیں تو پھر ہم انہیں ایئر پورٹ تک باعزت طریقے سے رخصت کرنے کے لیے بھی جاتے ہیں۔

عموی طور پر ترکی میں آنے والے طالب علم پانچ سال رہتے ہیں۔ اس دوران اگر یہ طالب کبھی بیمار ہوتا ہے یا اس کے لیے کوئی قانونی مسائل آڑے آتے ہیں یا اس کا سامان چوری ہو جائے یا اسے وکیل کی ضرورت ہے تو ہم اپنی بساط کے مطابق اس کے ساتھ جو تعاون کر سکتے ہیں وہ ضرور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ایسے بھی طلبہ ہوتے ہیں جنہوں نے وہاں شادی کرنی ہے تو اس طالب علم کے والدین اور رشتہ دار تو وہاں نہیں ہوتے تو شادی کی ضروریات کا انتظام کرنا، حتیٰ کہ بعض اوقات منگنی یا لڑکی کا رشتہ مانگنے کے سلسلے میں لڑکی کے والدین کے پاس تک بھی جاتے ہیں۔

کچھ طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ہاں بچوں کی ولادت ہوتی ہے تو وہاں کی روایات کے تحت اس کی رسومات میں جانا اور اسے تحفے تحائف دینا وغیرہ یہ سب ماحول ہم اسے فراہم کرتے ہیں تاکہ اسے پردیسی ہونے کا احساس نہ ہو۔ چونکہ وہاں ہزاروں طلبہ موجود ہیں تو اگر کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا اور وہ اس میں زخمی یا فوت ہو گیا تو ایسے مسائل کو بھی ہم بخوبی سرانجام دیتے ہیں، اور تدفین کے مراحل تک ساتھ نبھاتے ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکی میں رہنے کے دوران اس کی زندگی کے متعلقہ تمام احوال میں ہم ان کا جو ساتھ دے سکتے ہیں اور ہم ان کے ساتھ جو تعاون کر سکتے ہیں، اس کا بھرپور انتظام کرتے ہیں۔ ہم اپنی یہ خدمات اسلام کی دی ہوئی تعلیمات اور ایمان کا حصہ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہم اسلامی بھائی چارگی اور ایک امت کے فلسفے کے لیے محنت کرنے والے لوگ ہیں۔ جیسے یہ ضروری ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں وہاں پہنچا جائے اور ان سے بھائی چارگی کی جائے۔ ویسے ہی ضروری ہے کہ جو ہمارے ہاں تشریف لا چکے ہیں ان سے ملاقات کر کے بھائی چارگی کی سعادت

حاصل کی جائے۔ جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم غزہ کا محاصرہ ابھی تک ختم نہیں کروا سکے اور شام کی خانہ جنگی کو بند نہیں کروا پا رہے، وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم غزہ سے آنے والے طلبہ کا ہاتھ تو تھام سکتے ہیں۔ شام سے جو پناہ گزین ترکی کی سرزمین پر آچکے ہیں ان کے بچوں کو تو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر سکتے ہیں۔ اس کا اختیار اور طاقت تو ہمارے اندر موجود ہے اور ہم اسے بروئے کار لا سکتے ہیں تو کم از کم اسے تو عملی جامہ پہنائیں، اس لیے ہمارا یہ موٹو اور نعرہ ہے کہ جو بھی ہمارے ملک میں آئے وہ ہمارا مہمان ہے اور جو مسلمان آئے تو وہ ہمارا بھائی ہے۔ اسی نظریے کے تحت ہم بارہ سال سے اسے اپنے دین اور ایمان کا حصہ سمجھ کر مہمان طلبہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جو طلبہ یہاں سے پڑھ کر جا چکے ہیں ہم ان کے ملکوں میں جا کر ان سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔

☆ ..... آپ کے پاکستان آنے کے مقاصد کیا تھے؟

◄ ..... میرا پاکستان کی سرزمین پر موجود ہونے کے مقاصد میں سے ایک اہم اور بڑا مقصد یہی ہے کہ ترکی سے تعلیم پانے والے طلبہ سے ملاقات کی جائے۔ پاکستان میں آنے کی دوسری غرض یہ بھی ہے کہ دنیا کے اسلامی ملکوں میں پاکستان ایک اہم ملک ہے۔ یقیناً پاکستان کے اندر دنیا کے کئی ممالک سے طلبہ آکر پڑھ رہے ہیں جو پاکستانی نہیں ہیں۔ اگر ہمارے طرز پر، ہماری سوچ اور طریقہ کار کے مطابق اگر پاکستان میں دوسرے ملکوں سے آنے والے طلبہ کا اگر کام ہو رہا ہے تو ہم ان سے بھی ملاقات کریں اور ان سے بھی مزید سیکھیں۔ ہم اپنے تجربات انہیں بتائیں اور ان کے تجربات سے بھی خود سیکھیں۔ پاکستان میں جو غیر ملکی طلبہ موجود ہیں انہیں سنبھالنا اور ان سے ہمیں کیا

فوائد حاصل ہوں گے؟ یہ کتنا ضروری ہے؟ اسے آپس میں بیٹھ کر مذاکرہ کرنا بھی ہمارے مقاصد میں شامل ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اپنے ملک سے دیگر ممالک میں جا کر تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد پانچ ملین ہے۔ اور ان میں سے تقریباً تین ملین طلبہ مسلمان ہیں۔ اگر محنت کی جائے تو مستقبل میں امت کو آپس میں ملانے والے اور اکٹھا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے وہ یہی تین ملین طلبہ ہوسکتے ہیں۔ پاکستان کیا ہے؟ کیسا ہے؟ ہم نے ترکی میں بیٹھ کر پاکستان کو کیسا سمجھا ہے اور کیسا پایا ہے؟ یہ ہم نے ترکی کے ان طلبہ سے سمجھا ہے کہ جو پاکستان سے پڑھ کر گئے تھے۔ تب ہمیں علم ہوا کہ پاکستان کتنا اہم ملک ہے؟ اس سے ہمیں سمجھ آئی کہ ان طلبہ کے ذریعے دوسرے ملکوں کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسے مسافر طلبہ ملکوں کے درمیان ایک پل کا کام کرسکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ اگر ہم ایک امت ہیں اور یقیناً ہم ایک امت ہیں تو جس طرح ہم دور دور ہیں تو ہمارے لیے اس طرح پل اور راستے ضرور ہونے چاہییں۔ اور یہ پل کون ہیں؟ یہ پل یہ ''انٹرنیشنل طلبہ'' ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ کام کتنا اہم اور عظیم ہے۔ اس لیے ہمارے ایک گروپ نے باقی سارے کام چھوڑ کر اس طرف اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کی ہوئی ہیں۔ اور ''اُدیف'' جو ادارہ ہے اس کی یہی غرض اور مقصد ہے۔

☆ ابھی تک ہم یہ سمجھے تھے کہ ترکی کے اندر جو مہمان طلبہ آئے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی ملک سے آئے ہوں، یہ ان کی خدمت کے طور پر اور ان کے اندر ایک احساسِ اجتماعیت پیدا کرنے لیے تھا۔ ابھی آپ جو پاکستان آئے ہیں تو اس سے لگ رہا ہے کہ ترکی سے باہر بھی دنیا بھر میں ہے؟

◄ —— یہ بالکل ایک پرائیویٹ سرگرمی ہے۔ اس کا وجود کسی حکومتی ادارے سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ طیب اردگان کا جو ''ملی گوروش'' فلسفہ تھا، اس کے تحت وجود میں آئی ہوئی ایک سوچ کا نتیجہ ہے اور ''آئی ایچ ایچ'' جو کہ ہمارا ایک ریلیف کا ادارہ ہے۔ یہ سب اس کی محنت اور اس کے فنڈ سے مستحکم کیا گیا ہے۔ اسی لیے اب تک ''ملی گوروش'' فلسفے والے جو لوگ ہیں ان کے انفرادی اور ''آئی ۔ ایچ ۔ ایچ'' جیسے ادارے کی فنڈنگ سے ہم اسے چلا رہے ہیں۔ جب سے ہم نے یہ کام شروع کیا ہے اس وقت سے ہی طیب اردگان کی پارٹی برسرِ اقتدار ہے اور حکومت کا ہمارے ساتھ یہ تعاون ہے کہ کسی بھی جگہ انہوں نے ہمارے لیے رکاوٹ کھڑی نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس حکومت نے جب دیکھا کہ ہم ایک اچھا کام کر رہے ہیں تو انہوں نے ہمارے لیے تمام راستے کھول دیے۔ چونکہ ہماری موجودہ سیاسی حکومت بھی اسی قسم کے جذبات سے سرشار ہے اور ہمارے نظریات انہی کی طرح ہیں۔ اسی لیے ہمارے لیے چلنا اور اپنے کام کو سرانجام دینا بہت آسان ہے۔ اس کے باوجود ہم جو یہ کام کر رہے ہیں اس کے لیے ہم ''آق پارٹی'' یا کسی بھی سیاسی پارٹی سے اجازت لے کر نہیں کرتے، بلکہ یہ بالکل ایک عوامی سوچ اور ان کے نیک ارادوں کے مرہونِ منت ہے۔ یہ بالکل مکمل طور پر ایک سول موومنٹ ہے۔ ہاں! البتہ موجودہ حکومت کے ساتھ نظریاتی یکسانیت ہونے کی وجہ سے باہم اتفاق سے چلتے ہیں۔ اسی لیے حکومت کے جو بلدیاتی ادارے وقتاً فوقتاً ہمارے پروگراموں میں ہمارے ساتھ بھرپور مدد کرتے ہیں۔ مثلاً: ان کا ہال استعمال کرنا۔ ان کے اداروں کو استعمال کرنا وغیرہ۔

☆ آپ کا یہ ادارہ ''یودیف'' سرکاری ہے یا پرائیویٹ؟ اگر یہ پرائیویٹ ہے تو

اس کی فنڈنگ وغیرہ کا انتظام کیسے ہوتا ہے؟

◄ 2004ء میں یہ ایک سادہ سا ادارہ بنایا گیا تھا، اس کے لیے جب ہم نے کوشش کی کہ اس کام کو کیسے سرانجام دیں تو ہم نے دنیا میں بڑی چھان بین کی کون سا ادارہ ایسا ہے جس سے ہم سمجھ سکیں تو ہمیں کچھ بھی نہیں ملا۔ ہاں! ہمیں اس سے یہی پتا چلا کہ ہر ایک اپنے ملک میں اپنے طلبہ پر ہی محنت کرتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس قبل تمام تنظیمیں اپنے ہی طلبہ پر محنت کرتی تھیں۔ انٹرنیشنل سطح پر طلبہ پر محنت کرنے کے سلسلے میں ہمیں کوئی نمونہ یا آئیڈیل نہیں ملا۔ چار سال تک ہم اس نہج پر محنت کرتے رہے اور خود ہی اپنی محنت سے بہت کچھ سیکھا کہ اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟ 2008ء میں ہم نے اسے بند کر کے ''بابِ عالم'' کے نام سے منظم انداز میں نئے سرے سے ایک ادارے کا قیام عمل میں لائے۔ اس کے بعد ادارے کا نام، منشور اور کاغذی کارروائی کو اس مقصد اور غرض سے ترتیب دیا۔ جب ہر شہر میں اس طرح کے مزید ادارے بڑھے تو ''یودیف'' کے نام سے 2012ء میں ہیڈ آفس بنایا گیا۔ ''بابِ عالم'' جو کہ استنبول میں بنایا تھا تو پھر اسی طرز پر ''قونیہ'' میں بنایا، آسیہ، انقرہ اور اس طرح مختلف شہروں میں بنایا۔ لیکن انہیں بابِ عالم کے طور پر نہیں بنایا، بلکہ ہر ایک کو مستقل ادارے کے طور پر ایک نئے نام سے بنایا۔ البتہ ترکی کے تقریباً تمام شہروں میں ایسے مختلف ادارے بنے۔ اسے ایک فیڈریشن بنایا اور اس کا نام ''اُودیف'' رکھا۔ بابِ عالم اور اس طرح کی دیگر تنظیمیں بھی اپنے اپنے شہروں میں کام کر رہی ہیں۔

ابھی ہم 2016ء میں ہیں اور 2015ء کے وسط سے ہم بین الاقوامی سطح پر اپنے ملک سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا جائزہ لے رہے ہیں کہ دیگر اسلامی ملکوں میں کیا

ہو رہا ہے؟ اور مزید کیا ہو سکتا ہے؟ اور اس میں ہم لوگ ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اس وقت میں پاکستان آیا ہوں۔ اسی طرح میرا ایک دوسرا ساتھی سوڈان میں ہے۔ آئندہ مہینے ہم انڈیا کا سفر کریں گے۔ اسی طرح ہمارے دوسرے ساتھی انڈونیشیا اور ملائیشا گئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح تھائی لینڈ، اردن، کویت، سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک میں بذاتِ خود ہو کر آیا ہوں۔ ہم ان ممالک میں جا کر ایسا ادارہ تلاش کرتے ہیں اور اس سے سیکھتے بھی ہیں اور اپنے تجربات انہیں بھی بتاتے ہیں۔

جہاں ایسے ادارے نہیں ہیں تو وہاں اس میں دلچسپی رکھنے والی شخصیات کو تلاش کر کے اس طرح کے ادارے کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ اور اپنا نظام و انتظام انہیں دینے کی آفر بھی کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے پرانے رفقاء کے ساتھ مل کر چھ ماہ قبل ایک سہ روزہ کانفرنس کی جس میں تقریباً 30 کے قریب ممالک سے ہمارے پرانے طلبہ بھی شریک ہوئے ہیں۔

ان کے ساتھ میٹنگ کرنے کے بعد ہم نے اندازہ لگایا کہ تقریباً 18 ممالک ایسے ہیں کہ جن میں کوئی کام نہیں ہو پایا اور نہ ہی ہو پا رہا ہے۔ ان کے علاوہ جو بارہ تھے ان میں کام کی کچھ شکل بن چکی تھی۔ ان کے ساتھ خصوصی طور پر ترتیب بنائی گئی۔ ان کے ساتھ چھ مہینے سے ہم مستقل رابطے میں ہیں۔ ان بارہ کے ساتھ آئندہ چند مہینوں میں استنبول کے اندر دوبارہ ایک خصوصی میٹنگ ہے۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو جس طرح ہمارے ہاں ترکی کے اندر ایک فیڈریشن ہے، بالکل اسی طرح ہم ایک عالمی پلیٹ فارم بنائیں گے جو مختلف ملکوں کی غیر ملکی طلبہ کے لیے ایک علمی سطح کی تنظیم ہو گی۔ اس کے قیام کے بعد عالمی سطح پر دنیا کے طلبہ کی آمد و رفت کو دیکھتے ہوئے ان کی رہنمائی کریں۔

اس کے ذریعے ہماری کوشش ہوگی کہ ترکی پاکستان کی یونیورسٹیز سے رابطہ کرے۔ کتنے طلبہ ترکی سے پاکستان جارہے ہیں اور مزید کتنے جانا چاہتے ہیں؟ ان تعداد کو بڑھانے کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟ ترکی سے باہر ہمارے طلبہ کہاں کہاں جائیں اور انہیں کہاں بھیجا جائے۔ اسی طرح جو طلبہ ترکی میں آنا چاہتے ہیں؟ کہاں کہاں سے زیادہ آنے چاہییں اور ان کی تعداد میں کیسے اضافہ کیا جائے؟ اس پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔ اردن، انڈونیشیا، سوڈان سے طلبہ کو ترکی بلائیں گے۔ آئندہ چل کر پوری دنیا سے ہمارے کن کن شعبوں میں طلبہ کا رجوع ہونا چاہیے اور عالمی سطح پر ہمارے پاس کس کس فیلڈ کے طلبہ ہونے چاہییں، آگے چل کر اس پر بھی توجہ دیں گے۔ صرف پاکستان، سوڈان یا چند قریبی ممالک کو ہدف نہیں بنانا، بلکہ پوری دنیا کے ممالک کے طلبہ کو یکساں لینا ہے۔

☆ اسکالرشپ دینے کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا پاکستان سے دینی مدارس کے طلبہ کو بھی آپ نے ترکی بلایا ہے؟

◄..... آپ کے دوسرے سوال کا پہلے جواب دینا پہلے پسند کروں گا کہ ہم دینی مدارس کے طلبہ کو بھی لیتے ہیں۔ اس میں ہمارے پاس ہائی اسکول، کالج لیول سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح پر بھی طلبہ ہمارے پاس آرہے ہیں۔ ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ ان طلبہ کی تعداد میں مزید اضافہ ہو۔ طلبہ کو اسکالرشپ دینے میں اس طالب علم کے ملکی احوال اور اس کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے شرائط کے تحت اسکالرشپ دیتے ہیں کہ کن طلبہ کو زیادہ دینا ہے؟ یعنی جس ملک سے کوئی بچہ آرہا ہے اس ملک سے ہمارے متعلقہ کوئی شخصیت کسی بچے کے بارے میں کہتی ہے کہ اس کی مدد کی جائے تو اس ریفرنس کی بنا پر ہم اس کی پوری رعایت کرتے ہیں۔ اسی طرح جانچ پڑتال بھی کرتے

ہیں کہ کیا واقعی یہ مالی لحاظ سے محتاج اور ضرورت مند ہے یا نہیں؟ چوتھا درجہ یہ ہے کہ ''مؤلفۃ القلوب'' کے زمرے میں ہم غیر مسلموں کے ساتھ بھی تعاون کرتے ہیں۔

اسی طرح طلبہ کا آنا دو صورتوں میں ہو رہا ہے۔ ایک یہ حکومت کا یہ منصوبہ ہوتا ہے کہ بہت سے طلبہ کو لانا اور حکومت ہر سال 5 ہزار طلبہ کو لاتی ہے۔ ہم طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں، انہیں اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ گورنمنٹ اسکالر شپ دے رہی ہے، آپ بھی اپلائی کریں۔ اور وہ حکومت کی طرف سے سیلیکٹ کیے جاتے ہیں۔ یہ سال میں ایک دفعہ لیے جاتے ہیں اور اس سال کی درخواستیں ابھی جاری ہیں۔ یہ مکمل طور پر حکومت کے زیر کفالت ہوتے ہیں۔ حتی کہ ان کی یونیورسٹی، ہاسٹل اور دیگر ضروریات مفت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ انٹرنیٹ کے ذریعے آن لائن درخواست بھیجتے ہیں۔ پھر ان میں سے انتخاب کے بعد انہیں بلا کر ان سے ملاقات کی جاتی ہے۔ اس کام کے لیے حکومت نے خصوصی ایک ادارہ بنایا ہے جس میں ہر گروپ اور شعبے کی طرف سے ماہر افراد بھیجے جاتے ہیں۔ وہی ان طلبہ کا انٹرویو کرتے ہیں۔

دوسری اسکالر شپ ترکی کے ''دیانت'' یعنی ''اوقاف'' کی طرف سے ہے۔ اس کی طرف سے بھی داخلے ابھی جاری ہیں۔ یہ خصوصاً دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ہائی اسکول، کالج اور امام و خطیب کے اسکولوں میں بھی بلائے جا رہے ہیں۔ انہیں شعبہ ''الٰہیات'' میں بلایا جا رہا ہے۔ یہ اسکالر شپ ترکی کے ''دیانت'' یعنی اوقاف کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

☆ ہم لوگ جو پاکستان میں ترکی سے واقف تھے وہ ''پاک ترک اسکول'' یعنی گولن صاحب کی جماعت کے ذریعے سے تھے۔ ہم تو ویسے بھی ترکی سے محبت کرتے

ہیں تو ان سے ملتے رہتے تھے۔ ہم جب ترکی جاتے ترکی کا مطلب ہے گولن صاحب۔ لوگوں کے ان نظریات کی تصحیح کے لیے یا حقیقت سے آگاہی کے لیے آپ کیا کہیں گے؟

◄...... یہ جو فتح اللہ گولن کی جماعت ہے۔ ان کی جو موومنٹ ہے اور ان کے جو اسکول ہیں، اب وہ "پاک ترک" ہوں یا دوسرے۔ چند سال پہلے تک تو ایسے لگتا تھا، لیکن جس طرح ترکی کی بہت تنظیمیں اور جماعتیں ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک ہے۔ یہ جماعت ترکی میں ہی پیدا ہوئی اور ترکی کے لیے ہی کام کر رہی تھی۔ ہم سب بھی اسی سے محبت کرتے تھے، جیسے آپ لوگ کرتے ہیں۔ لیکن جب سے انہوں نے امریکا کے ساتھ پینگیں بڑھائیں اور ان کے ہمنوا بن کر امریکا کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تو ہماری ہمدردیاں بھی ان سے ختم ہونا شروع ہو گئیں۔ کوئی تنظیم یا جماعت جب تک اپنی قوم، ملک، ملت اور مذہب کے کاز کے لیے کام کرتی ہے اس وقت تک اس کی قیمت ہے، لیکن جب اس کی تمام تر قربانیاں، وفاداریاں اور محنت کسی دوسرے کے لیے ہوں تو اس کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ جماعت جس ملک میں پیدا ہوئی اور جس کے لیے اسے کام کرنا چاہیے تھا اس کے برعکس اس نے امریکا کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ جب انہوں امریکی مفادات کے لیے کام کرنا شروع ہو گیا تو ہمارے تعلقات ان سے ختم ہو گئے۔ اب وہ ہماری تنظیم نہیں ہے۔ اب تو ترک گورنمنٹ بھی تقریباً تین سال سے اندرونِ ملک سے ان کا راستہ روک رہی ہے اور ان کی صفائی کر رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی جماعت ایک نظریات، مذہب اور مقصد کے تحت سامنے آئی ہوتی ہے۔ اس لیے اس جماعت کے پیچھے بھی ایک سوچ اور کچھ نظریات کارفرماں ہیں۔ اس کے پیچھے بھی ایک فلسفہ، سوچ، جذبہ، قوت اور نظریاتی طاقت ہے۔ اس لیے یہ مکمل طور پر ختم تو نہیں ہوگی، لیکن مثبت اور مسلسل محنت کے

ذریعے ان شاء اللہ! مغلوب ضرور کر دی جائے گی۔ بس! جس طرح انسان غلطی کرتا ہے بالکل اسی طرح جماعتیں بھی غلطی کرتی ہیں۔ ہم بھی کسی انسان میں خیر کے غلبے کو دیکھتے ہیں اور اس کی استقامت کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس پر گامزن ہے یا نہیں؟

☆ جس طرح گولن صاحب کی جماعت کی بنیاد تو ٹھیک تھی۔ آگے چل کر خراب ہوگئی۔ اور آگے چل کر شاید ٹھیک بھی ہو جائے............ کیا اس کے امکانات ہیں؟

◄...... ہاں! جو اس جماعت نے ایک غلط راستہ اختیار کیا ہے اگر وہ اسے ترک کر کے اصل لائن پر آجائے تو وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تک وہ امریکی کاز اور مفادات کے لیے کام کر رہی ہے تو اس وقت تک وہ ہمارے ملک کے وجود کے لیے مضر ہے۔

☆ فتح اللہ گولن اور ان کی جماعت کے بارے میں آپ کے جو خیالات ہیں، آپ کی یہ گفتگو آن دی ریکارڈ ہے یا آف دی ریکارڈ......؟ کیا ہم اسے چھاپ سکتے ہیں یا نہیں؟

◄...... جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ کیونکہ ان کی بابت بالعموم اور عوامی سطح پر بھی یہی تاثر ہے۔ یہ کوئی ہمارے حالیہ یا نئے خیالات نہیں، بلکہ ہم تو آج سے پانچ دس سال پہلے بھی یہی خیالات رکھتے تھے۔ اور دس سال بعد بھی وہی نظریات رکھیں گے۔ جہاں وہ ٹھیک ہیں، وہاں وہ ٹھیک ہیں۔ جہاں وہ غلط ہیں تو وہاں انہیں غلط ہی خیال کریں گے۔

☆ پاکستان کے اندر دانش اسکول وغیرہ کے نام سے جو کام ہو رہا ہے۔ یہ فتح اللہ گولن کے تعلیمی نظام کا ہی تعاون ہے۔ ہماری پنجاب گورنمنٹ جو تعلیمی کام کر رہی ہے

وہ سارا انہیں کے ساتھ مل کر کر رہی ہے اور ان کا یہاں کافی کام ہے۔ ایسی صورت حال میں آپ کے لیے کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟

◀ ...... ایسا بالکل نہیں ہے۔ ہم تو ترکی میں ان کے مرکز میں بھی اسی طرح کھل کر ان سے بات کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری ترکی زبان کا ایک محاورہ ہے ''اگر ہم لوہے سے ڈریں گے تو کبھی بھی ٹرین پر نہیں بیٹھ سکیں گے۔''

☆ جس طرح آپ کی جماعت پاکستان میں کام کرنا چاہتی ہے اور ہمارے ہاں حکمران تو وہی ہیں، تو ایسا ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں آپ کی جماعت کو کام کے حوالے سے کوئی رکاوٹ یا پریشانی ہو؟

◀ ...... جن امکان اور رکاوٹوں کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہ مسائل اور پریشانیاں تو ان کی جانب سے دس بارہ سال سے ہمارے ساتھ جاری ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا یہ مجادلہ تو پہلے سے جاری ہے۔ ہمارے کاموں میں رخنہ تو وہ ابتداء ہی سے ڈال رہے تھے۔ جب ہمارے اختلافات اتنے بڑھے بھی نہیں تھے، اس سے قبل بھی وہ ہمارے کاموں میں رکاوٹ بنتے رہے اور ہر ملک میں رکاوٹ کھڑی کرتے رہے ہیں۔ ہمارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا اور کھل کر چلے گا۔

☆ آپ نے پاکستان کے مدارس کا دورہ بھی کیا، اسی طرح جامعۃ الرشید کو بھی دیکھا تو آپ نے پاکستانی مدارس کو کیسا پایا؟

◀ ...... ہم نے پاکستانی مدارس کے بارے میں لوگوں سے بھی سن رکھا تھا، لیکن ہمارے ہاں ترکی میں جیسے چھپ چھپا کر جو چھوٹے چھوٹے مدارس بنے ہوئے ہیں تو ہمارے ذہن میں بھی وہی تصور تھا کہ ویسے ہی چھوٹے چھوٹے مدارس ہوں گے۔

کیونکہ ترکی میں 1924ء میں جب خلافت کو ختم کیا گیا تھا اور اس کے بعد جو سیکولر قانون بنایا گیا تھا تو ترکی کے اندر آئینی طور پر تمام دینی مدارس اور خانقاہوں کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے جب مدارس کا وجود ہی ختم کر دیا گیا تو ہم نے اپنی زندگی میں ایسے ہی چھوٹے چھوٹے اور وہ بھی چھپ چھپا کر بنائے گئے مدارس ہی دیکھنے کو ملے۔ اس لیے مدارس کا نام لیتے ہی ہمارے تصورات اور خیالات میں مدارس کا وہ نقش ہوتا ہے۔ اس لیے پاکستان آنے سے پہلے ہمارے ذہن میں ویسے ہی مدارس تھے، لیکن جب یہاں آئے تو اتنی بڑی بڑی شاندار عمارتیں اور تعلیمی نظام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میرے پاکستان میں داخل ہونے کے بعد مدارس کا وہ تصور اب پاش پاش ہو چکا ہے۔ ہمارے ذہن میں تو یہ تھا کہ صرف حفظ وغیرہ کروانے کے انتظام کو مدرسہ کہتے ہیں۔ یہ تو یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں تو یونیورسٹی سطح کی تعلیم کا مکمل نصاب اور نظام ہوتا ہے۔ اب میرا یہ ذہن بنا ہے کہ یونیورسٹی لیول تک بھی مدارس ہوتے ہیں۔ اور اب میں اپنے ذہنی افق سے یہ بآسانی سمجھ سکتا ہوں کہ عثمانی سلطنت میں مدارس کیا تھے؟ تو اس گمنام حقیقت کو میں نے اب پا لیا ہے۔ پاکستان کے مدارس نے مجھے خلافت کے زمانے میں پہنچا دیا اور اب میں تاریخ میں بکھرے ان نقوش کو حقیقت کے روپ میں سمجھ چکا ہوں۔ اب میں مدارس کی اس روح کو پا چکا ہوں۔

☆ ہمارا اخبار آپ کے لیے کیا خدمات دے سکتا ہے؟

◀ ..... آپ کے اخبار سے ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ جیسے ہم غیر ملکی یعنی مہمان طلبہ کے لیے محنت کرتے ہیں۔ جس طرح ہمارے کچھ بھائی اس سلسلے میں محنت اور کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آپ کا اخبار بھی اس سلسلے میں کوشاں ہو اور پاکستان کے اندر خصوصاً دین دار طبقے میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ دیں: ''اے مسلمانو! تمہارے

ہاں آئے ہوئے جو مہمان طلبہ ہیں۔ ان مسافر مہمانوں کی مہمان نوازی کرو۔ ان کی میزبانی کا حق نبھاؤ۔ انہیں غیر ملکی نہ سمجھیں، بلکہ انہیں مہمان سمجھیں۔''

☆ کیا آپ کے پاس پراسپیکٹس وغیرہ ہیں جس سے ہم مزید تفصیلات وغیرہ جان سکیں؟

◄ ...... جی ہاں! یہ تمام چیزیں تو ہیں ہی، لیکن ہماری ویب سائیٹس پر تمام تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو تمام چیزیں پہنچا دیں جائیں گی۔

بہت بہت شکریہ

اردگان کا پیغام مسلم امہ کے نام

مولانا ندیم الرشید

ترکی کے صدر رجب طیب اردگان کا کہنا ہے کہ مرد اور خواتین کے متفرق کردار ہیں، اس لیے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ ترک صدر نے کہا مرد اور خواتین برابر نہیں ہیں۔ حقوقِ نسواں کے حامی ممتا کے تصور کو مسترد کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے استنبول میں خواتین کے لیے انصاف کے موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس کے موقع پر کیا۔ انہوں نے کہا مردوں اور خواتین کے مابین حیاتیاتی تفریق کا مطلب ہی یہی ہے کہ زندگی میں دونوں ایک طرح کے امور سرانجام نہیں دے سکتے۔

ہمارے مذہب نے خواتین کو ماں کا درجہ دیا ہے۔ کچھ لوگ اسے سمجھ سکتے ہیں اور کچھ لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ طیب اردگان کا کہنا تھا کہ آپ حقوقِ نسواں کے حامیوں کو یہ نہیں سمجھا سکتے، کیونکہ وہ ممتا کے تصور کو ہی تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا مجھے یاد ہے کہ میں اپنی ماں کے پیر

چوما کرتا تھا، کیونکہ اس میں سے جنت کی خوشبو آتی تھی، وہ شرمیلے انداز میں میری طرف دیکھا کرتی اور کبھی رویا بھی کرتی تھیں۔ ممتا کا جذبہ کچھ اور ہے۔

ترکی کے مردِ مؤمن نے سو فیصد درست بات کی ہے اور اُن کا یہ بیان ہر صاحبِ ایمان کے دل کی آواز ہے جس پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے۔ اگر اس بیان کے بعد انہیں اس طرح کے چند تاثرات کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کیا جائے تو اس کا مطلب ہے ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ اُس مردِ حق نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے اور عالمی طاغوت کے سامنے کس قدر جرأت، بہادری، دلیری، حق گوئی، صداقت، شجاعت، مردانگی اور غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیا ہم تصور کر سکتے ہیں کہ حقوقِ نسواں کے حوالے سے اُن کا یہ کہنا کہ ''مرد اور خواتین برابر نہیں'' اس کے نتیجے میں اُن کی حکومت بھی جا سکتی ہے اور ان کے اقتدار کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ جی ہاں! ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کیس یورپ کی انسانی حقوق کی عدالت یعنی ''یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس'' میں دائر کر دیا جائے تو ان کی حکومت ختم ہو سکتی ہے۔ جیسے نجم الدین اربکان کی حکومت ختم ہو گئی۔

طیب اردگان جب مرد اور عورت کے درمیان برابری کو نہیں مانتے تو ان کا یہ عمل جس کا وہ ایک کانفرنس میں اظہار بھی کر چکے ہیں، نہ صرف انسانی حقوق کے عالمی قانون کی خلاف ورزی ہے، بلکہ اس طاغوتی قانون کو جب وہ طبعی بنیاد کے ساتھ ساتھ مذہبی بنیاد پر بھی رد کرتے ہیں تو مغرب کے نزدیک ایسا کرنا ہیومن رائٹس ڈیکلریشن کے خلاف ایک طرح سے جنگ کا اعلان ہے، کیونکہ انسانی حقوق کا محافظ UNO (اقوام متحدہ) ہے، لہٰذا دنیا کے ہر ملک کو لازماً اس کے چارٹر پر دستخط کرنے ہیں جو نہ کرے اس کے خلاف تمام اقوام عالم کی طرف سے جنگ مسلط کی جائے گی۔ اور جو حکمران اس کی خلاف ورزی کرے، اس کی توہین کرے یا اسے ماننے سے انکار کرے، اُس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، قارئین آسانی سے اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہیومن رائٹس ڈیکلریشن کو

آسان الفاظ میں ہم مغربی تہذیب کی شریعت کہہ سکتے ہیں جس کی تعلیمات ایک عام فرد سے لے کر اداروں اور ریاستوں تک کو اپنے زیرِ اثر رکھ کر دنیا میں مغرب کے عروج اور اُس کے غلبے کو ممکن اور مستحکم بناتی ہیں۔ بنیادی حقوق کے منشور کے تحت مذہب کو صرف انفرادی سطح پر قبول کیا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی اور پبلک آرڈر میں مذہب کی برتری اور حاکمیت فلسفہ آزادی کے ذریعے اس منشور کے تحت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہے، چنانچہ HR یعنی ہیومن رائٹس منشور کا دعویٰ ہے کہ اب دنیا میں کوئی مذہبی ریاست ابد تک قائم نہیں کی جا سکتی۔ مغربی شریعت کا دعویٰ ہے، بلکہ ایمان ہے کہ عقل اور نفس پر ایمان لاؤ اور اس کے سوا ہر ایمان، عقیدے اور یقین کا انکار کر دو۔ انسانی حقوق کا قانون دنیا کو ایک مذہب کے تحت لانا چاہتا ہے جس کی بنیادی ایمانیات آزادی، مساوات اور ترقی ہیں۔ گویا طیب اردگان نے عورت اور مرد کے درمیان مساوات کو تسلیم نہ کر کے مغربی شریعت کی ایک بنیادی ایمانیاتی حیثیت کا انکار کیا ہے۔

ایسا ہی معاملہ تیونس میں پیش آیا۔ ''النہضۃ الاسلامی'' پارٹی کے راشد غنوشی کو بھی ایک اسلامی انقلابی راہ نما خیال کیا جاتا ہے۔ ان پر بھی مغرب نے آزادی کو تسلیم نہ کرنے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا، حالانکہ وہ خود کو بظاہر اس قدر روشن خیال، لبرل اور آزاد مسلم مفکر پیش کرتے ہیں کہ اقتدار میں آنے کے بعد عالمی میڈیا BBC سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ''ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ عوام کیا کھائیں؟ کیا پئیں؟ کیا پہنیں؟ اور کیا عقیدہ رکھیں؟'' ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ساحلِ سمندر پر مختصر لباس پہننے یا شراب کی فروخت پر پابندی لگانے کا ہم کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اس بات کو ترجیح دیں گے کہ لوگ خود ایسے کام نہ کریں، مگر یہ اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔

اس قدر آزادی روی کے بعد بھی راشد غنوشی کو برداشت نہ کیا گیا، ان کے خلاف شدید مظاہرے

ہوئے، کیونکہ مغرب کا خیال تھا کہ یہ آزادی کا نام تو لیتے ہیں، مگر اس کو مانتے نہیں۔ اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے تین خواتین ''مارگریٹ سٹرن'' اور ''پولائن ہلیر'' کو فرانس سے جبکہ ''جوزفین مارک مین'' کو جرمنی سے تیونس بھیجا گیا۔ حقوق نسواں کی محافظ ان تین خواتین نے تیونس کی بعض عورتوں کے ساتھ مل کر احتجاج کیا۔ احتجاج کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ سر بازار انہوں نے اپنے سینے کھول دیے اور اپنی چھاتیوں کو برہنہ کر دیا۔ تیونس کی پولیس نے ان بے شرم عورتوں کو گرفتار کیا اور 4 ماہ کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ اب مغرب نے واویلا شروع کر دیا کہ تیونس نے انسانی حقوق کے عالمی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ عورتوں کی آزادی کو سلب کیا ہے، چنانچہ راشد غنوشی کی اسلامی حکومت کے خلاف مظاہرے شدت پکڑ گئے۔ آخر کار انہوں نے ستمبر 2013ء میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام اور نئے انتخابات کی منظوری دی، لیکن نئے انتخابات میں راشد غنوشی کو عالمی طاغوت نے شکست دلوادی، کیونکہ انہوں نے عورتوں کی آزادی میں مداخلت کرتے ہوئے انہیں سر بازار ننگا ہونے پر گرفتار کروایا تھا۔ مغرب حقوق نسواں، ہیومن رائٹس ڈیکلریشن، آزادی مساوات اور ترقی کے خلاف جب کچھ بھی برداشت نہیں کر سکتا تو اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ترکی کے مردِ مؤمن نے حقوقِ نسواں کے علمبرداروں کو للکار کر کس قدر جرأت اور ایمانی غیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

طیب اردگان کی جانب سے یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کو للکارا ہے۔ اس سے پہلے بھی اگست کے مہینے پر انہوں نے ''اکانومسٹ'' اور ترکی کے ''روزنامہ طرف'' کی کالم نگار اور صحافی کو اسلام کے خلاف لکھنے پر خوب رگڑا دیا۔ ''عنبرین زمان'' نامی صحافی کو انہوں نے صرف ''بے شرم'' اور ''دہشت گرد صحافی'' ہی قرار نہیں دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اوقات کو پہچانے۔ اس پر بھی انہیں عالمی میڈیا کی طرف سے خوب تنقید کا نشانہ بنایا گیا، لیکن انہوں نے پرواہ نہ کی۔ ایسے ہی ترکی کے نائب وزیراعظم بھی نام نہاد حقوقِ نسواں کے مخالف ہیں اور مغرب

کی مخالفت کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ ''بلند اریتک'' نے عیدالفطر کے موقع پر اپنے ایک بیان میں کہا تھا: ''حیا اور پاکدامنی انتہائی اہمیت کی حامل چیز ہے۔ یہ محض ایک لفظ نہیں، بلکہ عورت کا گہنہ اور زیور ہے، چنانچہ ایک عورت کو باحیا اور پاکدامن ہونا چاہیے۔ اسے اپنی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کا فرق معلوم ہونا چاہیے اور ایک عورت کو کبھی بھی پبلک میں بیٹھ کر نہیں ہنسنا چاہیے۔'' اس بیان پر ان کے خلاف سیکولر لوگوں کا بہت سخت ردِعمل سامنے آیا۔ ہزاروں عورتوں نے سڑکوں پر کھڑے ہو کر قہقہے لگائے اور اپنی تصویریں سوشل میڈیا پر جاری کیں۔

اگر ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے تو اس ظالم نظام کے خلاف کلمۂ حق کہنا کتنا بڑا جہاد ہو گا جس نے عصر حاضر میں عملاً کتنے ہی حکمرانوں، سلطنتوں، انسانوں اور معاشروں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ رجب طیب اردگان نے یقیناً پوری اُمت مسلمہ کو اپنے عمل کے ذریعے مغرب کی فکری غلامی سے آزاد ہونے کا پیغام دیا ہے۔ اُن کا بیان محض ایک سیاسی بیان نہیں، بلکہ عصر حاضر میں طاغوت کے مقابل شیر اسلام کی دھاڑ اور غیرت مند عثمانی مجاہد کی للکار ہے۔ جو آدمی اپنے ایمان کی وجہ سے اپنی حکومت کو خطرے میں ڈال دے اُس سے بڑھ کر صاحبِ ایمان اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر بھلا یہ نعرہ مستانہ بلند کرنے میں کیا حرج ہے: ''غیرت مند، باایمان، اردگان! اردگان!''

باسفورس کے کنارے
تصویری البم: بغاوت سے پہلے

آج سے بیس سال قبل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کا ترکی کے وزیر اعظم نجم الدین اربکان کے نام ایک فکر انگیز خط

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

قابل احترام گرامی منزلت جناب نجم الدین اربکان صاحب وزیر اعظم جمہوریہ اسلامیہ ترکی حفظہ اللہ وایدہ بروح منہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! میری بڑی تمنا تھی کہ اس سفر میں جناب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا، اس سے اس میمون وبامقصد سفر کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوتا اور جو ضروری اور اہم باتیں عرض کرنی تھیں اس کا موقع ملتا، اور وہ ترک قوم جس نے اعداء اسلام کو زیر کرنے، مقامات مقدسہ کی حفاظت کرنے اور پورے عالم میں مسلمانوں کو باعزت کرنے اور اسلامی قیادت کے جھنڈے کو بلند کرنے کا اہم کردار ادا کیا ہے اس کے سامنے دل کا ساز چھیڑنے اور صدا لگانے کا موقع ملتا اور اس طرح جو حق مجھ پر عائد ہوتا اس کی کچھ ادائگی ہوتی۔ لیکن افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوسکی اور آپ ایک بامقصد سفر پر تشریف لے گئے اللہ تعالی اس کو مبارک فرمائے اب اس مکتوب کے ذریعہ سے براہ راست آپ سے گفتگو کرنے کا موقع حاصل ہورہا ہے۔ سب سے بنیادی قدم جو اٹھایا جانا چاہیے جو منظم بھی ہو اور مصمم بھی اور ایسا انقلاب انگیز ہو جس کی اس محبوب قوم اور ملک کو ضرورت ہے، اور جو اس کو اس کے پہلے مرکز قیادت تک پہنچادے، وہ یہ ہے کہ اس قوم کو خاص طور سے قوم کے اس طبقہ کو جو تعلیم یافتہ اور مثقف اور یونیورسٹیوں کا ساختہ پرداختہ ہو اور جس کے ہاتھ میں زمام قیادت آنے والی ہو، اس کو یورپ وامریکہ کی غلامی سے آزاد کرایا جائے، جس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ اس کو لادینیت اور مغربی مسیحیت کے پھندے سے خلاصی دلائی جائے اور اس پر جو عقلی، تمدنی، تہذیبی اور تنظیمی مغربی چھاپ ہے، اس کو زائل کیا جائے، جس تہذیب کے نتیجہ میں نئی تعلیم یافتہ نسل اپنی معنوی قوت، جوش وجذبہ اور قربانی کی روح سے عاری ہوگئی ہے اس کے اندر مادی آرائش زیبائش سے مقابلہ کرنے اور سیاست کی عقلی وتمدنی سازشوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔

اسی طرح نوجوانوں میں اسلام پر اعتماد بحال کیا جائے بالخصوص وہ نوجوان جو مثقف اور تعلیم یافتہ ہوں، جن کے اندر صلاحیت ہے کہ اسلام کے خلود وبقا اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اسلامی قیادت کی صلاحیت اور اس پر اعتماد بحال کرنے میں مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں اور عقلی جذباتی تاثیر ونفوذ رکھتے ہیں، اس تعلیم یافتہ نسل کو جس کے اندر سوسائٹی کو نئے رنگ میں رنگنے کی صلاحیت ہے اعتماد ووثوق بحال کرنے والے لٹریچر کے ذریعہ صحافت اور ذرائع ابلاغ سے اس کو احساس کمتری سے بچایا جائے، جو اسلامی عقائد اور اسلامی نظام انسانیت اجتماع کے سلسلہ میں اس کے اندر پیدا ہوگیا ہے۔ یہ وہ مہلک مرض ہے جو اس امت کو روگ کی طرح لگ گیا ہے، وہ امت جس کو اپنے دین پر ناز ہے اور اپنے عقائد شعائر پر فخر ہے وہ ایک معنوی ارتداد کا شکار ہورہی ہے اور یورپ کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے، حلال حرام اور اچھے بڑے کی تمیز کے بغیر اس نے اپنا بنیادی عالمی قیادتی کردار کھودیا ہے بلکہ وہ عقائدی، فکری اور قیادتی ارتداد کا شکار ہوگئی ہے۔ واقعات کی روشنی میں اور ایمانی تقاضے کی روشنی میں یہ سب سے اہم ضرورت ہے اور قیادت کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ باور کرادیا جائے کہ وہ اپنی تمام جزیات کے ساتھ دین حق ہے اور تمام میدانوں میں اس کے اندر بھرپور قائدانہ صلاحیتیں ہیں اور وہ انسانیت جو مغرب کی مادی اور ملحدانہ شازش کی شکار ہوگئی ہے اس کو بچانے کا بھی تنہا یہی ایک راستہ ہے، اس کے لیے تعلیم وتربیت، تہذیب، ذرائع ابلاغ اور صحافت کے نظام کو بدلنا ہوگا۔ اور اس نصاب تعلیم اور ان کتابوں کو رواج دینا ہوگا جو نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کی اسلامی تشکیل کرسکیں اور جب تک یہ انقلابی اور تعمیری عمل انجام نہیں دیا جائے گا اس وقت تک اس امت کی دین سے وابستگی، دینی حمیت اور اس کی راہ میں قربانیوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ان تمام کاموں میں جلد بازی اور جوش کے بجائے حکمت ومصلحت اور تدریج کی ضرورت ہے، اور تعلیم یافتہ طبقہ سے مدد لینے کی ضرورت ہے، جس کے ہاتھ میں صحافت اور ذرائع ابلاغ ہیں اور جو تربیتی تعلیمی نظام کے مالک ہیں، اس کی بنیاد توجہ الی اللہ اور اخلاص پر ہونی چاہیے۔ الحمدللہ آپ کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے اور اللہ تعالی نے آپ کو قیادت کا ایک ایسا موقع عطا فرمایا ہے جو عام طور پر سیاسی قائدین اور اہل اقتدار کو نہیں ملتا، اللہ تعالی آپ کی رہنمائی فرمائے اور یہ امت اعداء اسلام کی جس سازش کا شکار ہوگئی ہے آپ کے ذریعہ وہ اس شکنجے سے نکل سکے۔ واللہ ولی التوفیق

سلطان عبدالحمید ثانی کا فرمان جس میں انہوں نے یہود کی فلسطین کی طرف نقل مکانی پر پابندی لگائی تھی۔ بلاشبہ ان کی فراست اور بصیرت نے بھانپ لیا تھا کہ یہ مسکین لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے نہیں، قابضین کے گروہ ہیں جو بیت المقدس پر غاصبانہ تسلط چاہتے ہیں۔
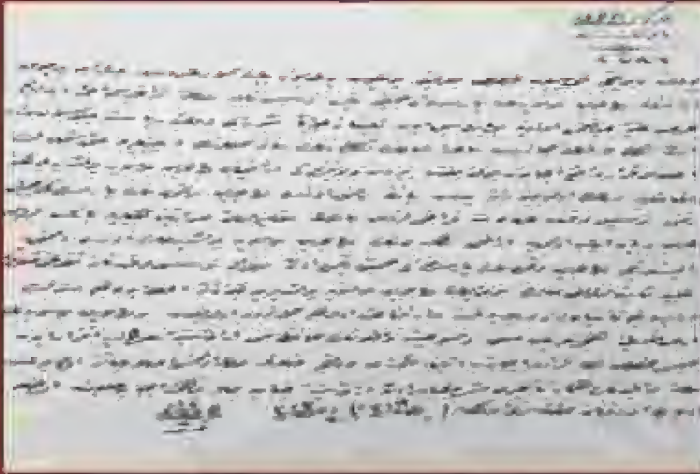
Musevi göçmenlerin Filistin'e göç etmelerini engelleyen yasağın sürdürülmesi hakkında Sultan II. Abdülhamid'in emri

الأمر السلطاني للسلطان عبد الحميد الثاني بشأن استمرار الحظر على الهجرة اليهودية الى فلسطين

14 Ekim اكتوبر 1901

BOA, İ.HUS 9/12

سرائیوو کے عثمانی گورنر غازی خسرو بیگ کا قائم کردہ ادارہ، جہاں امت مسلمہ کو تعلیم کی نوعیت اور تعلیمی اخراجات کے حوالے سے دو کامیاب نظریے دیے گئے تھے۔ تمام بچوں کی بنیادی تعلیم ایک جیسی ہو اور مدرسے کے اخراجات وقف سے پورے کیے جائیں۔ تفصیل کتاب میں پڑھیے۔

خلافت عثمانیہ کے زمانے کی ایک گھڑی جس میں بارہ ہندسوں کی جگہ بارہ صفات اور حکمت کی باتیں لگائی گئی ہیں۔ گویا انسان کو پیغام دیا گیا ہے کہ زندگی کی گنی چنی گھڑیاں ایمانی صفات کے سائے میں گزارنا ہی دارین کی نجات وفلاح کا باعث ہے۔

Eski osmanlı saati.
Tevhid, İlim, İrfan, Akıl, Hikmet, İnsan, Amel, Adalet, Ahlak, Umran, İslam, Hak.. (Saat kaç? -İrfan saati.. Saat kaç -Hikmet saati) Ecdadımız Harikaymış...

خلافت عثمانیہ کے زمانے کی ایک یادگار۔ اس ڈبا نما میں چندہ ڈال بھی سکتے تھے اور نکال بھی سکتے تھے۔ جو صاحب حیثیت ہوتا وہ اس میں جب توفیق حصہ ڈال دیتا اور جس کو ضرورت ہوتی وہ حسب ضرورت نکال بھی سکتا تھا۔

اردگان حکومت کے تمام گروہ مشہور زمانہ ہاسٹلز جہاں عصری تعلیمی اداروں کے نوجوانوں کی تربیت کر کے انہیں ملک کی خدمت، معاشیہ، انتظامیہ اور ابلاغ جیسے شعبوں میں بھیجا جاتا ہے۔

■ ■ ■

اردگان کی اصلاحی تحریک کے رضاکار زندگی ہر شعبے میں کیسے دستیاب ہوئے؟ یہ دو تصویریں اس کا جواب ہیں۔ ان میں ترکی کے دو تعلیمی و تحریکی سلسلے دکھائے گئے ہیں: امام و خطیب اسکول اور ہاسٹلز۔ امام و خطیب اسکول مدرسہ کی ایک جبری متبادل شکل تھی، جس کو غنیمت سمجھ کر محنت کی گئی تو دینی قیادت تیار ہوگئی اور ہاسٹلز کے ذریعے عصری تعلیمی اداروں میں جدید تعلیم پانے والے نوجوانوں پر نظریاتی محنت کی گئی تو ہر ہر شعبہ زندگی میں اسلام پسند اور محب وطن افراد فراہم ہوگئے۔ تفصیل "ترک ناداں سے ترک دانا تک" اور زیر نظر کتاب میں پڑھیے۔

تمام دنیا کے مسلمانوں خصوصاً فلسطین کے مسلمانوں کا درد ترکی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ زیرِ نظر تصویر میں عید الفطر (2016ء) کے موقع پر ترک عوام کا وہ تحفہ بالآخر محصور فلسطینی عوام کے لیے پہنچ ہی گیا جسے روکنے کے لیے اسرائیلی فوجیوں نے ''فریڈم فلوٹیلا'' کے ذریعے بھیجے جانے والے نو ترک فلاحی رضا کاروں کو شہید کر دیا تھا۔

استنبول میں مہاجرین کے لیے اجتماعی افطاری کا ایمان افروز منظر

اس تصویر میں وہ تاریخی مسجد نظر آرہی ہے جو ایک غریب ترک مزدور نے اپنی یومیہ بچت سے تعمیر کی۔ اس کی تفصیل کتاب میں پڑھی جا سکتی ہے۔

ترکی میں احیاء شعائر اسلامی کی مہم مختلف جہتوں سے جاری ہے۔ عوام کو عربی سے مانوس کروانے کے لیے عربی خطاطی کی نمائش کے علاوہ عوامی آگاہی کے لیے لگائے گئے بورڈز پر ترک زبان کے ساتھ عربی زبان میں بھی الفاظ لکھے گئے ہیں۔

■ ■ ■
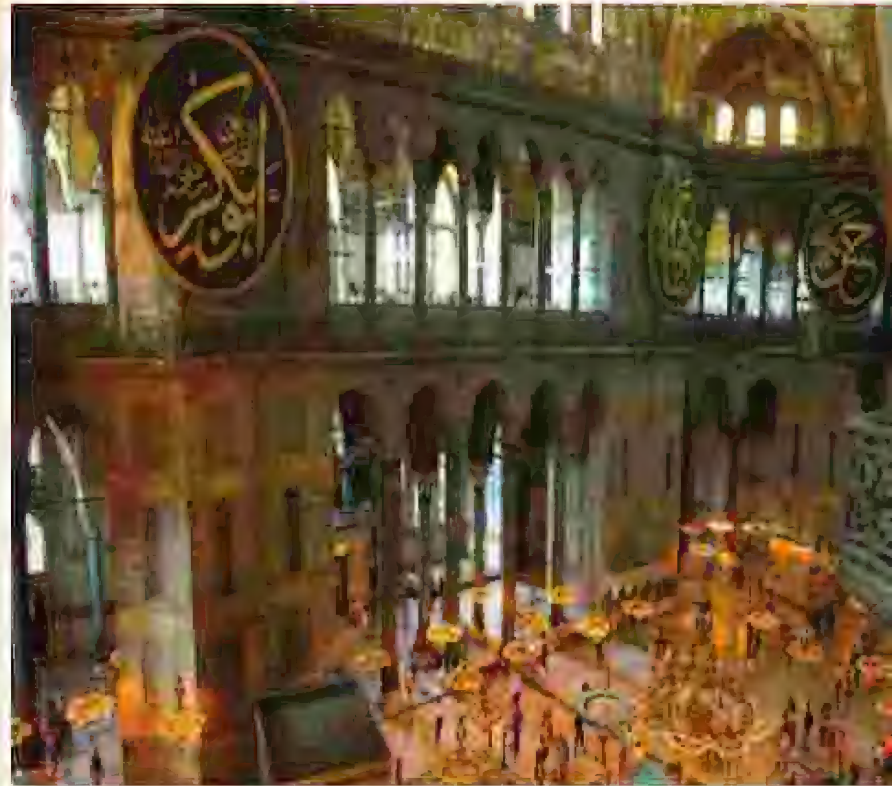
اوپر آیا صوفیہ کی قدیم مسجد ہے اور نیچے دیے گئے نقشے میں اردگان حکومت کی تعمیر کردہ جدید مساجد کی تعداد دکھائی گئی ہے۔ قدیم مذہبی اوقاف کی دیکھ بھال اور جدید اسلامی آثار کی تعمیر میں ترک حکومت خصوصی دلچسپی رکھتی ہے۔ آیا صوفیہ میں کئی دہائیوں کے بعد اذان و نماز کی اجازت (2016ء) اور پورے ملک میں مساجد کا مربوط نظام ترک اسلام پسندوں کی ناقابل فراموش خدمات ہیں۔

خلافت عثمانیہ کے آخری زمانے میں بھی عثمانی مجاہدین میں کیسے کیسے جانباز ہوتے تھے، اس کی ایک مثال "سید ونباشی" ہے جس نے اپنے تمام ساتھیوں کے شہید ہونے کے بعد بھی بھاری بھرکم گولہ اکیلے چلا کر برطانوی جہاز تباہ کیا۔ ترک حکومت نے اس کی یادگار میں اس دن کی تاریخ کی مناسبت سے یونیورسٹی قائم کردی۔ تفصیل کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔

استنبول سے دمشق تک چلنے والی یہ بس اس زمانے کی یادگار ہے جب خلافت عثمانیہ تین بر اعظموں پر حکمران تھی اور عرب و عجم، ترکی و شام کے فاصلے اس کے لیے بے معنی تھے۔

Biliyor musunuz.
Türklerin milli marşı olan "İstiklal Marşı" 571 hece ve 1453 harften oluşmaktadır
(571: Hz Muhammed'in Doğumu, 1453: İstanbul'un Fethi)

هل تعلمون.

النشيد الوطني للأتراك "نشيد الاستقلال" يتكون من 571 هجاء و1453 حرفا. بالنسبة للرقم 571 فهو يرمز لتاريخ ميلاد النبي محمد (ص) وأما الرقم 1453 فهو يرمز لتاريخ فتح إسطنبول

ترک قوم کی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار۔ ترکیوں کے ترتیب دیے گئے "نشیدِ وطنی" یعنی ملی ترانے میں 511 ہجے اور 1453 حروف ہیں۔ 511 کے عدد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عیسوی سن ولادت اور 1453 سے استنبول کی فتح کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے۔

بغاوت کے بعد

کہ خونِ صد ہزار انجم سے

''جوامع الکلم'' ویسے تو سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو دیے گئے تھے جو افضل البشر تھے، لیکن آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت کی برکت سے اللہ پاک صحابہ کرام یا ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی ایسے کلمات کہلوا دیتے تھے جو اسلامی اور عربی ادب کا شہ پارہ ہیں۔ انہی میں سے وہ چند جملے ہیں جو اماں خدیجہؓ نے سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمائے تھے: ''ہرگز نہیں! اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ جس کے پاس کچھ نہ ہو اس کے لیے کماتے ہیں۔ مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جو مشکل میں پڑ جائے اس کی مدد کرتے ہیں۔''

یہ جملے وہ آفاقی صداقت ہیں جو آج ترکی پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ اردگان حکومت کے خلاف انسانیت کے دشمنوں اور اسلام پسندوں کے معاندین کی سازشی کارروائیاں کوئی نئی بات

نہیں۔ یہ فقیر جب پچھلے سال وہاں "ہدایہ شریف" اور "فقہ البیوع" کا کورس کروا رہا تھا تو روز دھماکے ہوتے تھے، لاشیں اُٹھتی تھیں، زخمی آتے تھے، بارود سلگتا تھا، دھماکہ خیز خبریں نشر ہوتی تھیں اور دہشت پھیلائی جاتی تھی۔ ایک طرف لاکھوں مہاجرین کی فی سبیل اللہ میزبانی، دنیا بھر میں تعلیمی و فلاحی کاموں کے ہوش رُبا اخراجات، اندرونی و بیرونی محاذوں پر ہمہ وقت شورشیں، گولن جیسے مغرب کے حمایت یافتہ ماڈرن اسکالر اور ان کا ریاست کے ہر شعبے میں پھیلا ہوا جال، دوسری طرف اکیلا اردگان اور اس کی جماعت کے سرفروش جنہیں اللہ تعالیٰ کی مدد کے علاوہ کوئی آسرا نہیں، کوئی سہارا نہیں...... لیکن عزم ہے کہ اس میں فرق نہیں آتا۔ حوصلہ ہے جس میں کمزوری ڈھونڈنے سے نہیں ملتی، اور ایسا ایمان ہے جو ہم جیسے جغادری مذہبیوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

طرفہ تماشا یہ تھا کہ وہاں کے لبرل اور مذہب مخالف تو حکومت کے خلاف تھے ہی کہ یہ "سعودی عرب" کی مدد سے یہاں "شریعت" نافذ کرنا چاہتا ہے، اور وہ اردگان کی معاشی اصلاحات اور "فریڈم فوٹیلا" جیسی لافانی فلاحی مہمات کو بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ حال یہ تھا کہ شام کے مسلمان جھولیاں پھیلا کر اردگان کو دعا دیتے تھے اور لبرل ان بے سہارا مہاجروں پر طنز کرتے نہ شرماتے تھے۔ دوسری طرف کچھ ٹھیٹھ دینی سیاسی حضرات اس بات سے چڑے ہوئے تھے کہ یہ امریکی حکمرانوں کو استقبالیہ کیوں دیتا ہے؟ اس کا شریعت کی طرف کا سفر کب مکمل ہوگا؟ اس کی آزادخیالی، سست روی اور متحمل مزاجی ان کے لیے باعث تشویش بنی ہوئی تھی۔

14 رجولائی کو بندہ کا ویزہ لگا تھا اور اگلے دن پابہ رکاب ہونے سے پہلے رات کو یہ ہی ہنگامہ شروع ہوا جس میں سحر ہوتے ہوئے عثمانیوں نے دنیا پر ثابت کردیا کہ صد ہزار انجم کی جو قربانی طلوع سحر کی خاطر دی گئی تھی، وہ رائیگاں نہیں گئی اور ترک اسلام پسندوں کی عزیمت و استقامت، مہاجرین کی عدیم النظیر نصرت اور مؤمنانہ فراست کے ساتھ ایمانی جراءت کا امتزاج کام دکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُمت

کو ایک گہرے زخم اور المناک صدمے سے محفوظ فرمالیا ہے۔

اس واقعے سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ ترکی کے اسلام پسند ترکی کے عوام کو دین اور دنیا دونوں کی بہتری اس انداز میں دے رہے تھے کہ انہوں نے ان کے گرویدہ ہو کر انوکھی تاریخ رقم کر دی وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ بقیہ دنیا کے اسلام پسندوں کو اب اپنے معاشروں میں ترقی نہ کرنے کے اسباب جان لینا چاہییں اور اسلام کی بدنامی اور مسلمانوں کی بیزاری کا سبب نہ بننا چاہیے۔ دیکھیے! جب پوری دنیا بغاوت کی کامیابی کی خبریں نشر کر رہی تھی، اس وقت اردگان کے ایک بیان پر ترک عوام باغی فوج کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔ حتیٰ کہ ''ازمیر'' جیسا شہر جو اردگان مخالفین اور ملحدین کا گڑھ سمجھا جاتا ہے، میں لوگ اردگان کے حق میں اور فوج کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ پھر دنیا کی تاریخ میں یہ بھی یادگار رہے گا کہ عین اس وقت جب اردگان کی حمایت میں مساجد میں تکبیروں کی گونج تھی، اسی وقت تقسیم اسکوائر جیسے بدنام زمانہ علاقے میں بھی اردگان کی حمایت میں نعرے لگ رہے تھے۔ فاتح وہی ہے جو دلوں کو فتح کرلے اور دلوں میں اتر جانے والے کام کیے بغیر دل فتح نہیں ہوتے۔ اس واقعے سے خواجہ فتح اللہ گولن صاحب اور ان جیسی دوسری ان تحریکوں کا چہرہ بھی کھل کر سامنے آ گیا جو تجدد پسند اسلام کی داعی ہیں اور انتظامیہ، عدلیہ، فوج اور میڈیا میں اپنے تربیت یافتہ افراد بھرتی کر کے غیروں کے ایجنڈے کو حب الوطنی کے نام پر نافذ کرنے کا مکروہ کردار ادا کرتی ہیں۔

انسان دعویٰ کیے بغیر وہ کچھ کر جائے جو دعویٰ کرنے والوں کو نہیں کرنے دیا جاتا، یہ اس سے بہتر ہے کہ صبح شام مقدس عنوانات اور نعرے لگانے کے باوجود خلق خدا کو شعائر اللہ سے بیزار کر دے۔ اردگان جیسے لوگوں کی حمایت محض اس لیے ضروری نہیں کہ دانا دشمن اس کی مخالفت ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ نادان دوست آگے بڑھ کر ویسی حماقت نہ کر جائیں جو دشمن کی راہ آسان کر دے۔

کیسے کیسے لوگ؟

معرکہ دونوں طرف سے اور ہر سطح پر عروج پر ہے۔ اسلام اور اصلاح پسندوں کی سادگی اور حیلہ ناشناسی اور دین بیزاروں اور دنیا پرستوں کی عیاری اور پینترا بدل بدل کر چکمہ دینے کی مہارت...... دونوں پوری طرح سامنے آ رہی ہیں۔ اردگان کے حق میں بولنے والوں نے چونکہ ان کو قریب سے نہیں دیکھا، لہٰذا مہر بہ لب ہیں۔ گولن نواز حضرات چونکہ گولن تحریک کی بار بار کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، لہٰذا ان کے دفاع میں یک زبان و یک جان ہیں، لہٰذا اگر بات پاکستانی میڈیا کی حد تک ہو تو صاف طور پر گولنسٹ حضرات کا پلّہ بھاری ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اردگان کی خامیاں سامنے لائی جا رہی ہیں اور تلاش کر کر کے عالمی سازش کا حصہ بن کر ریاست کے خلاف عسکری بغاوت جیسے سنگین جرم کے مرتکبین کی معصومیت ثابت کی جا رہی ہے۔ یہ عاجز چونکہ محض اپنے شوق مشاہدہ کی تسکین کے لیے کئی مرتبہ ترکی جا چکا ہے اور جانبین

میں سے کسی کی میزبانی کی سہولت حاصل کیے بغیر بغور حالات کا قریب سے اور دقت نظر سے مشاہدہ کرتا رہا ہے، اس لیے کوشش کرے گا کہ اب تک جو دیکھا سنا قارئین کو اس میں شریک کرے۔ فیصلہ اہل نظر خود کر سکتے ہیں۔

اردگان کے نظریات کے مطابق کام کرنے والے حضرات سے پہلے اس عاجز کا رابطہ گولنسٹ حضرات سے ہوا۔ 90ء کی دہائی میں جب گلشن اقبال کراچی میں امامت وخطابت بندہ کے سپرد تھی، قریب ہی دوسری گلی میں پاک ترک اسکول تھا۔ حضرت والد صاحب کی کتابوں میں بندہ کو خلافت عثمانیہ اور خلافت ہسپانیہ کے متعلق کتابیں بار بار پڑھنے کا موقع مل چکا تھا۔ اس لیے عثمانی سلاطین سلطان محمد فاتح اور اندلسی حکمرانوں میں سے امیر عبدالرحمٰن الداخل سے نہایت قربت اور ذہنی مناسبت تھی۔ علمائے دیوبند کی خلافت عثمانیہ کے لیے دی گئی قربانیاں بھی دل و دماغ میں رچی بسی ہوئی تھیں۔ اس لیے پاک ترک اسکول والوں سے خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اس زمانے میں تعجب ہوا کہ یہ حضرات اسکول میں اتاترک صاحب کی اتنی بڑی تصویر کیوں لگاتے ہیں؟ اور بچوں کو موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کس مفید غرض سے دیتے ہیں؟ حجاب نہ کریں، لیکن اس پر پابندی کیوں تھی؟ لیکن ان کے طویل جبری بے دینی کے پس منظر کے تحت ان چیزوں سے فی الحال صرف نظر کرنے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔ پھر گولن صاحب کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا تو انتہائی بدمزگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ ان کی تحریروں کا آخری نتیجہ دیندار نظریاتی افراد کی تیاری نہیں، بلکہ ان کی محنت کا پرنالہ تو کسی اور کے صحن میں گر رہا ہے۔ ان سے تو ہارون یحییٰ بہتر ہے جو ذاتی اعتبار سے جو بھی ہو، لیکن اس کی تحریر کا آخری فائدہ تو بہرحال اور فی الحال کسی اور کو نہیں ہو رہا۔ لاہور میں گولن صاحب کی تحریک کے روح رواں ترگت صاحب ہوتے تھے۔ میڈیا پر ایک کورس کی اختتامی تقریب میں انہوں نے ایک شریک کو سرعام صرف اس

لیے سخت سست کہا کہ وہ باریش مولوی صاحب تھے اور غلطی سے اس دن لال رومال اور نیا سعودی جبہ پہن کر آ گئے تھے۔ ترگت صاحب سے جب اس بدتہذیبی کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ہمارے ملک میں اس پر پابندی ہے۔ ظاہر ہے یہ عذر لنگ تھا۔ اس وقت ترکی میں مسلمانوں کا گمشدہ حلیہ واپس دریافت ہو رہا تھا اور پاکستان میں ہونے والی ایک تقریب میں ایک شریک کی باز پرس ترگت صاحب سے اتنی سختی سے نہیں ہوسکتی تھی، جتنی بدتہذیبی سے انہوں نے تمیز کی سرحد عبور کی تھی۔ صورتحال پریشان کن تھی، لہٰذا مزید آگے جا کر اور نہایت قریب سے ان کے اغراض و مقاصد کی جانچ شروع کی۔ ایک طرف ترکوں سے ہمدردی تھی۔ دوسری طرف ان کے اصلاح پسندوں کا یہ روپ نہایت تکلیف دہ تھا۔ اس عاجز کو کچھ علم نہ تھا کہ ترکی کے اصل اصلاح پسند یہ نہیں، یہ تو ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ پھر چند سال پہلے ترکی میں کتابوں کی عالمی نمائش ہوئی۔ بندہ نے ایک وفد تیار کیا جس میں خطاط، قرآن کریم کے طابع، تاجر اور ایک پروڈیوسر شامل تھے۔ جہاں ہمارا قیام تھا وہاں قریب ہی عیسائی حضرات کا ایک تاریخی گرجا تھا۔ معلوم ہوا کہ عالمی صلیبیت کے سرکردہ افراد اس کے اردگرد جائیداد خریدنے میں انتہائی دلچسپی رکھتی ہے۔ گولنسٹ حضرات اس کی بھرپور مدد کرتے ہیں اور اردگان والے کسی قیمت پر انہیں القدس میں صہیونیت والا کردار دہرانے نہیں دیتے۔ شیخ محمود آفندی صاحب کے مرید اس علاقے میں بکثرت تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو سخت تاکید کی تھی کہ ہرگز کوئی غیر ملکی یا غیر مسلم یا غیر معروف ترک یہاں ایک مکان نہ خریدنے پائے۔ اب راز آہستہ آہستہ کھلنے شروع ہوئے۔ گولن صاحب کی تعلیمی اور فلاحی تحریک کا ان کے مراکز میں جا جا کر جتنا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ خود فقیر کی کتاب ''عالمی یہودی تنظیمیں'' کا ایک ایک باب یہاں منطبق ہو رہا ہے۔ ان حضرات کا سعید الزماں نورسی صاحب کے اغراض و مقاصد بلکہ اصل طور طریق سے ہی

انحراف، ان کو ملنے والی پراسرار اور خطیر امداد، نیز تعلیم، صحافت، عدلیہ اور فوج میں افراد بھرتی کرنے کی مہم کا ہدف...... وغیرہ وغیرہ اس پر بندہ نے واپس آکر ''ہیملن سے گولن تک'' مضمون لکھا۔ ہیملن وہ شخص تھا جس نے عیسائی ہو کر ترکی میں سیکولر انقلاب برپا کیا اور گولن وہ صاحب تھے جو صوفی ہو کر وہی کام کر رہے تھے اور انہیں عالمی قوتوں کی مکمل آشیر باد حاصل تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ متعدد مرتبہ دعوت کے باوجود ان حضرات کی میزبانی میں ترکی کا دورہ نہ کیا ورنہ مجھے ان کا وہ چہرہ دیکھنے کو نہ ملتا جو میرے ان صحافی اور معلّم حضرات کو نہ مل سکا جنھوں نے ذاتی طور پر دونوں کا جائزہ نہ لیا اور آج بھی ''پاک ترک اسکول'' جیسے اداروں کی حقیقت نہیں سمجھ پائے جو عیسائی مشنری اسکولز سے زیادہ خطرناک ہیں۔

دوسری طرف اردگان صاحب کی پہلی تصویر اس فقیر نے استنبول کے ایک چائے خانے میں دیکھی جہاں ناظم استنبول کی حیثیت سے سڑک کی تعمیر کی نگرانی کرتے ہوئے اردگان صاحب وہاں آنکلے تو بے تکلفی سے بیٹھ کر ترکش چائے پی لی۔ دل نے کہا کہ اگر یہ شخص نیک نیت ہے تو بہت بڑا آدمی ہے اور اگر بدنیت یا بدنیتوں کا گماشتہ ہے تو بہت بڑا فنکار ہے۔ آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ یہ جتنا بڑا انسان ہے اتنا بڑا مظلوم بھی ہے۔ اس سے اس کے سابقہ استاد یعنی نجم الدین اربکان صاحب کی جماعت بھی ناراض ہے کہ یہ اتنا آہستہ، اتنا سمجھوتہ کر کے، پھونک پھونک کر کیوں قدم رکھتا ہے؟ مجھے خود سعادت پارٹی کے استنبول کے صدر نے انٹرویو کے دوران ایسی بات کہی۔ پھر انہی حضرات کے چینل کے سربراہ نے کہا کہ یہ لوگ کہتے تھے: ''پل سے گزرتے وقت اگر ریچھ کھڑا ہو تو پل سے گزرنے تک اسے ماموں کہنا پڑتا ہے۔ نجانے اردگان والے کب پل سے گزریں گے اور کب ریچھ کے بھانجے بننا چھوڑ دیں گے۔'' الغرض ایک طرف ٹھیٹھ اسلام پسند اس کے مخالف تھے۔ دوسری طرف سیکولر حضرات اس کی جان کو آئے ہوئے تھے جو گولن صاحب کی

سرکردگی میں 2014ء کی مہم میں اپنے عدلیہ ونگ کو استعمال کر چکے ہیں۔ انٹیلی جنس ونگ بھی اپنی بازی لگا چکا ہے۔ اب عسکری ونگ کی ناکامی کے بعد ان کا میڈیا ونگ گرتی دیواروں کو سہارا دینے میں مصروف ہے۔ رہی عالمی جانبداری تو وہ بند آنکھوں سے بھی نظر آ رہی ہے۔

تیسری طرف ترک قوم پرست اور چوتھی طرف کرد حضرات ہیں۔ یہ چاروں اپنی اپنی جگہ مضبوط مخالف ہیں۔ اور تنہا اردگان ان سے چومکھی لڑنے کے ساتھ ملک کو بھی سنبھال رہا ہے، شام کے مہاجرین سے بھی معزز مہمانوں والا سلوک کر رہا ہے اور دنیا بھر کے مظلوم ومحروم مسلمانوں کی مدد کے لیے بھی واحد مسلم رہنما ہے جو کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں ان کی دادرسی کے لیے پہنچ ہی جاتا ہے۔

اردگان بھی انسان ہے۔ آیندہ کسی فتنے میں پڑ سکتا ہے یا ملوث کیا جا سکتا ہے، لہٰذا اس کی مطلق اور کلی حمایت کے بجائے اس پر لگے ہوئے الزامات کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ سب سے مشہور الزام صدارتی محل کا ہے۔ تقریباً تین سال پہلے جب صدارتی محل کی خبر اڑی تو بندہ نے چھوٹتے ہی ترکی کے عربی چینل میں ایک صحافی دوست کو فون کیا: ''یہ کیا قصہ ہے؟'' اس نے کہا:

''یہ محل صدر نے تعمیر نہیں کروایا۔ تعمیر نو کروا کر بحال کیا ہے۔ یہ صدارتی رہائش گاہ نہیں، صدارتی دفتر ہے۔ جس میں تمام سرکاری محکموں کے ذمہ دار یا ان کے نمائندے ایک چھت کے نیچے دستیاب اور اردگان کو براہِ راست جواب دہ ہیں۔ اس میں غلط بات کیا ہے؟ یہ تو اردگان کی کام کی مخصوص رفتار، فوری عمل اور قلیل وقت میں نتائج کے حصول والے مزاج کا طبعی نتیجہ ہے۔ صدر اردگان اس میں ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ ان کے بعد جو اگلا صدر ہوگا وہ اس میں اپنا دفتر بھی بنائے گا اور رہائش گاہ بھی۔''

دوسرا اعتراض اس کے بعض وزراء پر کرپشن کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کرپشن کے الزامات جن

وزراء پر لگے تھے، ان سے فوری استعفیٰ لے کر اس نے عالمی مثال قائم کی ہے۔ کمال کا انصاف یہ ہے کہ سیکولر حکمرانوں نے ورثے میں جو بدترین بدعنوان معاشرہ چھوڑا تھا، اس میں سے اردگان نے تطہیر کا عمل کرتے کرتے یورپ کے ''مردِ بیمار'' کو ''مردِ بحران'' بنا دیا ہے۔ اس کے اس کارنامے پر کرپشن کا اصل حجم اور باقی ماندہ تناسب دیکھے بغیر...... اور اپنا داغ داغ دامن دیکھے بغیر...... یہ کہنا کہ اس نے بدعنوان وزراء کا دفاع کیا ہے، ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر حضرات کو یہ الزام دینا کہ ٹی بی کا مریض اچھا ہو گیا ہے، مگر دن میں ایک آدھ بار مرتبہ کھانستا کیوں ہے؟ خاص کر پاکستانی میڈیا میں ترکی کی موجودہ حکومت کے خلاف اور اس حکومت کو گرانے والوں کے دفاع میں بولنا تو خودکشی والی بات ہے۔ ترکی دنیا کا وہ گنا چنا ملک ہے جہاں پاکستان سے بے پناہ محبت کی جاتی ہے۔ اس کے چشم دید واقعات بندہ اپنے سفرنامے میں لکھ چکا ہے اور یہ تواتر کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ترکی حکومت گرانے کی سنگدلانہ کوششوں کا خطرناک ترین مرحلہ یہ عسکری انقلاب تھا۔ ایسے ناکام معتوبین کے لیے نرم گوشہ رکھ کر خود اپنے واحد دوست سے ہاتھ دھونا کس درجے کی حب الوطنی ہے، اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

رہ گئی گولن صاحب پر لگائے جانے والے الزامات کی حقیقت تو اس سے بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ ایسی اظہر من الشمس ہو گئی ہے کہ ان حضرات کی پہچان بن چکی ہے۔ یہ عاجز تقریباً دو سال قبل (2014ء) میں جنوبی افریقہ کے سفر میں جوہانسبرگ کے قریب تعمیر شدہ عظیم الشان اور مشہورِ زمانہ ترکی مسجد دیکھنے گیا۔ ترک بھائیوں سے بڑے ذوق و شوق سے ملا۔ ترکی کے ٹوٹے پھوٹے دو چار جملے بولے تو وہ بہت خوش ہوئے، لیکن جب ان کو بتایا کہ ترکی تین چار مرتبہ جا چکا ہوں اور ترکی کے تاریخی مقامات اور نادر مخطوطات سے زیادہ فقیر کا موضوع ترکی کی تحریکات ہیں تو ان کا منہ بن گیا۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا غلطی کی ہے؟ بعد میں پتا چلا کہ گولن صاحب

پر وسط ایشیا کے کئی ممالک میں سی آئی اے کا ایجنٹ ہونے کی وجہ سے پابندی لگا کر اسکول بند کر دیے گئے ہیں۔ اب اگر ایسے پس منظر کے حامل شخص پر ترکی میں بھی پابندی لگی اور امریکا اسے اپنے سایۂ شفقت سے نکال کر رخصت کرنے پر مجبور ہوگیا تو یہ مسجد اور ملحقہ ادارہ ان کی پناہ گاہ ہوگا، کیونکہ جنوبی افریقہ اپنے مخصوص قوانین کی بنا پر مجرموں کی دنیاوی جنت ہے۔ اس دن ہمیں سمجھ میں آیا کہ جس کو روس اور کے جی بی کے زیر اثر سات ممالک نے دیس نکالا دیا ہو، اسے امریکا کن خدمات کے صلے میں سایۂ عاطفت فراہم کرتا ہے؟ اور جن کا ضمیر ایسا مجرمانہ ہو کہ تعلیمی فلاحی تحریک کے امام ہو کر دنیا میں ایک کے بعد دوسری پناہ گاہ بنائیں، ان کے خلاف جرائم کی فہرست کی تصدیق کی ضرورت کیوں نہیں رہتی؟ بغاوت کامیاب ہوتی تو عدنان میندرس کی طرح اردگان نے پھانسی چڑھنا تھا...... تب ہم میں سے ایک بھی نہ بولتا...... ناکام ہوئی ہے تو ہم قاتل، باغی اور سازشی عناصر کے تصفیے کے خلاف ہیں کہ کہیں آئندہ ایسی بغاوتوں کا راستہ نہ رک جائے۔ ہم لوگ کیسے لوگ ہیں؟ دور سے پھول تو نہیں برساتے کہ کسی ہمدرد کے قدموں میں نہ گر جائے، البتہ پتھر ضرور لڑھکا دیتے ہیں چاہے اپنا ہی سر پھوٹ جائے۔

یہ کیسی عجیب دنیا ہے؟

آج کی دنیا کیسی عجیب و غریب دنیا ہے۔ تعلیم، تہذیب، ترقی اور اکتشافات کے محیرالعقول سلسلے کے باوجود انسان وہیں کھڑا ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ پتھروں اور غاروں کے سادہ زمانے کو پسماندگی کا طعنہ دینے والا آج کا متکبر انسان اپنی مادّی ترقی کی بدولت پچھلے زمانے کے انسانوں کو تاریک دور کے باسی کہتا ہے، لیکن خود اس کا انسانیت سوز کردار اتنا داغدار ہے کہ یہ اپنے گریبان میں جھانکے تو انسانیت منہ چھپا کر شرماتی نظر آئے۔

ترکی کے معاملے کو دیکھ لیجیے! کون سا جھوٹا سچ ہے جو مصدقہ سچ کے لبادے میں ملفوف کر کے نہیں بولا جارہا اور کون سا اطلاعاتی فریب ہے جو تحقیقاتی رپورٹنگ کے نام پر نہیں پھیلایا جارہا؟ اس تضاد کو دیکھ لیجیے جو بشمول پاکستان دنیا بھر کے میڈیا کے رویے میں ہے۔ ایک طرف کہا جاتا تھا ہمیں طالبانائزیشن والا اسلام نہیں چاہیے۔ علمائے کرام کو اجتہاد کی ضرورت ہے۔

استشراق کے کارخانے میں ڈھلی اسلام کی جدید شکل ہی دنیا کو قابل قبول ہو سکتی ہے۔ ہمیں ترقی چاہیے تو ٹوپی اور حجاب کو خیر باد کہہ کر زمانے کی رفتار کا ساتھ دینا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ ترکی میں جب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زندگی کے ہر شعبے میں مہارت رکھنے والے ٹوٹی پھوٹی اسلامیت کے حامل مسلمانوں نے اپنے ملک کو بے مثال تعمیر و ترقی کی راہ پر ڈالا تو فوراً چولا بدل لیا گیا۔ اسلام پسندوں کی بہتر ہوتی ساکھ برداشت نہ ہوئی۔ کہا جانے لگا: یہ کون سا اسلامی ملک ہے جس میں شراب اور رقص و موسیقی کھلے عام ہے؟ جہاں کی فلمیں اتنی حیاسوز ہوتی ہیں۔ (یہ فلمیں سیکولر دور کی یادگار تھیں جنہیں ہمارے ڈبہ ساز پروڈیوسروں نے "خبث مکرر" کے طور پر "قند مکرر" کے نام سے پیش کیا) جہاں علماء کی بھی پوری داڑھی نہیں ہوتی، وغیرہ وغیرہ۔ یہی طبقہ جو خود کو غیر جانبدار، آزاد خیال اور انصاف پسند کہلواتے نہیں تھکتا۔ اگلی سانس میں زبان اور لہجہ بدل کر یوں بھی کہتا تھا: اردگان خلافت کو واپس کرنا چاہتا ہے۔ اسے سلطان بننے کا شوق ہے۔ وہ جمہوری اختیارات پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ دنیا کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کر کے خلافت کی ذمہ داری کا پرتو پیش کرنا چاہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

موجودہ ناکام بغاوت سے اس طبقے کو جس فضیحت آمیز نامرادی اور تاریخی رُسوائی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد تو حد ہی ہوگئی۔ کون نہیں جانتا کہ اس باغیانہ انقلاب کی تیاری کئی سالوں سے کی جارہی تھی۔ گولنسٹ حضرات جو دنیا بھر میں امریکا نوازی اور اسرائیل پروری کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور ہیں، ان کے افراد کو تعلیمی اداروں نقل کروا کر اور میں شارٹ کٹ ڈگریاں دلوا کر ریاست کے چار ستون کہلائے جانے والے شعبوں میں بے دریغ بھرتی کیا جارہا تھا۔ مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اور میڈیا، چاروں میں پھر خصوصاً فوج اور پولیس میں، گولنسٹ حضرات "کی پوسٹ" سنبھالنے اور پھر اپنی اسلام بیزاری اور مغرب پسندی کے حوالے سے واضح طور پر پہچانے جاتے

تھے۔ان کا وجود اس خفیہ فوج کی طرح تھا جو لکڑی کے گھوڑے میں بند اشارہ ملنے کی منتظر ہو۔ 14 اور 15 جولائی کی رات حکم ملتے ہی چاروں ستونوں میں چھپی یہ فوج حرکت میں آ گئی، کیونکہ اس سے پہلے تمام جمہوری اور غیر جمہوری حربے ناکام ہو چکے تھے۔ بندہ ان دنوں ترکی میں موجود تھا جب گولن حضرات نے اور بڑی بڑی یہودی کمپنیوں نے اسٹاک ایکسچینج سے یک مشت اتنی رقم نکلوائی کہ وہ کریش ہونے کے قریب ہوگئی۔ اس رات بھی یہ عاجز وہاں موجود تھا جب اردگان مخالفین اور ان کے سرپرست سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے کہ اسے اسمبلی میں حکومت بنانے کے لیے درکار چند ووٹ نہ مل پائیں۔ اس فقیر کو وہ وقت بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب تمام اسلام پسند ساری رات وظائف اور دعاؤں میں مشغول رہے کہ کہیں صبح سے پہلے فوج سڑکوں پر نہ آ جائے۔ ان دنوں کی خبریں تو قارئین نے بھی سنی ہوں گی جب وزیر اعظم اردگان اور ان کے بعض وزراء اور بیٹوں پر کرپشن کے الزامات کی رائی کو پہاڑ اور تنکے کو شہتیر بنایا جا رہا تھا۔ وہ تصویریں بھی دیکھنے کو ملی ہیں جن میں صدر اردگان کو عثمانی خلیفہ کے مخصوص لباس میں اور عبداللہ گل کو ''صدر اعظم'' کے روایتی پہناوے میں دکھایا جا رہا تھا تا کہ پوری دنیا ترقی یافتہ اور روشن خیال ترکی کو بھی غیر صلح کن شدت پسند دوست کے روپ میں دیکھ کر متنفر بلکہ متوحش ہو جائے۔ اردگان کے پڑھے گئے شعروں میں غیر مناسب اضافہ بھی شائع کر کے پھیلایا گیا۔ یہ سب ہتھکنڈے ناکام ہونے کے بعد...... اور اردگان کی طرف سے مسلسل مظلومانِ عالم کی حمایت و خدمت اور اس سے باز نہ آنے کے بعد...... آخری حربہ گولن صاحبان کے بھرتی کرائے ہوئے فوجی افسران اور فوج میں موجود عسکری ونگ کی طرف سے مسلح خونریز بغاوت کی شکل میں سامنے آیا۔

مصدقہ ذرائع نے اطلاع دی ہے کہ اردگان نے یہ خبر ملتے ہی پہلے تو وضو کر کے دو رکعت

نماز ادا کی اور پھر ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے پوچھا: مردوں کی طرح صاف صاف بتاؤ۔ ہمارے ساتھ ہو یا غداروں کے ساتھ۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر عہد نبھایا کہ مرتے دم تک آپ کے ساتھ ہوں۔ تب اردگان نے اسے منزل مقصود کے علاوہ کسی اور سمت میں اُڑنے کو کہا۔ جب آدھا راستہ طے ہوگیا تو اس سے صحیح سمت میں جانے اور خطرے کے بیچ میں اترنے کا حکم دیا۔ الغرض! یہ بغاوت جب اس کی جراءت اور حکمت سے دنیا کی تاریخ میں قائد کے ایمان وعزیمت اور عوام میں اس کی مقبولیت ومحبوبیت کی لازوال اور ناقابل فراموش یادگار بن گئی تو وہی لوگ جو ترکی میں اسلام پسندی کی جدید ترین شکل کی ناکامی کا راگ الاپ رہے تھے، فوراً پینترا بدل کر یہ کہنے لگے کہ یہ تو سیکولر گولن اور اسلام پسند اردگان کا ٹکراؤ ہی نہیں، یہ تو اسلام پسندوں کے دو گروپوں کی لڑائی ہے، کیونکہ گولن بھی تو اسکالر اور صوفی ہے۔ فلاحی اور تعلیمی کام کرتا ہے۔ اب کون نہیں جانتا کہ گولن اپنے شیخ اور استاذ بدیع الزمان نورسی صاحب کی تعلیمات سے منحرف ہوچکا ہے۔ خود نورسی جماعت نے اس کو دیس نکالا پہلے دیا ہے، بعد میں اس نے اسلام پسندو ں کی نفرت سے گھبرا کر امریکا میں پناہ لی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس نے دنیا کے مظلوم مسلمانوں کے لیے ایک دھیلے کا فلاحی کام نہیں کیا، البتہ صلیبی متروکہ عمارتوں کو مغربی این جی اوز کو واپس دلوانے کے لیے اس طرح ''آؤٹ آف داوے'' جاتا ہے گویا دنیا کے سب سے بڑے مظلوم یہی ہیں۔ رہ گئے اس تنظیم کے تعلیمی ادارے تو ان مہنگے ترین تعلیمی اداروں کے ذریعے ترکی کی طرح سارے عالم اسلام میں ذہین بچوں کو اس دن کے لیے تیار کیا جاتا ہے جس دن ''چوبی گھوڑے'' سے ''باغی فوج'' کو برآمد ہونے کا اشارہ ملے گا۔ اس فقیر نے جب اپنے مضمون ''سیلرس برگ کا باسی'' میں عندیہ دیا تھا کہ یہ لوگ فری میسن کے لیے کام کرتے ہیں تو مجھے ان کے وکیل کی طرف سے نوٹس ملا کہ ہمارا ایسا کوئی تعلق نہیں، بلکہ پاک ترک اسکولوں کا سرے سے گولنسٹ تحریک سے لاتعلق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اب جب ترک حکومت نے ان سب اداروں کو

(جو پاکستان میں 28 سے زیادہ ہیں، نیز رومی فورم اور پاک ترک بزنس فورم بھی انہی حضرات کی کاوشوں کا پلیٹ فارم ہے) اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا ہے تو نجانے وہ وکیل صاحب کیا سوچ رہے ہوں گے جنہوں نے نہایت بلند بانگ وعدوں کے ساتھ اس فقیر کو عدالت میں گھسیٹنے کا دعویٰ کیا تھا۔

الغرض! یہ عجیب وغریب دنیا ہے جس میں صدق وصفا کے بجائے دجل وفریب کا بازار گرم ہے پھر بھی اسے انسانی تاریخ کا متمدن دور کہا جاتا ہے۔ دو ہفتے سے زیادہ ہوگئے ہیں کہ استنبول کی سڑکوں پر لوگ کسی متوقع خطرے سے حفاظت کے لیے رات کو جاگتے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں۔ معمر عورتیں ڈنڈے اور بیلن لے کر پہرہ دیتی ہیں۔ ملّی ترانے پڑھتے ہیں۔ اردگان کے لیے لکھی گئی عربی میں منظوم دعاؤں پر آمین کے نعرے لگاتے ہیں اور بدلے میں جب اردگان اپنی مشہور زمانہ نظم پڑھتا ہے تو شدت جذبات سے ان کے آنسو نہیں تھمتے۔ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جن وطن فروشوں نے ہم سے ہمارا پرامن نظام چھین لینا چاہا ہم ان کو دوبارہ اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیں گے۔ انہیں عبرتناک سزا دی جائے۔ تقسیم اسکوائر جیسے بدنام زمانہ علاقے میں تسبیحات اور تکبیریں گونج رہی ہیں۔ زمانے کی ٹھکرائی ہوئی خواتین اردگان کے حق میں نعرے لگا رہی ہیں۔ صوفی سالک حضرات کے گروپ بھی وہاں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ حب الوطنی اور شعائر اسلام سے لگاؤ کے ایسے مناظر ہیں کہ انسان سے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت ترکی میں مصر کی تاریخ نہ دہرائے جانے پر غمگین حضرات کی چک پھیریاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ترکی کے نیم دین دار مسلمان ہوں یا شام کے مہاجر، سب جھولیاں پھیلا کر اردگان کے لیے آسمان والے سے خیر مانگ رہے ہیں، لیکن ہمارا لبرل میڈیا اور سیکولر صحافی جو یہاں دہشت گردی کی مذمت کرتے نہیں تھکتا، وہاں مسلح دہشت گردی کر کے ''جمہوریت'' جیسی چیز جو ان کے نزدیک مقدس ترین ہے، کے قاتلوں کو معصوم بتاتے نہیں شرماتا۔

قارئین محترم! یہ کیسی دنیا ہے جہاں جمہوری اقدار کی ترویج کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا، لیکن جب جمہور عوام اپنے قائد کے گرد جمع ہو گئے تو جمہوریت پسندوں کو جمہوریت خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ یہ کیسی دنیا ہے قارئین کرام! جہاں عوام عوام کی رٹ لگائی جاتی ہے، لیکن عوام اپنے حقوق غصب کرنے والوں کا احتساب کرے تو انہیں ناٹو سے نکالنے اور یورپی یونین میں شمولیت سے روکنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ جہاں وطن کی خاطر جان دینے والوں سے تمغوں کا وعدہ اور غداری کرنے والوں سے آہنی ہاتھ سے نمٹنے کی روایت قائم کی جاتی ہے، لیکن جب اردگان کی کال ریسیو کرنے والا فون لاکھوں کروڑوں میں نیلام ہو یا لوگ قائد کی پکار پر ٹینکوں کے سامنے لیٹ جائیں تو حق کا بول بالا کرنے والے صحافی نما ماہر اسکرپٹ نویس اسے ''ڈرامہ'' کہتے ہیں۔ اور جب مقررہ وقت پر گولن نواز فوجی بیرکوں سے نکل آئیں، صحافی انقلاب کی کامیابی کے شور سے آسمان سر پر اُٹھالیں، اور عوام سربراہان افواج کے ہاتھ پشت پر باندھ دیں تو ان سربراہوں کی پشت پر موجود پراسرار سربراہ کی بے گناہی کا ڈھول اس زور سے پیٹا جائے کہ وہ تھوڑی بہت محبت اور تشکر آمیز تعلق بھی ختم ہو جائے جو پاکستان کے اکابر علمائے کرام کے مبارکبادی کے خطوط ترکی بھیجے جانے سے پیدا ہوا ہے۔ کیا یہ ملک کی خدمت ہے؟ کیا یہ ملت کی خیر خواہی ہے؟ کیا یہی آزادی رائے ہے؟ کیا یہی سچ اور حق پر مبنی صحافت ہے؟ کیسی عجیب دنیا ہے قارئین محترم! یہ کیسی عجیب دنیا ہے؟

ہم نہیں تو ہماری نسلیں

آپ دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈال لیجیے! آپ کو پاکستان کی اہمیت کا احساس ہو جائے گا۔ آپ عالم اسلام کا نقشہ سامنے رکھ لیجیے، آپ اگر احساس کمتری کا شکار ہیں تو وہ دور ہو جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ آپ نے طبعی، سیاسی اور تاریخی جغرافیہ کی کم از کم مبادیات پڑھ رکھی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے جب امت محمدیہ کو پورے عالم تک ہدایت کی دعوت پہنچانے کی ذمہ داری دی تو اس کے وسائل بھی روزِ اول سے مہیا فرما دیے۔ ''امت وسط'' کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے وسط میں ''جزیرہ نمائے عرب'' میں آباد کیا۔ جو روحانیت کا مرکز ہونے کے ساتھ جغرافیائی اعتبار سے بھی تین بڑے براعظموں کے بالکل بیچ میں واقع ہے اور بقیہ تین یا چار براعظموں کی طرف جانے والے راستے یہیں سے ہو کر جاتے ہیں۔

اس وقت عالم اسلام کے تین ملک ایک سیدھ میں آتے ہیں اور تینوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی

خصوصیات عطا کی ہیں کہ اگر یہ تینوں اکٹھے ہو جائیں تو یہ تکون مل کر نہ صرف عالم اسلام کو مغلوبیت ومحکومیت سے نجات دلوا سکتی ہے، بلکہ پوری دنیا کے لیے ہدایت ورحمت کا پیغام بن سکتی ہے۔ یہ ایک اور خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر دور کی طرح اس دور میں بھی مسلمانوں کو...... میں دہراتا ہوں: صرف مسلمانوں کو..... عطا کی ہے۔

سعودی عرب، پاکستان اور ترکی وہ تین ملک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز اور بے مثال خصوصیات سے نوازا ہے۔ آپ انہیں ایک اعتبار سے عالم اسلام کا دل، دماغ اور جگر کہہ سکتے ہیں۔ سعودی عرب تو ہے ہی عالم اسلام کا قلب، جہاں اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین جیسے مقدس مقامات ازل سے تعیین کر دیے تھے۔ مذہبی کے بعد اس کی جغرافیائی، معاشی اور سیاسی اہمیت بھی محتاج بیان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو عالم غیب السمٰوات والارض ہے، یہاں زمین کے نیچے اتنے خزانے رکھے ہیں کہ زمین کے اوپر بسنے والے ان خزانوں سے استفادہ کر کے پوری دنیا کے لیے خیر ورحمت کا پیغام بھی بن سکتے ہیں اور اسے امن وسلامتی سے بھی نواز سکتے ہیں۔

پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بے پناہ صلاحیتوں کی مالک افرادی قوت عطا کی ہے، بلکہ اسے دنیا کا بہترین ساحل، دنیا کی چند بہترین اجناس اگانے والی زرخیز زمین بھی عطا کی ہے۔ گوناگوں جغرافیائی وسیاسی خصوصیتوں کے حامل اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بہترین دماغی اور جسمانی قوتیں عطا کی ہیں۔ یہ دنیا کی بہترین فوج اور ایسے سائنس دان رکھتا ہے جنہوں نے نہ صرف اسے ایٹمی طاقت بنا دیا ہے، بلکہ ایسے ایسے راکٹ اور میزائل بنانے کی خود کفیل صلاحیت عطا کی ہے جس کی حقیقت وہی عالمی قوتیں جانتی ہیں جو اسے ہر وقت بحرانوں میں مبتلا کیے رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ترکی نہ صرف ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے (جیسا کہ سعودی عرب ایشیا، یورپ اور

افریقہ تینوں کے سنگم پر واقع ہے) بلکہ وہ پسماندگی اور بدنظمی کا طویل دور گزار کر ایسی معاشی، سیاسی اور عسکری قوت بن کر ابھرا ہے جس کی مثال عہد جدید میں کم ہی ملتی ہے۔ پاکستان میں علم و ہنر دونوں اعتبار سے بہترین افرادی قوت ہے جو اپنے طور سے دنیا بھر میں اپنا لوہا منوا چکی ہے، لیکن اسے سرکاری اور اجتماعی طور پر منظم طریقے سے صحیح استعمال نہیں کیا جا رہا۔ ترکی میں بھی تعلیم یافتہ اور ہنرمند آبادی کی کثرت ہے، بس اتنا فرق ہے کہ انہوں نے اسے منظم طریقے سے استعمال کیا ہے اور یورپ میں کم ہی کسی چیز کی منڈی ہوگی جس میں ترکی مصنوعات سرفہرست نظر نہ آتی ہوں۔ دوسرا فرق پاکستان اور ترکی میں قیادت کا ہے۔ ترکی میں نرگس سو سال تک اپنی بے نوری پر روتی رہی تب جا کر ان کے چمن میں ایسا دیدہ ور پیدا ہوا ہے کہ دنیا میں پسماندہ لوگوں کو امن سے نہ رہنے دینے والی قوتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے، جبکہ غریبوں، مظلوموں اور پسے ہوئے لوگوں کی آنکھ کا تارا بن چکا ہے۔

آپ دنیا کے نقشے پر نظر ڈال لیجیے۔ یورپ ایشیا کے سنگم پر ترکی، ایشیا افریقہ کے بیچ میں سعودی عرب اور درۂ ہرمز کے نکڑ پر بحیرۂ عرب کے کنارے اور بحر ہند کی پیشانی پر پاکستان چمکتے دمکتے نظر آئیں گے۔ دولت، طاقت اور صلاحیت یا یوں کہہ لیں کہ معیشت، عسکریت اور سیاست میں، یہ ایسی مثلث ہے جو گہرے تاریخی، مذہبی اور روحانی رشتوں میں جڑی ہوئی ہے۔ ایسے میں آپ کو جس خودی اور خود اعتماد کا احساس ہو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس بے مثال اور لازوال نعمت کا شکر یہ ہے کہ اسے دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرنا بلکہ جب تک اپنا چاہیے۔ ضرور بالضرور ایسے گل و گلزار ظہور میں آئیں گے جنہیں ہم نہیں تو ہماری اگلی نسلیں ضرور دیکھیں گی۔

عالمی لکیر کے تین نقاط

آج کل ایک جملہ ہر ایک کی زبان پر ہے، حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا سبب وسائل کی کمی ہے۔ اگر وسائل وافر ہوتے تو یہ مسائل نہ ہوتے جو آج ہر طرف منہ کھولے مسلمانوں کو ہراساں کیے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اتنے وسائل سے نوازا ہے کہ اس کی مثال دنیا کی دوسری قوموں میں مفقود ہے، لیکن ہماری بے تدبیری کے سبب وسائل کی فراوانی مسائل میں اضافے کا ذریعہ تو ہے، لیکن مسائل کو حل کرنے میں مدد نہیں دے رہی۔

مثلاً دنیا کے چھ سمندری درّوں کو لے لیجیے۔ ان میں سے پانچ قدرتی ہیں اور ایک مصنوعی ہے یعنی انسانی ہاتھوں کا تعمیر کردہ۔ یہ بحری گزرگاہیں دنیا کے ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک، تجارت اور نقل وحمل کی کنجیاں ہیں اور یہ وہ تنگ دروازے ہیں جن سے گزرے بغیر دنیا کی

بحری شاہراہوں سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے تین عرب ممالک کے پاس ہیں اور دو ترکی کے پاس۔ (چھٹا درہ مراکش میں آتا ہے) ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو ایسا محل وقوع دیا ہے کہ وہ گویا ان میں سے اہم ترین درّے کے سامنے ناکے پر براجمان ہے اور دنیا کی اہم ترین بحری شاہراہ کا گویا نگہبان ہے کہ اللہ نے اس عالمی شاہراہ پر تصرف کا اختیار اسے تفویض کر دیا ہے۔ اس درّے کا نام ''درّہ ہرمز'' ہے جو خلیج عرب اور بحر ہند کو ملاتا ہے۔ دوسرا ''باب المندب'' ہے جو بحیرۂ عرب اور بحر احمر کو ملاتا ہے۔ تیسری ''نہر سوئز'' ہے جو بحر احمر کو بحر ابیض سے جوڑتی ہے۔ یہ تینوں اہم ترین سمندری ناکے عرب ممالک کے قبضے میں ہیں، جبکہ بحر اسود کو بحیرۂ مرمرہ سے ملانے والی ''آبنائے باسفورس'' اور بحیرۂ مرمرہ کو بحر ایجین سے جوڑنے والا ''درّۂ دانیال'' دونوں ترکی کے پاس ہیں۔ یہ وہ اہم جغرافیائی حقائق ہیں جن سے عالمی مناظر نامے پر ان تینوں ممالک کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ یورپ سے مشرق وسطیٰ تک اور مشرق وسطیٰ سے ایشیا تک یہ ایک قدرتی لکیر ہے جس کے ایک سرے پر ترکی ہے، دوسرے پر پاکستان اور بیچ میں سعودی عرب، اس لکیر کے تین نقطوں کو مسلسل داخلی بحران میں مبتلا رکھنا اور ایک دوسرے کا دست و بازو نہ بننے دینا عالمی طاقتوں کی وہ حکمت عملی ہے جس کو وہ ہر قیمت پر جاری رکھنا چاہتی ہیں۔

پاکستان کے داخلی مسائل، عدم استحکام اور پاکستانی عوام کو ہر وقت یہ تاثر دینا کہ وہ خدانخواستہ ناکام ریاست کے مایوس باشندے ہیں، اسی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ سعودی عرب کو اس کے مشرق و جنوب مغرب میں واقع ممالک کے ذریعے مسلسل ہراساں کرتے رہنا بھی اسی منصوبے کا شاخسانہ ہے اور ترکی میں آنے والا حالیہ انقلاب بھی اسی تزویراتی تدبیر کا جز تھا جس کی ناکامی کے بعد اب بند کمروں میں ہونے والی سوچ بچار کا موضوع یہ ہے کہ اس قدرتی عالمی خطہ پر واقع اہم ترین ممالک کو...... جو بہترین انسانی اور ارضی وسائل کے حامل ہیں...... کس

طرح جشن فتح منانے کے بجائے گریہ وماتم میں مبتلا کیا جائے۔

فوجی انقلاب کو عوامی مقبولیت کے بل بوتے پر تھوڑی ہی دیر میں ناکام بنانے کی ایک مثال ماضی قریب میں ملتی ہے جو لاطینی امریکا کے پسماندہ لوگوں کی نمائندہ آواز، وینزویلا کے مقبول ترین عوامی قائد ''ہیوگوشاویز'' سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے عالمی معاشی طاقتوں کے ایما پر آنے والے عسکری انقلاب کو اپنی جراءت وفراست اور عوامی حمایت کے بل بوتے پر ایک ہی رات میں ناکام کردیا تھا اور ابھی ان قوتوں نے جو اپنے ہرکاروں کے کارنامے پر جشن منانے کے لیے پر تول رہی تھیں، کھل کر فتح کے جام لنڈھائے بھی نہ تھے کہ انہیں خفت آمیز شکست ومایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان کا اگلا قدم کیا تھا؟ جس کی وجہ سے آج ہیوگوشاویز کے بعد اس کا تیل کے ذخائر سے بھرا ملک پھر سے اندھیریوں میں ڈوب گیا ہے اور اب وہاں کوئی طاقت ور مزاحمتی آواز سنائی نہیں دیتی؟ ہیوگوشاویز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مصنوعی شعاعوں کے ذریعے پیدا کیے گئے کینسر کے ذریعے اس کی جان لے لی گئی۔ اسے محض وہم سمجھا جاسکتا تھا، اگر جنوبی امریکا کے چند دوسرے ممالک کے سربراہوں کے ساتھ بھی ایسا نہ ہوا ہوتا۔ پھر ہیوگوشاویز سے کوتاہی یہ ہوئی کہ اپنے عوام کی ذہنی تطہیر نہ کرسکا، نہ ہی اپنے پیچھے قیادت کا تسلسل قائم کرسکا۔ اسے ایسے مسائل میں الجھادیا گیا جن سے نبردآزما ہوتے ہوئے اس کی توانائیاں کھپ گئیں اور وہ ایسے افراد تیار نہ کرسکا جو حب الوطنی اور انسانیت دوستی کے تحت عالمی معاشی تسلط کاروں کے خلاف اٹھایا گیا جھنڈا اسنبھال لیتے۔

اردگان کو بھی اب ایسے ہی مسائل کا سامنا رہے گا۔ خبر آئی تھی کہ زرمبادلہ کے ذخائر کم ہورہے ہیں۔ ترکی عوام نے قطار میں لگ کر ڈالر جمع کرائے اور لیرے (ترک کرنسی) لے لیے۔ نتیجہ میں نہ صرف اربوں ڈالر کے ذخائر جمع ہوگئے، بلکہ لیرا مزید مستحکم ہوگیا ہے۔

خبر آئی تھی کہ شام کی سرحد پر جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روسی جہاز مار گرانے میں گولن نواز کا عناصر کا ہاتھ تھا۔ ترکی کے ایک طرف روس واقع ہے، دوسری طرف یورپ۔ اردگان اس تنازعے میں زیادہ پھنستا تو دونوں کے درمیان سینڈوچ بن جاتا۔ اس نے بغاوت پر قابو پانے کے بعد پہلا بیرونی دورہ ہی روس کا رکھا اور اس دورے میں روسی صدر کے سامنے جو پہلی فائل میز پر رکھی وہ شام کی تھی۔ تاکہ شام کے عوام کو بھی بیرونی امداد سے ہونے والی کارروائیوں سے نجات ملے اور پڑوسیوں سے سابقہ تعلقات بحال ہوں، کشیدگی کم ہو تو بحیرا اسود سے بحرابیض تک رکی ہوئی تجارتی و معاشی سرگرمیاں بھی بحال ہو جائیں۔ اردگان اپنی قوم کو شخصیت پرستی کے بجائے نظریہ سازی پر لانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ ریکارڈ ساز اجتماع میں دنیا نے اردگان کی تصویر کے بجائے ترکی کے جھنڈے کو ہر طرف لہراتے دیکھا جو فرد کے بجائے نظریے کو پروان چڑھانے کی بہترین مثال ہے۔

ہیوگوشاویز کے بعد مغرب کا تسلطی طریقہ کار سمجھ کر اس کے اداروں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے والے نہ رہے تھے، لیکن کیا اردگان اس کوتاہی کا ازالہ کر سکے گا؟ کیا ترکی کے تعلیمی ادارے کمال اتاترک کی طرح اردگان کی تصویر کے سامنے اسمبلی کرواتے رہیں گے یا نئے اردگان تیار کر کے ترکی اور عالم اسلام اور دنیا کے مظلوم عوام کو دے سکیں گے؟ یہ آنے والا وقت بتائے گا کہ وسائل سے مالا مال، لیکن گولنسٹ طریق کار میں جکڑی اس عالمی قدرتی لکیر اور اس میں واقع تین اہم نقاط کا مستقبل کیا ہوتا ہے؟ کیا ہم گولن نواز قوتوں کو اور ان کے علمی و فلاحی منصوبوں کے مقاصد کو سمجھ سکیں گے یا اردگان کی خامیاں ہی گنتے رہ جائیں گے؟

چند خوبصورت مماثلتیں

آج کل جدید ترکی میں آپ جس طرف بھی جائیں، وقفے وقفے سے کسی نہ کسی چیز سے اندازہ ہوگا کہ یہاں کی حکمران جماعت اور اس کے ارکان کس قدر حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہیں اور دعوت کا کام ''الحکمة'' اور ''الموعظة'' کے اصول کے مطابق کرتے ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے ہوٹلوں میں آپ کو دو نقشے نظر آئیں گے۔ ایک میں سلطان فاتح اپنا گھوڑا سمندر میں ڈالے ہوئے ہے۔ سامنے قسطنطنیہ کا بظاہر نا قابل تسخیر سمجھا جانے والا قلعہ ہے۔ سمندر کا پانی گھوڑے کے سینے تک آ پہنچا ہے اور اس کے کمانڈر دائیں بائیں حیران کھڑے ہیں کہ اسے کس طرح روکا جائے۔ نیچے سلطان فاتح کا یہ جملہ ہے:

''آج یا میں قسطنطنیہ کو فتح کر کے رہوں گا یا پھر قسطنطنیہ مجھے فتح کرے گا۔''

تاریخ گواہ ہے کہ انسان کا عزم جب اس حد تک پہنچ جائے تو پھر ناممکن بھی ممکن ہو جاتا

ہے۔ یا تو کوئی تکوینی حکمت اس کا ساتھ دیتی ہے یا ایسا کوئی القاء ہوتا ہے جسے عام دنیا محیر العقول قرار دیتی ہے۔ وہ القاء دوسری تصویر میں دکھایا گیا ہے جس میں ایک بہت بڑی کشتی کو عثمانی مجاہدین خشکی پر کھینچ کر لے جا رہے ہیں۔ قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے سلطان فاتح کے دنیا کی جنگی تاریخ کا وہ محیر العقول فیصلہ کیا تھا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی یورپی مؤرخین اور ہمارے اینکر پرسن گھبراتے ہیں کہ کہیں احساس کمتری کے شکار مسلم نوجوان کی حوصلہ افزائی نہ ہو جائے۔ دس میل خشک زمین پر جو چھوٹی چھوٹی اونچی نیچی پہاڑیوں پر مشتمل تھا، جنگی کشتیاں چلا کر لے جانا ہی اتنا مشکل نہیں، جتنا ایک رات میں ایسا کرنا۔ 21 سالہ نوجوان سلطان نے یہ کارنامہ یوں انجام دیا کہ دس میل کی پیائش کر کے لکڑی کے تختے بنوائے۔ ان پر چربی ملوائی۔ پھر ستر جہاز نما کشتیوں کو ان تختوں پر چڑھایا۔ ہر کشتی پر دو ملاح سوار تھے اور دائیں بائیں سے ان کو مجاہدین کھینچ رہے تھے۔ ہوا کی مدد لینے کے لیے بادبان بھی کھول دیے گئے تھے۔ دس میل کی پہاڑی مسافت، گھپ اندھیرا، صرف ایک رات کی مہلت جنگی جہاز نما بڑی بڑی کشتیوں کو ہاتھوں سے کھینچنا اور ایک رات میں ستر کشتیاں بمع بھاری توپ خانہ فجر سے پہلے دشمن کے علاقے میں پہنچانا...... اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر مشکل مہم تھی۔ سلطان فاتح نے اللہ کے فضل سے یہ کارنامہ کر دکھایا اور 15 جمادی الاولی 857ھ بمطابق 24 مئی 1453ء کو قسطنطنیہ سمندر کی طرف سے گھیر لینے کے پانچ دن بعد 20 جمادی الاولیٰ 857ھ بمطابق 29 مئی 1453ء کو آخری معرکہ لڑا گیا۔ بیچ کے پانچ دن صلح کی کوششیں کی گئیں۔ کامیاب نہ ہونے پر فیصلہ کن حملے کا ارادہ کیا گیا۔ ظہر تک آگ اور خون کی برسات سے گزر کر بالآخر عثمانی مجاہدین فصیل پر چڑھ کر سرخ ہلالی پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گئے۔ (یاد رہے پاکستان کا پرچم سبز ہلالی ہے اور ترکی کا سرخ ہلالی...... کیا یہ خوبصورت مماثلت محض اتفاق ہے۔)

اس دن سلطان محمد نے ظہر کی نماز آیا صوفیا میں پڑھی اور پہلی مرتبہ اس مرکز شرک وکفر میں توحید کی زمزمہ بار صدا گونجی۔ تاریخ نے سلطان محمد کو سلطان محمد فاتح کا لقب دیا۔ انسان کا کردار اس کے نظریات کے تابع ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا...... جسے ہمارے بعض کالم نگار حضرات سیکولر کہنے پر ناراض ہوتے ہیں...... نے اقتدار میں آتے ہی (1934ء) مغرب کی خوشنودی کے لیے یہاں اذان ونماز موقوف کر کے سیاحوں کی تفریح کا مرکز بنادیا تھا۔ اردگان حکومت نے بہت تدریج اور حکمت سے کام کیا۔ فتح قسطنطنیہ کے واقعے کو ترک قوم کے ذہن میں زندہ کرنے کے لیے اس واقعے کو تمثیلی یادگار کی شکل میں پیش کرنے کے لیے استنبول میں عظیم انسانی پینو راما تعمیر کروایا گیا۔ جس میں آنے والے سیاح کو دنیا کی معروف زبانوں میں اس واقعے کی حقیقت کے قریب تر منظر کشی کر کے بتائی جاتی تھی۔ راقم الحروف اس پینو راما کے دورے کی روئیداد اپنے سفرنامے ''ترک نادان سے ترک دانا تک'' میں لکھ چکا ہے۔ 1991ء میں آیا صوفیا کو تو نہ چھیڑا گیا۔ البتہ اس کے ساتھ جڑے ہونکار نامی محل میں مسجد بنا کر اس کے دروازے آیا صوفیا کے لیے کھول دیے گئے۔ 2014ء میں ترکی میں ایک زبردست تحریک چلی جس کا عنوان تھا: ''اپنے مصلے لے کر آیا صوفیہ پہنچو۔'' 15 ملین سے زائد لوگوں نے دستخط کر کے یہ مطالبہ کیا کہ آیا صوفیہ کو نماز کے لیے کھولا جائے۔ ترکی کے مرد آہن، مرد مؤمن رجب طیب اردگان نے چند سال قبل اس تاریخی واقعے کی یادگار منانی شروع کی۔ ہر سال 29 مئی کو یہاں عظیم الشان تقریب منعقد کی جاتی تھی جس سے اردگان خود خطاب کرتا تھا اور اس میں والہانہ انداز میں سورۂ فتح کی ابتدائی آیات تلاوت کرتا تھا۔

پچھلے سال اس کی فتح کے تاریخی موقعے پر یہاں ایک مؤذن صاحب نے آٹھ دہائیوں کے بعد پہلی مرتبہ اذان دی۔ اذان کے دوران ان کے آنسو بہتے رہے اور انہوں نے رقت بھری

آواز میں آنسو سے تر کلمات شہادت گلوگیر انداز میں ادا کیے۔ گزشتہ جمعہ (21 اکتوبر 2016ء) کو بالآخر یہاں پانچ وقتہ اذان اور نماز شروع کر دی گئی ہے اور اللہ کے ایک گھر کو اس کے نام سے دوبارہ آباد کر دیا گیا ہے۔ ''حق آیا اور باطل چلا گیا۔ بے شک باطل جانے ہی کے لیے ہے۔''

یہاں چند مماثلتوں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔

1- آیا صوفیہ کی آخری تعمیر بازنطینی دور میں 1346ء میں ہوئی۔ 1453ء میں سلطان فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو رات اس نے دعاؤں اور وظائف کے بعد اعلان کر دیا تھا کہ ان شاء اللہ ہم کل ظہر کی نماز آیا صوفیہ میں پڑھیں گے۔ 1453ء سے لے کر 1935ء یعنی تقریباً 481 سال تک یہاں مسلمان اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے رہے۔ 1934ء میں ''ترک ناداں'' نے جو پابندی لگائی تھی، آخر اللہ کے فضل سے 2016ء میں ''ترک دانا'' نے انتہائی حکمت کے ساتھ بتدریج ختم کر کے پھر چاروں مینار سے صدائے تکبیر بلند کر دی ہے۔ اللہ نے جو جگہ جس مقصد کے لیے فتح کرنے والوں کو عطا کی تھی، اس مقصد کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ آیا صوفیہ کی فتح ثانی ہے۔ فاتحین اولین کے لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری سنائی تھی۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فتح ثانی کا کارنامہ انجام دینے والوں کے لیے اس خوشخبری میں سے کوئی حصہ ان شاء اللہ ضرور ملے گا۔

2- سلطان فاتح نے جس باسفورس کے کنارے خشکی میں کشتیاں چلا کر کارنامہ انجام دیا تھا۔ اردگان کے حامیوں نے اسی باسفورس پل پر گولنسٹ باغیوں کے ٹینکوں کے سامنے لیٹ کر تاریخ رقم کی۔ بالآخر اسلام پسند اپنے نہتے وجود سے باغی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ اور اسی باسفورس پر باغیوں کے ہاتھ باندھ کر انہیں بے بس کیا گیا۔

3- ایک اور خوبصورت اور معنی خیز مماثلت اس فتح ثانی میں یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین

ایوبی کو بیت المقدس کی دوسری فتح (پہلی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مبارک زمانہ میں ہوئی تھی) 90 سال بعد نصیب ہوئی تھی۔ اسی طرح آیا صوفیہ کی دوسری فتح تقریبا 81 سال بعد ہوئی ہے۔ ایوبی کا ہدف نہایت مشکل تھا، اردگان کا نسبتاً کم مشکل، لہٰذا اسے دس سال کم لگے۔ آج کے دور میں رنج وغم کے مارے مسلمانوں کو اللہ سے تعلق کی مضبوط بنیادوں پر تجدید کرنی چاہیے، کیونکہ اس جیسے مماثلانہ واقعات سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں پر ہمارے حق میں فیصلے کرنے کو آج بھی راضی ہے، بشرطیکہ ہم اس کے فیصلوں کو اپنے حق میں کروانے والے اعمال میں جڑ جائیں۔

کچھ لوگوں کو خوشی کے اس موقع پر اندیشہ ہوگا کہ مغرب اب ہم سے انتقام لے گا۔ انہیں اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ مغرب نے آج تک کب ہمیں بخشا؟؟ ہم نے اسی سال سے زیادہ عرصے تک آیا صوفیہ میں نماز نہ پڑھی تو کیا انہوں نے ہمیں جامع قرطبہ واپس کر دیا؟ سلطان صلاح الدین ایوبی نے مفتوح صلیبیوں پر بے مثال رحم وکرم کیا۔ کیا اس کے بدلے انہوں نے مشرقی تیمور کے مسلمانوں کو بخش دیا؟ اردگان سے انہوں نے جیسا انتقام لینا تھا وہ تو آیا صوفیہ ہو یا نہ ہو، انہوں نے لے ہی لیا۔ آیندہ بھی اس کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ ہمیں اس پر اطمینان رکھنا چاہیے کہ ہم نے خدا کی امانت اس کے سپرد کر دی ہے۔ اب خدا خود اپنے دشمنوں سے نمٹے گا۔

آج کا انسان

کہا یہ جاتا ہے کہ آج کی دنیا انتہائی ترقی یافتہ، متمدن اور مہذب ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے مذاہب کا انکار کر کے انسانیت کو سب سے بڑا مذہب قرار دے دیا ہے۔ مذاہب سے چونکہ جنگ ہوتی ہے، اس لیے مذہب کی بجائے انسانیت کو قانون عالم قرار دینے سے دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔

یہ دونوں باتیں جھوٹ کا پلندہ ہیں جن میں مکروفریب اور دھوکہ ودھاندلی کی اتنی زیادہ آمیزش ہے کہ اس کے تعفن سے انسان کا دماغ کام چھوڑ جاتا ہے۔ آج کی دنیا تو ''تاریک دور'' کہلائے جانے والے زمانے سے زیادہ وحشی اور غیر مہذب ہے۔ مادّیت پرستی اور روحانی واخلاقی اقدار کی پامالی نے انسان کو درندہ اور انسانیت کو حیوانیت کا عنوان بنا دیا ہے۔ اب یہ الفاظ دھوکے کا جال ہیں جن میں پڑھے لکھے انسانوں کی پڑھی لکھی عقلوں کو مسخ کر کے قابو کیا جاتا ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جب مشرکین مکہ کے ظلم اور ایذا رسانی سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تو اس وقت مسلمانوں اور حبشہ کے درمیان مہاجرین کو پناہ دینے کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ عرب ایشیا میں تھا اور حبشہ افریقہ میں۔ دونوں کی زبان، نسل، تہذیب وغیرہ سب جدا تھی۔ حبشہ کالے لوگوں کا تاریک دیس سمجھا جاتا تھا، لیکن اس وقت کے بادشاہ نجاشی نے نہ صرف لٹے پٹے مہاجرین مکہ کو اپنے ہاں پناہ دی، بلکہ قریش کے وفد کو ان کے لائے ہوئے تحائف سمیت واپس کر دیا کہ مظلوموں کے تبادلے کے عوض تحائف لینا انسانیت کے خلاف ہے۔ اصل انسانیت یہ ہے کہ بے گھر و لاچار مظلوم انسان پر اپنے پاس سے خرچ کیا جائے، اور تحائف دے کر رخصت کیا جائے۔ آج کل یورپ گورے لوگوں کا اجلا دیس ہے۔ وہ ان تمام معاہدوں میں شامل ہے جو مسلمانوں کو یاد دلا دلا کر اقوام متحدہ کے رعب میں لانے کا کام دیتے ہیں، لیکن وہ ان معاہدوں کو بھول جاتا ہے جو انسانیت کی بنا پر اس پر لازم ہوتے ہیں۔ شام میں جب متشدد اور انتہا پسند حکمرانوں نے اپنے عوام کو مذہب کے فرق کی بنیاد پر دنیا کے بدترین ظلم کا نشانہ بنانا شروع کیا تو نہ صرف ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے کوئی بین الاقوامی یا انسانی قانون حرکت میں نہیں آیا، بلکہ اپنی جان بچا کر نکلنے والے مہاجرین کو پناہ دینے سے بھی صاف انکار کر دیا گیا۔ اس حوالے سے ایسے ایسے انسانیت سوز واقعات پیش آئے کہ انسانیت کو منہ چھپانے کی جگہ ڈھونڈنے سے نہیں مل رہی اور ترقی یافتہ دور کا انسان تاریک دور کے انسان سے بھی زیادہ سنگدل، بے رحم اور ظالم نظر آنے لگا ہے۔

کبھی تو خواتین سرحدوں پر لگی خاردار تاروں کے نیچے سے گزرتی اور کبھی ان کے اوپر سے اپنے بچوں کو دوسری طرف پکڑتی پائی گئیں۔ کبھی مہاجرین کی کشتیاں الٹنے سے معصوم بچوں کی لب ساحل فریاد کرتی لاشوں نے ایسے کربناک مناظر تشکیل دیے کہ انسان کا دل ٹکڑے ٹکڑے

ہوجاتا ہے۔ سب مواقع پر نہ تو عرب قومیت کی بات کرنے والوں کا ضمیر جاگا اور نہ گورے لوگوں کے کالا من کو جھنجھوڑا جاسکا کہ اس انسانیت کے نام پر رحم دلی کا مظاہرہ کریں جس کا نعرہ لگا کر وہ اسلامیت کی نفی کی مہم چلاتے ہیں۔ لے دے کے یہ اردوگان تھا جسے اللہ نے شامی مسلمانوں کے لیے فرشتۂ رحمت بنادیا۔ اس نے ترکی کے دروازے مہاجرین کے لیے چوپٹ کھول دیے اور ان کو نہ صرف پناہ دی، بلکہ ان کے قیام وطعام کے علاوہ ان کی جدید تعلیم اور فنی تربیت کا بھی ایسا انتظام کیا کہ وہ جب اپنے گھروں کو واپس جائیں تو انہیں محسوس ہو کہ وہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوئے ہیں۔ ترکی اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ مہاجرین کی خدمت کرنے والا ملک ہے، حالانکہ اسے بہت سے اندرونی اور بیرونی مسائل کا سامنا ہے۔ کردوں کی عسکری بغاوت سے لے کر گولنسٹ حضرات کی فوجی بغاوت تک، دھماکوں کے منصوبوں سے لے کر باغیوں کی در پردہ حمایت تک، گھمبیر مسائل کی فہرست ہے جن میں ترکی کو گھیرنے کی کوشش کی گئی، لیکن مجال ہے کہ ان سہولتوں کے معیار میں کوئی فرق آیا ہو جو ترکی مہاجرین کو فراہم کر رہا ہے۔ ترکی کے ایک شہر کیلیس کو تو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی مقامی آبادی کم ہے، اور مہاجرین کی آبادی ان سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ترک عوام اس سے گھبراتے نہیں، اس پر فخر کرتے ہیں۔

سچ ہے انسانی اخلاقیات کی سب سے بڑی داعی اور مربّی روحانی تعلیمات ہیں۔ انسانیت اگر کوئی سکھاتا ہے تو وہ مذہب ہے۔ اور حقیقی انسانیت اگر کوئی سکھاتا ہے تو وہ اسلام نامی مذہب ہے۔ مذہب کی نفی پر جو تہذیبیں قائم ہوتی ہیں وہ انسانیت کش تو ہو سکتی ہیں، انسانیت نواز ہرگز نہیں۔

پاک ترک دوستی زندہ باد!

پاک ترک دوستی کی بنیادیں تو اسی دن رکھی جا چکی تھیں جب پہلے مسلمان نے برصغیر کی سوہنی دھرتی پر قدم رکھا تھا اور جب پہلے عثمانی خلیفہ نے بیعت لی تھی۔ پھر پاک ترک دوستی کی بنیادیں اس دن مضبوط ہوگئی تھیں جب برصغیر پاک ہند کے علماء نے آخری عثمانی خلیفہ کی حمایت میں پہلی آواز اٹھائی تھی، پہلا روپیہ جنگ عظیم دوم کے چندہ میں ترکی بھیجا تھا اور پہلا بندہ جنگ بلقان میں شرکت کے لیے روانہ کیا تھا، لیکن ان بنیادوں کو مستحکم اردگان صاحب کے موجودہ دورے سے پہلے کیے جانے والے اس فیصلے نے کیا ہے جس کے تحت پاک ترک اسکول کی انتظامیہ کو تبدیل کر کے گولن صاحب کے پیروکاروں کے بجائے ان دیانت دار ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے جو مغرب سے عطیات کی وصولی میں ملوث نہیں، نہ مغرب کی پشت پناہی کے الزام سے ان کے دامن داغدار ہیں۔

اردگان اپنے انقلابی اقدامات، مثالی کامیابیوں اور غیر متوقع نتائج کے حصول کے حوالے

سے حیرت انگیز خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کررہا ہے۔ اس دورے میں بالآخر اس نے اندرون ملک کے بعد بیرون ملک وہ معرکہ بھی سر کرلیا جوان کے لیے فوجی بغاوت کو ناکام بنانے کے بعد بہت زیادہ مشکل قرار دیا جارہا تھا۔ جس طرح منظم فوجی بغاوت...... جس کے پیچھے مغرب کی تمام تر حمایت کو مشہور امریکی و یورپی اخبار کے صفحات اور ویب سائٹس پر دیکھا جاسکتا ہے...... کو ایک پکار کے ذریعے ناکام بنایا، اس سے زیادہ کارنامہ یہ ہے کہ گولن صاحب کے تیار کردہ رضا کاروں، کارندوں اور ان کے حکم پر سب کچھ کرنے پر تیار تعلیم یافتہ ہرکاروں کو دھیرے دھیرے اندرون ملک قابو کرنے کے بعد اب وہ بیرون ملک ان کا صفایا کرنے نکلے تو پہلے پڑاؤ میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ پاکستان میں گولن صاحب کے 23 اسکولوں سے متعلقہ 108 اساتذہ اور 480 افراد کو پاکستان سے چلے جانے ورنہ ملک بدر کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ اپنے ملک واپس پہنچنے پر ضرور پوچھا جائے گا کہ ''پاک ترک اسکول'' کے نام پر ''پاک مغرب معاشرت'' پھیلانے اور پاکستان میں گولنسٹ رضا کار تیار کرنے سے آخر تمہارا مقصد کیا تھا؟؟؟ یہ اسکول نہ تو دستی تعلیم دیتے تھے، نہ مشرقی تربیت، یہ پاکستان میں پینسلوانیا کے ''شیخ اعظم'' کے وہ مرید تیار کررہے تھے جو بوقت ضرورت خفیہ بلوں سے نکل آئیں اور جمہوریت کے گلے میں آمریت کی گھنٹی باندھ کر حق نمک ادا کریں۔

پاکستان آنے سے پہلے انہوں نے گولنسٹ حضرات سے زیادہ ایک مشکل یعنی کرد باغیوں اور مصنوعی خلافت کے مدّعیوں کی برپا کردہ شورش پر بھی قابو پانے میں کامیابی حاصل کی جو گولن صاحب کی سیاسی و فوجی ''مخلوط بغاوت'' کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ اور کھلم کھلا دہشت گردانہ بغاوت تھی۔ سیاست اگر ''تدبیر مملکت'' کا نام ہے تو بھی، اگر ''تعمیر ملت'' کا نام ہے تو بھی اور

''اصلاح تخریب'' کا نام ہے تو بھی، تینوں معنی میں کامیاب سیاست کی مثال معاصر ترکی میں قائم ہو رہی ہے۔ حالیہ دورے میں ترک سفیر کے بیان کا ایک جملہ معنی خیز ہے: ''اردگان اپنے آباو اجداد کی پیروی کرتے ہوئے برادر اسلامی ممالک کو قریب لارہے ہیں۔'' گولن صاحب مغرب کی نمایندگی کررہے تھے، اس لیے ترک ہوتے ہوئے بھی مستحق عتاب ٹھہرے، جبکہ عرب ممالک برادر اسلامی ممالک ہیں، اس لیے ترکوں سے دور ہوتے ہوئے بھی انہیں قریب لایا جارہا ہے۔ یہ ہے وہ سوچ جس کی بنا پر اردگان کی فطری عبقریت اسلام کے منصفانہ سانچے میں ڈھلتی نظر آتی ہے اور کہنے والا کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس نے معرکہ جیتنے کے بعد درپیش معرکے کو بھی سلیقے سے جیتنے کا سفر جاری رکھا ہوا ہے، ورنہ اکثر حکمران دریا کے پار اترنے کے بعد جب اگلا دریا دیکھتے ہیں جو پانی کا نہیں آگ کا ہے، تو حوصلہ ہار جاتے ہیں یا تدبیر ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

اس موقع پر شکر الٰہی اور تحدیث بالنعمت کے طور پر یہ کہنے کا دل چاہتا ہے کہ گولن صاحب کے قائم کردہ پاک ترک اسکولوں کی تطہیر کے عمل میں ''ضرب مؤمن'' کا بھی حصہ شامل ہے۔ پاکستانی صحافت میں سب سے پہلے یہیں سے ان اسکولوں کے ملکی اور ملی مفادات کے خلاف کام کرنے پر آواز اٹھائی گئی تھی جس کی پاداش میں پاک ترک ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے وکیل صاحب کا دھمکی بھرا خط موصول ہوا تھا۔ اگرچہ خط کے کرارے جواب کے بعد جواب الجواب آنے کی تو ہمیں حسرت ہی رہی، لیکن بہرحال وہ ایک تاریخی گواہی ہے کہ ملک وملت کے مفادات کے خلاف مصروف عمل اس طبقے کے خلاف مؤثر ضرب میں جھیل کی ساکن سطح پر پہلا کنکر ''ضرب مؤمن'' نے ہی پھینکا تھا۔ پھر یہ کنکر پتھروں میں تبدیل ہوتے گئے یہاں تک کہ ان تعلیمی اداروں کی تطہیر کا عمل مکمل ہوگیا۔ یہ تمام روئیداد ''ترک ناداں سے ترک دانا تک'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ترکی بغاوت کی ناکامی کے دنوں میں راقم کو جنوبی افریقہ کا سفر درپیش ہوا۔ وہاں گولنسٹ

صاحبان کے 17 اسکول تھے۔ یعنی غیر مسلم ملک میں قریب قریب اتنے اسکول تھے جتنے مسلم ملک میں۔ مسلم کمیونٹی کے اکثر نونہال انہی اداروں میں تعلیم پاتے تھے۔ جنوبی افریقہ کے علماء...... جن کی حمایت کی بنا پر مسلم کمیونٹی کے نونہال گولن صاحب کے اسکولوں میں داخلہ بھی لیتے تھے اور جن کی سرپرستی کی بنا پر یہ تنظیم لاکھوں ڈالر کے عطیات وصول کرتی تھی...... جاننا چاہتے تھے کہ اس بغاوتی شورش کی حقیقت کیا ہے؟ اس عاجز سے درخواست کی گئی کہ کیا آپ علمائے کرام کے منتخب مجمع میں اس حوالے سے کوئی گفتگو کر سکتے ہیں؟ موضوع بہت نازک تھا۔ آج کل کی دنیا میں بغیر ثبوت کے بولنا یا جانبدار ہو کر بولنا چلنے والی چیز نہیں ہے۔ راقم نے اللہ کا نام لے کر کچھ دن اس حالت میں گزارے کہ سوائے اردگان اور گولن سے متعلقہ امور جمع و تحقیق کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ پھر اللہ کا نام لے کر پہلی پریزینٹیشن اس اسلوب انداز میں دی کہ عاجز صرف اپنی اب تک کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ فیصلہ آپ حضرات خود کریں گے۔ اگر کوئی سوال حل نہ ہو تو اس کا جواب صرف میری ذمہ داری نہیں ہوگی، بلکہ ہم سب مل جل کر اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

صرف علمائے کرام کی آگاہی کے لیے منعقد کی گئی اس محفل میں منتظمین کو امید تھی کہ چالیس پچاس علماء سے زائد نہ آئیں گے، مگر ماشاء اللہ ڈیڑھ سو کے قریب مہمان تشریف لائے اور سوال جواب کی محفل تک جم کر بیٹھے رہے۔ اس کے بعد تو پھر چل سو چل۔ جوہانسبرگ کے بعد پریٹوریہ، ڈربن، نیوکاسل وغیرہ سے تقاضے آنا شروع ہو گئے۔ بندہ بھی واپسی ملتوی کر کے اس کام کو فرض کفایہ سمجھ کر جت گیا۔ الحمدللہ کہ ریحانۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء اور میری عمر سے دگنی عمر اور خدمات والے اکابر علمائے کرام

شریک ہوئے اور الحمدللہ! حق و باطل کی پہچان کے حوالے سے مطمئن ہو کر گئے۔ یہ ساری روئیداد اس فقیر کی نئی زیر ترتیب کتاب ''باسفورس کے کنارے'' میں آ رہی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ پینسلوانیا کے حساس ترین علاقے میں پناہ گزین شخص شمال میں روس سے لے کر کرۂ ارض کے جنوب میں واقع آخری ملک تک تعلیمی اداروں کا منظم سلسلہ اگر بغاوت جیسے مذموم مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے تو اسی طرح کے سلسلے دین کی اشاعت اور حق کی حمایت کے لیے کیوں قائم نہیں کیے جا سکتے؟ اب تو تعلیمی اداروں کی سماج سدھار اثر انگیزی کا مشاہدہ کرنے اور اس کا طریقہ کار سیکھنے کے لیے ترکی جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہیں پاکستان میں یہی 23 ادارے صحیح معنوں میں پاک ترک دوستی کے نقیب و سفیر بھی ہوں گے اور سیکھنے والوں کے لیے عملی نمونہ بھی۔ بس دیکھنے والی آنکھ، سیکھنے والا دماغ اور حق کے غلبے کا جذبہ رکھنے والا دل چاہیے۔

ترکی کے موجودہ حالات
اور مسلمانانِ عالم کی ذمہ داریاں

بیرونِ ملک علمائے کرام کی مجلس میں کیا گیا بیان

تمہید و پس منظر:

اگلے صفحات میں آپ جو سطور پڑھیں گے یہ دراصل مصنف کا ایک بیان ہے جو جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ کی ''مرکزی جامع مسجد میفر'' میں ہوا۔ پس منظر یہ تھا کہ جب گولن صاحب کی تیار کردہ جماعت نے ترکی میں بغاوت کی تو یہ فقیر ان دنوں جنوبی افریقہ میں تھا۔ وہاں کے علمائے کرام گولن صاحب کی مذہبی تحریک اور ان کے تعلیمی وفلاحی اداروں کی حقیقت جاننا چاہتے تھے۔ انہیں تشویش تھی کہ نہ صرف یہ کہ مسلمان بچے اور بچیاں ان اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان اداروں کو متمول مسلمانوں کی طرف سے لاکھوں روپے عطیات دیے جاتے ہیں۔ تاریخ کے اس نازک موقع پر انہیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ اردگان یا گولن میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ اس بات کی اہمیت اس لیے بھی بہت بڑھ جاتی تھی کہ جوہانسبرگ کے قریب میاز

فارم سے ذرا آگے گولن صاحبان نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ مسجد نہیں پورا ایک کمپلیکس ہے جس میں اسکول، رہائشگاہیں دوکانیں ہر طرح کی سہولت تھی، اور کہا جاتا تھا کہ اگر کسی وقت گولن صاحب کے گرد گھیرا تنگ ہوا اور انہیں امریکا چھوڑنا پڑا تو وہ ''حشر ثانی'' کے مصداق یہاں پناہ لیں گے (ان کا حشر اول تو ترکی سے امریکا تک ہو چکا تھا) کیوں کہ اس ملک کے قوانین بین الاقوامی مجرموں کے لیے نہایت پر سہولت، باکفایت اور بارعایت ہیں۔ مقامی علماء کرام کی طرف سے اس عاجز کے لیے حکم تھا کہ آپ علماء کے منتخب مجمعے کو اس حوالے سے آگاہی فراہم کریں۔ یہ میرے لیے نہایت نازک موقع تھا۔ حق کا اظہار بھی بہت ضروری تھا جبکہ بعض گرامی قدر شخصیات گولن صاحب سے ناواقفیت کی بنا پر کھل ان کی حامی تھیں۔ بیان کے دوران کسی قسم کی بے تدبیری سے نہایت بدمزگی ہو سکتی تھی اور اختلاف پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ پاکستان میں جب ہم نے گولن صاحب کی حقیقت کشائی کے حوالے سے مضامین لکھنے کی ابتدا کی تھی تو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پاک ترک اسکول کے وکیل کی طرف سے نوٹس وصول ہوا۔ جس کی روئیداد ''ترک ناداں سے ترک دانا تک'' میں لکھی جا چکی ہے۔ یہاں کوئی اندیشہ تو نہ تھا، لیکن کچھ بہت معتبر اور محترم حضرات حقائق سے ناواقفیت یا یکطرفہ معلومات کے سبب گولن صاحب کے اداروں سے متاثر (جنوبی افریقہ میں ان کے 17 اسکول کام کر رہے تھے اور پاکستان میں 23...... اس سے بھی آپ ان حضرات کی وہاں کی گئی محنت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ فلاحی ادارے اس کے علاوہ تھے) اور ان کے نیک مقاصد کے قائل تھے۔ ان کی ناراضگی یا کسی قسم کا بحث مباحثہ شروع ہو جانا ان حضرات کے باہمی اتفاق کے لیے اور پھر افریقہ کے عام مسلمانوں کی ذہن سازی کے حوالے سے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالی نے اپنے فضل و کرم سے یہ سجھایا کہ ترکی پر براہ راست بات شروع کرنے کے

بجائے ''عالم اسلام کے وسائل و مسائل'' کے حوالے سے بات شروع کی جائے۔ نیز دونوں حضرات (اردگان و گولن) کا ماضی و حال کھنگالا جائے، حامیوں اور مخالفین کی فہرست اور ان کے تبصرے تیار کیے جائیں، رجحانات و خدمات کو جمع کیا جائے اور پھر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کیے بغیر دلیل و پس منظر کے ساتھ حاضرین کے سامنے کچا چٹھا رکھ دیا جائے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔ گویا یہ علماء کی عدالت میں لڑا جانے والا ایسا مقدمہ تھا، جس میں ''فریقین'' غیر حاضر تھے اور عدالت کے ''معاون'' کو جانبین کی طرف سے شہادات و دستاویزات پیش کرنا تھیں۔ تین دن کی لگاتار محنت سے ...... الحمدللہ ثم الحمدللہ...... ایسا مواد تیار ہوگیا، جسے ملٹی میڈیا پریزنٹیشن کے ذریعے ایسے انداز میں پیش کرنا تھا کہ حق و باطل بذات خود ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور محترم حاضرین میں سے کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے نہ اعتماد کو۔ اللہ تعالی کا فضل و کرم شامل حال رہا اور حاضرین یہ عہد کر کے گئے کہ وہ گولن صاحب کے اداروں سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں گے اور اپنا وزن ترکی کے اسلام پسندوں کے پلڑے میں ڈالیں گے۔ جوہانسبرگ میں توقع سے زیادہ حاضرین کی آمد اور غیر معمولی کامیابی کے بعد یہ بیان دیگر شہروں میں بھی ہوا۔ ہر جگہ مجمع صرف علمائے کرام اور خواص کا تھا۔ کمی بیشی اور اضافات کے علی الرغم بنیادی باتیں وہی تھیں جو آپ ذیل میں پڑھیں گے۔ شروع میں لمبی تمہید کے بعد آپ کو جو اختصار ملے اس کی وجہ یہ ہے کہ تصویر یا کلپ دکھائے نہیں جا سکتے تھے۔ تصویر کا چہرہ چھپا دیا گیا تھا اور ویڈیوز کے متعلق کہا گیا تھا جو چاہے اس کی نقل بیان کے بعد حاصل کر لے۔ بہر حال جو کچھ ہوا توفیق الہی سے ہوا اور جو ہوگا، مشیت الہی سے ہوگا۔ اللہ تعالی قبول فرمائے اور دنیا بھر میں جہاں جہاں اہل حق ''رجوع الی اللہ'' کی تحریکیں چلا رہے ہیں، ان کو کامیابی عطا فرمائے۔

اب آپ وہ بیان مطالعہ فرمائیے!

علمائے کرام کی عدالت میں

خطبہ مسنونہ اور حمد و صلوۃ کے بعد

انفرادی نہیں، اجتماعی غور و فکر:

آج ہم جس موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں (عالم اسلام یا ترکی کے موجودہ حالات اور مسلمانان عالم کی ذمہ داریاں) اس کے لیے بہت زیادہ تحقیق، مطالعہ، مشاہدہ اور وسیع نظر چاہیے۔ آپ حضرات نے مجھ جیسے طالب علم کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ میں اس پر کچھ بولوں۔ یہ میرے لیے جہاں عزت افزائی کا باعث ہے، وہیں ایک آزمائش بھی ہے۔ میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس آزمائش میں پورا اترنے اور حق کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آج کی اس محفل میں جو کچھ میں بولوں گا وہ مسلسل بیان اور تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والی گفتگو کی شکل میں نہیں ہوگا، بلکہ میں چند نقشوں اور تصویروں...... غیر جاندار کی یا جاندار کی جن کا چہرہ مٹا ہوگا..... نیز دستاویزات کی مدد سے گفتگو کو آگے بڑھانے کی کوشش کروں گا۔ آپ

حضرات چونکہ اہل علم ہیں اس لیے میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گا کہ میری گفتگو کو من وعن لے لیا جائے اور میں آپ پر اپنی انفرادی فکر تھوپ دوں، بلکہ میں چاہوں گا کہ ہم سب مل کر اجتماعی طور پر عالم اسلام کے مسائل کی حقیقت تک پہنچیں اور اتنے سارے وسائل رکھنے کے باوجود ہم جس زوال وانحطاط کا شکار ہوئے ہیں، اس کے اسباب کا جائزہ لینے کی کوشش کریں۔ خصوصاً جب ہماری گفتگو عالم اسلام میں پیش آنے والے اس تازہ ترین واقعے تک جو ترکی میں ناکام بغاوت کی شکل میں نمودار ہوا، پہنچے گی تب میں اپنے مطالعے کا حاصل آپ کے سامنے پیش کروں گا اور آپ سب کو دعوت دوں گا کہ اس پر اجتماعی طور پر غور وفکر کریں۔ آخر میں سوال وجواب کی محفل میں ہم کوشش کریں گے کہ مل جل کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

اسلامی ممالک کی اہمیت:

ہمارے سامنے اس وقت دنیا کا نقشہ ہے۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ دنیا میں سات براعظم ہیں۔ ان میں سے یہ براعظم جو اس کرۂ ارض کے انتہائی جنوب میں ہے یہ غیر آباد ہے۔ یہ براعظم شمالی وجنوبی امریکا ہے جو تقریباً ۵۰۰ سال پہلے ۱۴۹۲ء میں دریافت ہوا۔ اس سے پہلے کی اس کی متمدن تاریخ نہیں ہے۔ یہ براعظم آسٹریلیا ہے۔ یہ تقریباً ڈھائی پونے تین سو سال پہلے دریافت ہوا۔ اس سے پہلے کی قدیم انسانی تاریخ یا متمدن ومہذب انسان یہاں نہیں تھا۔ اصل میں انسانی آبادی جو ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے وہ ان تین براعظموں پر مشتمل ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا براعظم ہے ایشیا۔ یہ اس کے بعد بڑا براعظم ہے افریقہ۔ اور یہ ہے یورپ۔ آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نرینہ تین تھی۔ سام، حام، یافث۔ ان تینوں سے آگے دنیا کی آبادی پھیلی ہے۔ جو گورے حضرات تھے وہ یورپ میں آباد ہوئے۔ جو سیاہ رنگ کے افراد تھے انہوں نے یہاں افریقہ میں رہائش اختیار کی۔ جو سانولا رنگ تھا وہ ایشیا

میں آ گیا۔ ان تین براعظموں کے بیچ میں، تینوں کے سنگم پر "جزیرۃ العرب" ہے۔ یہ اس پوری روئے زمین کا بھی وسط بنتا ہے اور ان تین آباد براعظموں کے بھی بیچ میں آتا ہے۔ یہیں پر اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا گھر بنایا۔ یہیں پر اللہ نے پہلے پیغمبر، پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو صفا پہاڑی پر اتارا۔ جو آدم صفی اللہ علیہ السلام کی نسبت سے "صفا" کہلاتی ہے۔ اور یہیں پر بڑے بڑے انبیاء تشریف لائے۔ قرآن کریم میں جن ۲۵ انبیاء کا ذکر ہے، ان کا تعلق اسی سرزمین اور اس کے گرد و پیش سے ہے۔ آخری نبی خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہیں تشریف لائے۔ چونکہ آپ خاتم النبیین ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں، آپ کو دی گئی کتاب ہدی للعالمین ہے تو اس لیے جغرافیائی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی جگہ آپ کو عطا کی کہ جہاں سے پوری روئے زمین تک ہدایت کا پھیلنا آسان ہے۔ عالم اسلام کو قدرتی طور پر دنیا کا بہترین جغرافیائی محل وقوع ورثہ میں ملا۔ لیکن اکتشافات و ایجادات کے موجودہ دور میں ہم اپنی ذمہ داری ادا نہ کر سکے۔

روحانی، سیاسی اور جغرافیائی مرکز:

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ پوری انسانیت تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں اور اس کو دنیا میں فلاح اور آخرت میں نجات حاصل کرنے کے طریقے کی طرف دعوت دیں۔ یہ خطہ دعوت کے لحاظ سے پوری دنیا کے لیے آسان ترین مرکز بن سکتا ہے۔ حرمین بھی یہیں ہیں اور حرم ثالث مسجد اقصیٰ بھی یہیں ہے۔ تو یہ جغرافیائی مرکز ہونے کے ساتھ روحانی مرکز بھی ہے۔ جس طرح یہ دعوت کا مرکز بن سکتا ہے اسی طرح دعوت کے لیے درکار وسائل کا مرکز بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کو بنایا ہے۔ اس جزیرۃ العرب میں دنیا کے بہترین قدرتی وسائل پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے بہترین نقل و حمل کے ذرائع بھی پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے بہترین قدرتی اور معدنی وسائل سے مراد ہے وہ دولت یا زمین کے اندر چھپے ہوئے وہ خزانے جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی پیدائش کے

دن اندر اتار دیا تھا۔ جب وہ ابل پڑے تو گویا کہ بہتا سونا زمین سے ابل پڑا۔ اس کا مرکز یہی ہے۔ اس جزیرۃ العرب کو اللہ تعالی نے تینوں قسم کی حیثیت دینے کے بعد چوتھی حیثیت بھی عطا کی۔ ''جغرافیائی محل وقوع'' بھی دنیا میں سب سے بہترین اسی کا ہے۔ اور ''معدنی وسائل'' بھی اللہ تعالی نے سب سے زیادہ اس کو عطا کیے، ''سیاسی حیثیت'' بھی اللہ تعالی نے اس کو اور اس کے گرد و پیش کو عطا کی اور دنیا کی ''معاشی شہ رگ'' بھی اس کو بنایا۔ (اس کی کچھ وضاحت میں ذرا آگے چل کر کروں گا) یہ تمام وسائل دینے کے ساتھ اور ان وسائل کی مرکزیت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالی نے ان کو دعوت کے وسائل بھی دیے کہ دین کی نشر و اشاعت کا کام پوری دنیا میں کریں۔ اور اس کا مکلف امت محمدیہ کو بنایا گیا۔ اس ''امت محمدیہ'' کے پاس دنیا کے اندر نقل و حمل اور سفر کے جو بہترین ذرائع ہیں وہ موجود ہیں۔ فضائی نقل و حمل مہنگی ہے۔ زمینی نقل و حمل بھی مہنگی ہے۔ سب سے آسان اور سستی نقل و حمل کا ذریعہ سمندری آمد و رفت ہے۔ سمندری گذرگاہوں میں دنیا کے اندر چند سمندری درے ہیں جن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اہم درے اس جزیرۃ العرب کے گرد و پیش میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالی نے اپنے انعامات کی تکمیل کر دی ہے امت محمدیہ پر، لہٰذا اس کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔

چند اہم سمندری درّے:

یہ پہلا سمندری درہ ہے۔ یہاں سے پورے خلیج عرب کی سیال دولت جہازوں میں بھر کر نکلتی ہے۔ اس کو کہتے ہیں ''مضیق ہرمز'' یعنی درہ ہرمز۔ اس کے دائیں اور بائیں دو سمندر ہیں۔ یہاں پر یہ خلیج عرب ہے اور یہاں پر یہ بحر ہند ہے۔ آپ اوپر عراق سے گننا شروع کر دیں جہاں دنیا کا پچھتر فیصد تیل ہے۔ اس کے بعد نیچے آجائیں کویت، پھر نیچے آجائیں سعودی عرب اور اس کے بعد پھر بحرین پھر قطر پھر امارات اور پھر عمان۔ یہ سارے کے سارے ممالک اسی خلیج

عرب کے کنارے واقع ہیں۔ اور پوری دنیا کے تیل کی اسی فیصد ضرورت یہیں سے پوری ہوتی ہے۔ اور اس درے کو پار کیے بغیر یہ تیل باہر نہیں جا سکتا اور یہ درہ عالم اسلام کے پاس ہے۔ اس درے سے نکلنے کے بعد شمالی یا جنوبی امریکا جانا ہے تو اس کے لیے ایک راستہ کیپ ٹاؤن سے گذر کر ہے۔ یہ بہت دشوار گذار اور بہت لمبا راستہ ہے۔ لہٰذا چھوٹے راستے کے لیے دوسرے درے کی ضرورت پڑتی ہے جو یمن کے پاس ہے۔ اس کا نام ہے باب المندب۔ دنیا کی بڑی بڑی تجارت کا یہی راستہ ہے۔ یہی معاشی شہ رگ ہے۔ یہ اقتصادی شاہراہ ہے۔ اگلا درہ یہاں آجاتا ہے نہر سوئز کا۔ یہ بھی مسلمان ممالک کے درمیان ہے۔ یہاں سے گذرنے کے بعد آخری درہ ہے ''جبرالٹر'' (جبل الطارق) جو مراکش اور اسپین کے درمیان ہے۔ اس سے گذر کر سامنے سیدھا امریکا شمالی اور جنوبی دونوں قریب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے مرکزی حیثیت عطا کی ہے۔ جغرافیائی، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور روحانی۔ اس سے مسلمانوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے کہ آپ کے پاس جو ہدایت کی امانت ہے اس کو پوری دنیا میں پھیلائیں۔

عالم اسلام کی تکوین:

پھر مسلمانوں پر جب کوئی ذمہ داری روحانی و مذہبی آئے گی تو وہ عام مسلمانوں پر بعد میں آئے گی پہلے اور اولین درجے میں وہ ذمہ داری علمائے کرام پر آئے گی۔ میں اور آپ مکلف ہیں اس بات کے کہ پورے عالم پر نظر رکھیں اور پورے عالم تک ہدایت کی دعوت پہنچانے کی فکر کریں۔ اب ذرا دیکھیے کہ دنیا کے مرکز جزیرۃ العرب میں بارہ ممالک ہیں۔ ان میں سے مرکزی حیثیت سعودی عرب کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی اعتبار سے دیگر ممالک پر سعودی عرب کو اہمیت دی جس طرح پورے عالم میں جزیرۃ العرب کو اہمیت دی۔ اس کے بعد ذرا ہم اس مرکز

سے اوپر جائیں گے اور ذرا اس مرکز سے دائیں طرف آئیں گے۔ اس مرکز سے جب ہم اوپر جاتے ہیں تو ایشیا اور یورپ کے سنگم پر ترکی آتا ہے۔ اور ذرا سا نیچے دائیں طرف آتے ہیں تو پاکستان، بنگلہ دیش، برما، ہندوستان یعنی کہ ہند واقع ہے۔ ہند اس طرف آ جاتا ہے۔ ہمارے ترک بھائی اس طرف آ جاتے ہیں۔ بیچ میں عرب آ جاتے ہیں۔ اوپر یورپ اور ایشیا کے سنگم پر ترکی ہے، وسط میں سعودی عرب ہے اور نیچے آ کر پاکستان ہے۔ اس طرح پوری دنیا کی تجارت، معیشت اور عسکریت میں ان تینوں ممالک کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ عالم اسلام کی ایک تکون ہے۔ اگر یہ متحد ہو جائے اور اپنی اپنی صلاحیت کو ایک دوسرے کی تقویت کے لیے اور پھر عالم اسلام کی تقویت کے لیے اور پھر پوری روئے زمین میں امن و ہدایت کا نظام قائم کرنے کے لیے استعمال کرلے تو یہ مادی اعتبار سے تقریباً ناقابل شکست بن جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں "یصدون عن سبیل اللّٰہ و یبغونھا عوجا" ان کی کوشش یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف بلانے والے طاقتیں اکٹھی نہ ہو سکیں۔ لہٰذا وہ ان تینوں کو الگ الگ بھی مضبوط نہیں ہونے دیتے اور ان تینوں کو ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں آنے دیتے۔ اس جانب جو ترکی ہے۔ یہ اس وقت دنیا کی بہترین معاشی اور عسکری، دونوں اعتبار سے مظبوط قوت بن کر ابھر رہا ہے۔ یہ ادھر جو پاکستان ہے یہ جتنے بھی بحرانوں کا شکار ہو، پھر بھی چند باتوں پر سب کا اتفاق ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی واحد مسلم ایٹمی طاقت ہے اور دوسری یہ کہ اس کی فوج دنیا کی بہترین فوج شمار ہوتی ہے۔ عالم اسلام کی خیر خواہ اور سب سے زیادہ مضبوط ترین فوج پاکستان کی فوج ہے۔ تیسری چیز یہ کہ جتنے بھی یہاں بحران آئے ہیں اور جس قدر بھی لبرل ازم اور سیکولر ازم کی کوششیں ہوں، بے دینی اور بد دینی کی ہوائیں چلیں، لیکن عوام کے دلوں سے ایمان و اسلام کی جڑ کو اور شاخوں اور پھولوں پھلوں کو نکالا نہیں جا سکتا ہے۔ ان باتوں پر تقریباً پوری دنیا کا اتفاق ہے۔

دنیا کے تین ممالک بحران کا شکار کیوں؟

اب آپ دیکھ لیں پوری دنیا کے نقشے کو کہ سات براعظموں میں سے مرکزی براعظم یہ تین ہیں۔ ان میں ایک طرف ترکی ہے بیچ میں سعودی عرب ہے اور ادھر پاکستان ہے۔ اس زمین پر اللہ تعالی کے نام کا بول بالا کرنے والی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ یہ تینوں پھلے پھولیں اور پھر مل کر پوری دنیا میں اللہ تعالی کے نام کا بول بالا کریں، بالکل اسی طرح جو لوگ شیطان کی دعوت کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور رحمٰن کی دعوت کا راستہ روکنا چاہتے ہیں، ان کی پہلی کوشش یہ ہے کہ یہ تینوں اپنی اپنی جگہ کمزور ہوں۔ مسائل کا، بحرانوں کا، انتشار اور بے اطمینانی کا شکار رہیں اور دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اپنی جگہ کمزور ہونے کے بعد تینوں آپس میں متحد بھی نہ ہوں۔ پچھلے مہینوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسی جزیرۃ العرب میں اس طرف شام کا زخم لگا ہوا ہے، تو دوسری طرف سے سعودی عرب کو گھیر لیا گیا ہے، یہاں سے یمن والوں نے، ادھر سے کچھ اور لوگوں نے ادھر سے کچھ اور لوگوں نے۔ عراق کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا کہ شام سے لہو رسنے لگا، اور شام پر ابھی ہمارے آنسو نہیں رکے تھے کہ سعودی عرب کے لیے مسائل پیدا کر دیے گئے۔ پاکستان میں ہر وقت بحران آتے ہی رہتے ہیں، کیونکہ وہاں بیرونی مداخلت بہت زیادہ ہے۔ ترکی ماشاء اللہ بہت اچھا جا رہا تھا۔ کئی سالوں سے دینی اعتبار سے بھی رجوع الی اللہ اور رجوع الی الدین کی تحریک چل رہی تھی اور آنکھوں سے نظر آ رہا تھا کہ بہتر سے بہتر ہو رہی ہے۔ سیکولرازم کا جبری سو سالہ دور گذار کر جس میں اذان اور نماز کی اجازت بھی نہیں تھی، وہ دن آ گیا تھا کہ ستر سال کے بعد ترکی کا پہلا حکمران صدر عبداللہ گل حج کرنے کے لیے گیا۔ وہ دن آ گیا تھا کہ وہاں پر دینی شخصیات کو، دینی اداروں کو، دینی تحریکوں کو کام کرنے کی اجازت آہستہ آہستہ مل رہی تھی تو اچھے دور کا آغاز نظر آنے لگ گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی نے دنیا کے مظلوم مسلمانوں کی

سرپرستی بھی شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ ایک انسان اپنی استطاعت بھر کر سکتا ہے، ویسا ہی ایک ملک اپنے مقدور بھر کر رہا تھا۔ پاکستان اور سعودی عرب کے بعد یہ کیسے چھپ جاتا نظروں سے؟ وہاں پر پھر ایک انقلاب برپا ہوا جس کا ہم نے مطالعہ کرنا ہے۔ اس کا فائدہ ہمیں کیا ہوگا؟ فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں یہ سمجھ آئے گا کہ عالم اسلام میں انقلابات کیوں آتے ہیں؟ اور کون انہیں برپا کرتا ہے؟ ہمارے پاس کتنے بہترین وسائل ہیں جو دنیا میں کسی ملک، کسی مذہب، کسی طاقت، کسی نظریے والوں کے پاس نہیں ہیں۔ تو پھر ہم ان وسائل کے ہوتے ہوئے اپنے مسائل کو کیوں حل نہیں کر پا رہے؟ اور کیوں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر پا رہے؟ دنیا میں اپنی حکمرانی قائم کرنا مسلمان کا مطمح نظر نہیں ہے۔ دنیا میں اللہ کے نام کی حکمرانی قائم ہو جائے یہ ہمارا مطمح نظر ہے۔ تو ہم ایسا کیوں نہیں کر پا رہے؟ اگر ہم یہ سمجھ جائیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارا رخ بھی درست سمت میں ہو جائے گا اور ہم کسی کی برپا کردہ ان کوششوں یا سازشوں کا جو ہماری ملت کے اجتماعی طور پر مخالفت میں ہوں اس کا دفاع بھی ان شاء اللہ ہم کر لیں گے۔

شخصیات کا تصادم یا نظریات کا تقابل؟

ترکی میں پچھلوں دنوں جو مسئلہ پیدا ہوا اس کا ہم ذرا بحث و تحقیق کے ساتھ اور تنقیدی نظر کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔ وہاں پر کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ دو افراد یا دو شخصیات کی باہمی مخاصمت ہے۔ یہ دو نظریوں کا تقابل نہیں ہے۔ یہ دو اعتقادات کا تقابل نہیں ہے۔ ہمیں دیکھ لینا چاہیے کہ کیا یہ شخصیات کا ٹکراؤ ہے؟ شخصی اختلاف ہے؟ یا یہ دو نظریوں کا باہمی تصادم و تقابل چل رہا ہے؟ اور دونوں میں سے کوئی بات بھی ہے تو علماء کو کیا کرنا چاہیے؟ علماء کو اپنا وزن کس طرف ڈالنا چاہیے؟ ان کو اپنے مقتدیوں کو، متعلقہ افراد و احباب کو کیا بات بتانی چاہیے کہ کس کے لیے دعا کرو؟ کس کے لیے خیر خواہی کی کوشش کرو؟ اور تم سے اگر دامے درمے قدمے سخنے کسی کے ساتھ

تعاون ہوسکتا ہے تو وہ کون ہے؟ اس بات میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ علماء حضرات کو حق کا ساتھ دینا چاہیے۔ حق کے لیے جو کوشش کر رہا ہے اسی کے ساتھ خیر خواہی کرنی چاہیے، اور اپنا وزن اسی کے پلڑے میں ڈالنا چاہیے، لیکن پوری احتیاط کے ساتھ، پوری بحث اور تحقیق کے ساتھ حق تک پہنچنے کی کوشش پہلے کرنی چاہیے، کیونکہ "ذلة العالم زلة العالم" ہے۔ اگر ہم لڑکھڑا گئے اور راہ حق پر صحیح نہ چل سکے، یا اسے پہچان نہ سکے تو ہمارے پیچھے آنے والے عامۃ المسلمین بھی لڑکھڑا نہ جائیں۔ ہم شاید لڑکھڑا کر سنبھل جائیں، یہ اگر گر گئے تو ان کو کون تھامنے والا ہوگا؟ لہٰذا ہم آج کی پریزینٹیشن میں یہ جائزہ لیں گے کہ حق و باطل کی جو نشانیاں اللہ تعالیٰ نے زمین پر رکھی ہیں سیاہ اور سفید کو پہچاننے کے لیے، ان میں سے کون سی نشانی کہاں پائی جاتی ہے؟

حق و باطل کے امتیاز کے لیے چند نشانیاں:

آپ حضرات اہل علم ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ سب سے پہلی نشانی تو ایک انسان کا اپنا ذاتی کردار ہوتی ہے۔ کردار نام ہے اقوال و افعال کا۔ ایک انسان کا قول و فعل جو معلوم ہے اس کو جانچا جائے، عدالت ظاہرہ کو دیکھا جائے، وہ پائی جاتی ہے؟ عدالت باطنہ کو دیکھا جائے وہ پائی جاتی ہے؟ یہ پہلی نشانی ہے حق و باطل کو پہچاننے کی۔ چاہے وہ فرد ہو، ادارہ ہو، تحریک ہو یا ریاست و ملک۔ کوئی بھی ہو۔ ہمارے محدثین اور فقہاء نے بھی ایک ایک طریقہ بتایا ہے حق و باطل کو پہچاننے کا۔ محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ عمن اخذه و من اخذ عنه؟ یعنی کس کا شاگرد تھا کس کا مرید تھا؟ اس کو دیکھا جائے، اور اس سے آگے شاگرد ہونے والے اور مرید ہونے والے وہ کون ہیں؟ تو اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آدمی تاریخ کے جس دور میں بھی گذرا ہے لیکن ثقاہت و استناد، عدالت یا فسق دونوں میں سے کون سی چیز اس کا تعارف بن جاتی ہے؟ فقہاء کا طریقہ وہ ہے جس کو "تزكية السر و العلانية" کہتے ہیں۔ سر اور علانیہ دونوں

میں ایک آدمی کے اعمال کی جانچ جو قاضی صاحب کرتے ہیں۔ اسے شہود کا تزکیہ کہتے ہیں۔ وہ اس کے قریب گردوپیش میں بسنے والے لوگوں سے پوچھتے ہیں: ہاں بھائی! آپ نے اس کو مسجد میں نماز ادا کرتے، فرائض ادا کرتے دیکھا ہے؟ آپ نے ان کو منکرات محرمات میں مبتلا تو نہیں دیکھا؟ تو "تزکیۃ السر و العلانیہ" فقہاء کا طریقہ ہے۔ تین طریقے مستند تو ہمارے پاس یہ ہوئے۔

خیر اور شر کی پہچان کے پانچ طریقے:

ایک یہ کہ اس کے ذاتی قول و فعل کو جانچا جائے۔ اس کے اعتقادات کو دیکھا جائے کہ وہ کیسے ہیں؟ اگر ان میں خلل ہے تو وہ خلل کس درجے کا ہے؟ وہ خلل تفسیق کا ہے، تضلیل کا ہے، یا خدانخواستہ تکفیر کا ہے؟ اعتقاد کے بعد اس کے اعمال کو دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک موافق شریعت و سنت تھے اور کس حد تک اہل سنت والجماعت کے طریق سے ہٹے ہوئے تھے؟ دوسرا طریقہ محدثین کا ہے کہ اس کی اوپر کی لڑی کو اور اس سے نیچے کی لڑی کو دیکھا جائے۔ تیسرا طریقہ فقہاء کا ہے کہ سر و علانیہ کو جانچ لیا جائے گردوپیش والوں سے۔ ایک چوتھا طریقہ اللہ تعالیٰ نے عوام کے لیے رکھا ہے۔ جس سے عوام فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر؟ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی نشانیاں رکھی ہیں، بہت واضح ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ فتنے کے زمانے میں ہم حق کو کیسے پہچانیں گے؟ فرمایا: اہل باطل یعنی دشمن کے تیروں کو دیکھ لینا، ان کا رخ جس طرف ہوگا وہ اہل حق ہوں گے۔ ہم چوتھے طریقے کے تحت دیکھیں گے کہ پوری دنیا میں جو مسلمانوں کے عناد میں مشہور ہیں، وہ اردگان صاحب کے خلاف ہیں اور گولن کی حمایت میں ہیں...... یا وہ گولن صاحب کا دفاع کر رہے ہیں اور اردگان کے خلاف بول رہے ہیں، یہ بھی ہم کو جانچ لینا چاہیے۔ یہ چار طریقے ہو گئے۔ اگر ہم ان طریقوں کو اچھی طرح

استعمال کر لیتے ہیں تو پھر آگے کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ ایک آخری اور طریقہ بھی ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان کی محنت، تحریک، جدوجہد کا حاصل کہاں جا رہا ہے؟ کس کے پلڑے میں اس کا وزن پڑ رہا ہے؟ حق والوں کا نام بلند ہو رہا ہے، اہل حق کو اس سے فائدہ ہو رہا ہے یا باطل و طاغوت کو ترقی مل رہی ہے؟ ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے۔ آخری نتیجہ کیا ہے؟ آخر کار یہ پرنالہ جا کر گر کہاں رہا ہے؟ یہ اس کا پھل آخر میں کس کے دامن میں آئے گا؟ یہ پانچواں طریقہ بھی ہے۔ ان پانچوں طریقوں کو ہم ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی ان شہادات و دستاویزات کا یا جو بھی آپ کہہ لیں (جو ہم نے جمع کی ہیں) کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

بحث و تحقیق کا منصفانہ طریقہ:

ہمارے پاس جو چیزیں جمع ہیں ان میں سے کچھ کو دکھانے کا جواز متفق علیہ ہے۔ یہ تحریریں ہیں، بیانات ہیں، یا ایسی تصویریں ہیں جن کے چہرے کو ہم نے پورا چھپایا ہوا ہے۔ اور کچھ مختلف فیہ چیزیں ہیں، وہ مختلف فیہ ہم اجمالاً بتا دیں گے۔ آپ میں سے کوئی تحقیق کرنا چاہے اور اس کا اعتماد ان حضرات کے قول پر ہو جو ڈیجیٹل تصویر کو درست سمجھتے ہیں تو وہ لے لے اور مزید تحقیق کر لے۔ مختلف فیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ متفق علیہ پر اکتفاء کریں گے۔ جو حضرات اس سے اتفاق نہیں رکھتے وہ وہ چیزیں لے لیں جن کا وہ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ہم بسم اللہ کرتے ہیں:

یہ ہمارے سامنے ایک فتویٰ ہے۔ وہ پانچ معیارات میرے انتہائی محترم حاضرین کے ذہن میں ہیں؟ میں آپ حضرات سے بہت چھوٹا ہوں، آپ میں سے اکثر شاگردوں کے جتنا ہوں، بقیہ حضرات میرے بھائیوں کی طرح ہیں، ہم بات کو بے تکلف آگے بڑھائیں گے۔ آخر میں سوالات کی محفل بھی بے تکلف انداز میں چلائیں گے۔ "ما أسئلکم علیه من أجر و ما أنا من المتکلفین۔" مجھے اگر کسی چیز کا علم نہیں میں کہہ دوں گا: ''لاادری'' ہم سوچیں گے۔ مزید غور و فکر

کریں گے اور زیادہ جاننے والیوں سے پوچھ لیں گے: "فاسئلوا أهل الذکر إن کنتم لاتعلمون." جس کا میدان ہوگا اس سے پوچھ لیں گے۔ مل جل کر ایک نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے بجائے اس کے کہ میں پہلے سے کوئی طے شدہ ایجنڈا آپ پر مسلط کرنے کی کوشش کروں۔ بجائے یہ کہ آپ اپنے اس فقیر مہمان سے دل میں کوئی خلش لے کر جائیں، اچھی بات یہ ہوگی کہ ہم مل جل کر مطالعہ کا سفر شروع کرتے ہیں۔ آخر میں باہمی تبادلہ خیال بھی کرلیں گے اور جو چیزیں آپ مجھے سمجھا سکیں گے سر آنکھوں پر۔ جو چیزیں میں آپ کو نہیں سمجھا سکوں گا، میں اپنے اساتذہ اور اکابر سے پوچھ لوں گا۔

گولن صاحب کے بارے میں پوچھے گئے چند سوالات:

یہ ایک فتویٰ ہے۔ جو پاکستان کے دُور الافتاء میں بھیجا گیا ہے۔ اس میں کچھ باتیں پوچھی گئی ہیں۔ جب یہ ہمارے پاس آیا تو ہمیں اس کے مندرجات پر یقین نہیں آیا، اور ہم نے اس پر فتویٰ دینا مناسب نہیں سمجھا، جب تک اس کے مندرجات کی تحقیق نہ کرلیں۔ کچھ مندرجات کی تحقیق تو ہو چکی ہے جو ہم آپ کے سامنے پیش کریں گے، کچھ مندرجات کی تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی، ان کے بارے میں ہم آپ سے درخواست کریں گے آپ ہماری مدد کریں۔ ہم جو پیش کرنے جا رہے ہیں اس میں پہلے ہم پانچوں معیارات پر گولن صاحب کو پرکھیں گے۔ اس کے بعد ہم اردگان صاحب کے کردار کا مطالعہ کریں گے۔ ان کے دعویٰ اور نظریات کو دیکھیں کہ وہ کیا وزن رکھتے ہیں؟ تو گولن صاحب کے بارے میں ایک فتویٰ ہمارے پاس ہے۔ اس فتوے میں کچھ سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

پہلا سوال: اتحاد بین المذاہب:

گولن صاحب نظریہ "اتحاد بین المذاہب یا مکالمہ بین المذاہب" کے تحت غیر مسلموں کے

ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے یہود و نصاری کو دوست رکھتے ہیں۔ اس بات کی جب ہم نے تحقیق شروع کی تو زیادہ مشکل نہیں ہوئی ہمیں اس کا ثبوت ملنے میں، کیونکہ اتحاد بین المذاہب اس وقت عالم کفر کا چلتا ہوا سکہ ہے۔ ایک پادری ہمیں ملے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا ہم جب پادری تھے ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ عیسائی ہو جائیں اور آپ کو جنت کی بشارت مل جائے۔ نہیں ہم چاہتے تھے کہ آپ مسلمان نہ رہیں اور مسلمان کو مسلمان نہ رہنے دینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کو ہم اتحاد کے نام پر اس جگہ لے آئیں جسے مداہنت کہتے ہیں۔ بس یہ مسلمان نہ رہے گا اور عیسائی بھی نہ ہوگا عیسائیت کی آزادی کو پسند کرے گا اور اسلام کو معاذ اللہ ہلکا سمجھے گا بس ہمارا کام ہو جائے گا۔ شریعت وملت کو آئیڈیل نہ سمجھنا اور مغربیت یا سامراجیت کو اسلام سے بہتر نظام ماننا ہی تو وہ بدنصیبی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے ناامیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

"ود کثیر اھل الکتاب، لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا، حسدا من عند انفسھم۔" اتحاد بین المذاہب کا مطلب "تعالوا إلی کلمة سواء" نہیں ہے۔ اس ایت کا مطالب یہ ہے کہ تمام مذاہب میں اسلام، یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت، سب مذاہب کی کتابوں میں مشترک چیزیں دو ہی ہیں: ایک یہ کہ "لا الہ الا اللہ"۔ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ کوئی اس کے علاوہ معبود بننے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ دعوت تمام کتابوں میں مشترک ہے۔ دوسری یہ کہ آخری ایک نبی آنے والے ہیں۔ ان پر ایمان لانا ہے، ان کی بات مان لینی ہے۔ تمام کتابوں میں یہ پیش گوئیاں موجود ہیں۔ "تعالوا إلی کلمة سواء" کی دعوت کا یہی مطلب ہے کہ جو چیز تمام مذاہب میں یکساں ہے، قدر مشترک ہے، اس پر آجاؤ۔ اختلافی کو

چھوڑ دو۔ اتفاق کو لے لو، مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ دو ہی نکتے ہیں: ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''۔ لیکن موجودہ ''اتحاد بین المذاہب'' کچھ اور ہے۔ یہ تو ایک نئے ''دین اکبری'' کی دعوت ہے۔ اس کی دعوت تو قریش نے بھی آپ علیہ الصلوۃ والسلام کو دی تھی۔ ''ولولا أن ثبتناک لقد کدت ترکن إلیھم شیئا قلیلا۔'' اللہ نے نبی علیہ السلام کو اتحاد بین المذاہب کے فتنے سے کتنا بچایا ہے؟ ''لقد کدت'' قریب تھا، ''ترکن'' مائل ہو جاؤ، کتنا مائل؟ ''شیئا''، کتنا تھوڑا؟ ''قلیلا''۔ بہت تھوڑا سا۔ اللہ نے کہا ہے کہ اتنا بھی ہم نے آپ کو بچایا ہے۔ ''ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار۔'' یہ ''مداہنت'' ہے سیدھی سیدھی۔ اس سے کوئی یہودی یا عیسائی اسلام کے قریب نہیں آئے گا۔ بلکہ ہمیں ان کے قریب لے جانے کی کوشش کا نام ''اتحاد بین المذاہب'' ہے۔ یہ مستقل ایک موضوع ہے جس پر میں الحمد للہ کام کر چکا ہوں۔ گولن صاحب مستشرقین کے برپا کردہ اس فتنے کا کس حد تک شکار ہو چکے ہیں؟ اس سے متعلق ہمیں کچھ شواہد ملے ہیں۔ وہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ گولن صاحب ''اتحاد بین المذاہب'' میں اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ غیر مسلموں کی مخصوص تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور ان کو بھی اپنے ہاں کی خصوصی تقریبات میں بلاتے ہیں۔ گولن صاحب کی تصویریں موجود ہیں۔ یہ ان کے ہاں بھی گئے ہیں، ان کو اپنے ہاں بھی بلایا ہے۔ یہ دیکھیے! ان کی بنائی ہوئی مسجد میں عیسائی پادریوں نے جب ان کی مسجد میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے تو الٹا ہاتھ سینے کے اوپر رکھا ہے جس سے صلیب کا نشان بن رہا ہے۔ گلے میں صلیب پڑی ہوئی ہے۔ یہ تصویریں موجود ہیں۔

دوسرا سوال: نجات سب کے لیے:

اگلا سوال یہ ہے کہ گولن صاحب کا کہنا ہے، ان کا نظریہ ہے کہ یہودی عیسائی بھی جنت میں

جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے قرآن و حدیث میں صرف مسلمانوں کے لیے جنت کا وعدہ جاہلوں کی تحریف ہے۔ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ اسی طرح پیار کریں جس طرح اللہ سے ہوتا ہے۔ دین اسلام میں حجاب کی پابندی ٹھیک نہیں۔ محبت مرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہود و نصاری سے تعاون لینا، دشمنان اسلام سے مالی، سیاسی تعاون لینا کیسا ہے؟ اس کے کچھ شواہد دستیاب ہوئے شواہد موجود ہیں۔ امریکن کانگریس کے کچھ افراد نے یہ خط لکھا ہے۔ اس خط میں گولن صاحب کی مدد کرنے اور اردگان صاحب کی مخالفت کا کہا گیا ہے۔ یہ خط موجود ہے۔ اس تقریب میں جو آپ کو نظر آ رہی ہے، "اتحاد بین المذاہب" کے نام پر جمع ہو کر تلاوت بھی کی گئی ہے اور معاذ اللہ شراب بھی پی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس کا انکار کرتے ہی نہیں ہیں۔ جدید اسلام کا انہوں نے جو سانچہ بنایا ہے، اس جدید اسلام کا مطلب ہے: تحریف اسلام۔ اسلام اسلام ہی ہوتا ہے۔ جدید نہیں ہوتا۔ سیدھی سی بات ہے۔ اسلام اپنی اصلی حالت میں ہے تو وہ اسلام ہے۔ جب وہ مغرب کا منظور نظر جدید ہے تو وہ تحریف شدہ ہے۔ جہاد اور پردے کا انکار یہ سب چیزیں ان کے ہاں عام سی چیزیں ہیں۔

پاک ترک اسکول:

چند باتیں ایسی ہیں جن سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ پاکستان میں گولن گروپ نے پاک ترک اسکول کے نام سے کام کا آغاز کیا۔ اس نام کی تجویز جس نے دی تھی وہ شخصیت ابھی زندہ ہے۔ انہوں نے ان سب شواہد کی ہمارے سامنے تصدیق کی تھی۔ اس کام کے لیے جو لوگ بطور صحافی پاکستان آئے، صحافت سے ان کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ انہوں نے ایک کمپنی قائم کی۔ قالین صاف کرنے والی مشینیں درآمد کیں۔ ان مشینوں میں خفیہ آلات اور کیمرے نصب تھے۔ یہ مشینیں جب بڑے عہدوں پر براجمان حضرات کے کمروں میں پہنچیں وہاں سے سارے راز

وہاں پہنچنے لگ گئے جہاں سے وہ بھیجی گئی تھیں۔ پاکستان کے خفیہ اداروں نے دو ہزار کی دہائی کے شروع میں اسلام آباد میں ایک دفتر پر چھاپہ مارا۔ وہاں سے یہ لوگ لاہور منتقل ہو گئے۔ یہ الگ داستان ہے جو میں ترکی پر اپنی کتاب ''ترک ناداں سے ترک دانا تک'' میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ اب آگے چلتے ہیں۔ گولن صاحب نہ صرف یہود ونصاریٰ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ گولن صاحب یہودی ربی کو ہدیہ پیش کر رہے ہیں۔ عیسائیوں کا پوپ ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اکرام کر رہا ہے۔ "ولن ترضی عنك الیهود و لا النصاری حتی تتبع ملتهم۔" ایف بی آئی نے 2009ء میں بتایا کہ یہ فری میسن اور سی آئی اے سے خفیہ روابط رکھتے ہیں۔ وسط ایشیائی کے ممالک میں سی آئی اے اور کے جی بی کی پیشہ ورانہ رقابت چلتی رہتی ہے۔ ان کے اسکولوں کے ذریعے سی آئی اے کے ایجنٹ وہاں جا کر اپنا کام کر رہے تھے۔ جب ان کو پہچان لیا گیا تو وسطی ایشیا کے سات ممالک میں ان پر پابندی لگ گئی۔ گولن صاحب کے امریکا میں رہائش پذیر ہونے میں سی آئی اے کے دو ایجنٹوں نے مدد کی ہے۔ ان کا سی آئی اے سے اس قدر رابطہ تھا کہ روس کی حکومت نے ان کی تحریک کے اسکولوں پر پابندی لگائی۔ 2002ء سے 2004ء تک 20 سے زیادہ کارکنوں کو بے دخل کیا گیا۔ ان پر الزامات کی بنیاد یہ تھی کہ یہ لوگ سی آئی اے کے لیے کام کرتے تھے۔

صلیبی اوقاف کے احیاء کا مشن:

اردگان صاحب کبھی فلسطین پہنچ جاتے ہیں، کبھی برما پہنچ جاتے ہیں، جہاں کوئی نہیں گیا، کبھی صومالیہ میں وہ مدد کرتے ہیں، کبھی پاکستان میں سیلاب زدگان کی خبر گیری کرتے ہیں، کبھی بنگلہ دیش کے معمر مسلمان لوگوں کی پھانسی کے خلاف بولتے ہیں۔ گولن صاحب کا ہم نے ایک لفظ دنیا کے مظلوم مسلمانوں کے بارے میں نہیں سنا، اگر سنا ہے تو عیسائیوں کے بارے میں سنا ہے۔

عیسائیوں پر کیا ظلم ہوا ہے؟ ترکی میں جو عیسائی اوقاف ہیں..... خود آیا صوفیہ بھی اوقاف میں شامل ہے..... بڑے بڑے گرجا ہیں، بڑی بڑی عمارتیں ہیں، وہ سب اوقاف کی تحویل میں ہیں۔ گولن صاحب کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ آواز اٹھائیں کہ عیسائی حضرات پر ظلم ہو رہا ہے۔ ان کی واضح طرف داری ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے زور لگاتے ہیں کہ جس طرح اسلامی اوقاف کا احیاء ہے اس طرح ان کا بھی احیاء کریں۔ میں نیا ستنبول کے علاقے فاتح میں ایک بڑا قدیم گرجا دیکھا، کہا یہ جاتا ہے کہ جس طرح آیا صوفیہ مشرقی عیسائیوں کا مرکز تھا تو اس طرح یہ والا گرجا مغربی عیسائیوں کا مرکز تھا۔ وہ ایک متروکہ وقف ہے۔ ہمیں جب اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس وقت ہمیں وہاں کے قریبی لوگوں نے بتایا کہ یورپی لوگ یہاں آ کر منہ مانگی قیمت پر قرب و جوار کے مکانات خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے یہودیوں نے القدس کے قریب مکانات خریدے اور فلسطین میں جائیدادیں بنائیں۔ پھر وہاں انہوں نے ریاست قائم کر لی۔ اسی طرح عیسائی حضرات یہاں بھی یہی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ترکی کے علماء اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ اس پر نظر رکھو کہ اگر وہاں کوئی جائیداد بکے تو آپ لوگ مل جل کر خرید لو یا کم از کم ایسے مسلمان کو بیچو جس کو آپ جدی پشتی جانتے ہوں۔ کسی غیر مسلم کو ہرگز نہ بیچنا۔ جبکہ گولن صاحب کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ گرجا آباد ہو جائے اور صلیبیوں کو واپس مل جائے۔ اس کی تصویر میں آپ کو دکھاؤں گا۔

اتحاد بین المذاہب نہیں، دعوت الی خیر المذاہب:

یہ ایک عرب عالم کا مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے: گولن صاحب کا کرسچن حضرات کے لیے کام کرنا۔ کرسچن حضرات کی تقریب کے انعقاد میں گولن صاحب نے مدد کی جس پر انہوں نے گولن صاحب کو مدعو کیا۔ گولن صاحب تشریف لے گئے، عیسائی پادری نے گولن صاحب کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں آپ سے پیار ہے۔ ہم ایک ہی زمانے میں رہ رہے ہیں۔ ان سب باتوں سے آگے بڑھ کر ہمیں عملی اقدامات کرنے چاہییں۔ یہی اتحاد بین المذاہب کا آخری نتیجہ ہے کہ آپ ان کے لیے کام آجائیں، وہ آپ کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ اتحاد کا نظریہ جو لوگ لے کر چل رہے ہیں، عیسائی حضرات سے ان کے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ گولن صاحب کو شیخ سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ کا مرید بتایا جاتا ہے، تو ان کے رسالہ النور میں اتحاد بین المذاہب نہیں ہے بلکہ دعوت الی المذہب ہے۔ اور مذہب سے مراد برحق مذہب یعنی اسلام ہے۔ انہوں نے کبھی اس طرح کے محبت نامے نہیں بھیجے لیکن ان کا طریقہ ان کے استاد اور شیخ کے برخلاف ہے۔ عیسائی حضرات کے ساتھ گولن صاحب کی مختلف تصاویر موجود ہیں جن میں عیسائی حضرات گولن صاحب کو اپنی خصوصی تقریبات میں مختلف اشیاء بطور تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ بدلے میں پھر گولن صاحب بھی ان کو اپنی مساجد میں بلاتے ہیں۔ یہ ایک مسجد کی تصویر ہے جس میں تین عیسائی حضرات آئے ہوئے ہیں۔ یہ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں، صلیب گلے میں ہے، الٹا ہاتھ سیدھے ہاتھ پر ہے۔ یہ ایک اور تصویر ہے جس میں یہود کے چیف ربی صاحب موجود ہیں جن کی مکمل داڑھی ہے جبکہ گولن صاحب کی داڑھی نہیں ہے۔ یہ ایک اور تصویر ہے جس میں وہ ایک اور یہودی ربی بیٹھے ہیں۔ داڑھی ان کی بھی نظر آرہی ہے، گولن صاحب بغیر مذہبی شعائر اپنائے ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے قریبی تعلقات کی دلیل ہے۔ اردگان اور اردگان سے پہلے جو سیکولر ترک حکمران گذرے ہیں ان سے گولن صاحب کے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ لیکن اسلام پسندوں سے ان کی مخاصمت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ نجم الدین اربکان کی حکومت کے خلاف فوج نے مارشل لاء لگایا تو گولن صاحب نے اربکان صاحب کے خلاف اور سیکولر فوج کے مارشل لاء کے حق میں بیانات دیے۔

ملحدین سے قربت اور اسلام پسندوں سے مخاصمت:

مغربی این جی اوز اور سیکولرازم سے ان کی کوئی مخالفت نہیں تھی، سلیمان دیمرل سے کوئی مخالفت نہیں تھی، تانسو چلر سے کوئی مخالفت نہیں تھی، اگر تھی تو عدنان میندریس، نجم الدین اربکان اور اب طیب اردگان سے مخالفت ہے۔ یہ چند تصویریں ہیں۔ اس میں یہ سیکولر حکمرانوں کے ساتھ بہت محبت کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ان کی اردگان کی مخالفت کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہیے کہ انہوں نے مصری ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ یورپی طاقتوں کو ترکی کا انتظام کر دینا چاہیے قبل اس کے کہ ترکی ان پر حملہ آور ہونے کے قابل ہو جائے۔ اس مصری ٹی وی کا مالک وہ شخص ہے جس نے مصری صدر محمد مرسی کے خلاف سیسی کے انقلاب میں سب سے زیادہ فنڈنگ کی تھی۔ گولن صاحب کے اس بیان کی ویڈیو مل سکتی ہے۔ جو حضرات لینا چاہتے ہیں ان کو یہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ وہ تاریخی عمارت ہے گرجا کی، عیسائیوں کے ہاں اس کی بڑی تعظیم ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے ہاں دمشق یا قرطبہ کی جامع مسجد کو بڑا سمجھا جاتا ہے، اس طرح عیسائیوں کے ہاں اس عمارت کو بڑا اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس عمارت کو لینے کے لیے صلیبی بے چین ہیں اور کرب میں مبتلا ہیں کہ کسی طرح انہیں مل جائے، اسی لیے وہاں پر شیخ محمود آفندی صاحب اپنے مریدوں پر نے پابندی لگائی ہوئی ہے کہ ایک ایک انچ پر نظر رکھی جائے کہ کوئی جگہ کسی غیر مسلم کو بک نہ جائے۔ گولن صاحب کی پوری تحریک کوشش کرتی ہے کہ اس طرح کی متروک عمارتوں کی تولیت عیسائی حضرات کو مل جائے۔ بدلے میں گولن صاحب کو کیا ملتا ہے؟ اس طرح کی تحریریں ملتی ہیں۔ یہ ایک تحریر ہے، یہ تحریر کانگریس کے کچھ ارکان کی جانب سے لکھی گئی ہے گولن صاحب کو سہولتیں کی حمایت، اس پر اصرار دینے اور اردگان نے ان پر جو پابندیاں لگائی تھی اس کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت جو فوجی بغاوت ہوئی ہے یہ پہلی

کوشش نہیں ہے، یہ آخری انتہائی کوشش تھی۔ اس سے پہلے وہاں یہ کوشش کی گئی کہ وہاں گولن صاحب کے جو افراد تعلیمی اداروں میں موجود ہیں، میڈیا میں موجود ہیں، پولیس میں عدلیہ میں موجود ہیں، ان کے ذریعے سے کسی طرح سے اردگان کے بیٹے۔ ان کے وزراء کے کچھ راز حاصل کیے جائیں اور کوئی اسکینڈل کھڑا کر کے ان کی حکومت کو گرانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے جواب میں جب ان کے اخبار وغیرہ جو میڈیا اس سازش میں شریک تھا، اس پر پابندی لگی تو ان پابندیوں کے خلاف ان کو نرم کرنے کے لیے، گولن صاحبان کی جان چھڑانے کے لیے امریکی کانگریس کے ارکان نے یہ خط لکھا ہے۔ جیسے آج کل یہ کوشش ہو رہی ہے کہ باغیوں کو پھانسی نہ دی جائے۔ اگر دنیا میں پھانسی کی سزا کسی کے لیے ہو سکتی ہے تو ہو، کم از کم باغی کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔ تو گولن صاحب کی اس طرح کی حمایت کی گئی تھی کہ اگر حکومت گرانے کی سازش کر لی تو کیا ہوا؟ اس سازش میں شریک اخبار کو آپ کیوں بند کر رہے ہیں؟

فتح اللہ گولن کے خطرناک عقائد:

گولن صاحب کے عقائد کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان پر غور کیا جائے تو ان کے عقائد میں خلل کافی شدید قسم کا ہے۔ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس ویڈیو میں یہ کہا گیا ہے کہ لا الہ الا اللہ کافی ہے، محمد رسول اللہ کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی ابراہیم خلیل اللہ کہتا ہے تو حرج نہیں ہے۔ موسیٰ کلیم اللہ کہتا ہے تو حرج نہیں ہے۔ عیسیٰ مسیح اللہ کہتا ہے تو حرج نہیں ہے۔ حرج نہ ہونے میں کس کو کلام ہے۔ لیکن حرج نہ ہونے کا مطلب کیا ہے؟ دراصل وہ یہ بات کہنا چاہتے ہیں جو تمام مستشرقین اور متجددین کہتے ہیں۔ اس آیت کی غلط تعبیر لے کر: "ان الذین آمنوا و الذین هادوا، و النصاری، و الصابئین۔" دنیا میں جو بھی مذہب ہے "من آمن باللّٰہ و الیوم الأخر و عمل صالحا" تو اس کو بھی جنت ملے گی۔ یہ اصل میں یہ کہنا چاہتے

ہیں۔ اس الزام کو ہم ایسے آسانی سے تسلیم نہیں کر لیتے لیکن گولن صاحب کی ویڈیو موجود ہے۔ اپنے منہ سے انہوں نے یہ الفاظ کہے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کافی ہے اور محمد رسول اللہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے تو بھی ٹھیک ہے کوئی کچھ اور کہتا ہے تو پھر بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے ہاں بھی بڑے مشہور متجدد ہیں۔ قارورہ سے قارورہ ملتا ہے۔ ان کی بھی یہ باتیں میں سن چکا ہوں۔ یہ جنت جو ہم لوگوں نے صرف اپنے نام کر لی ہے کس نے ہم کو اس کا حق دیا ہے؟ ایمان جو بھی لاتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے قرآن کہتا ہے "فلهم أجرهم عند ربهم" تو آپ کہاں سے محمد رسول اللہ کی شرط لگا لیتے ہیں؟ اور کہاں سے آپ یہ کہہ دیتے ہیں کہ "لو كان موسى حيا لما وسعه إلا اتباعي۔" آخری نبی پر ایمان لائے بغیر، منہ سے اس کا اس کا اقرار اور دل سے تصدیق کے بغیر جنت میں نہیں جا سکے گا، آپ لوگوں نے کہاں سے اضافہ کر لیا ہے؟ یہ کچھ باتیں ان کے بارے میں کہی جاتی ہیں جو بہت خطرناک ہیں۔

انقلابات لانے کا طریق کار:

ان کی یہ جو "خدمت تحریک" ہے اس کا خلاصہ کیا ہے؟ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں بہترین افراد تیار کرو، پاکستان سے لے جاؤ، افریقہ سے لے جاؤ، دنیا بھر سے بھی لاؤ، پاکستان کے صحافیوں کو دورہ کراؤ، بیوروکریٹس کو دورہ کراؤ، وزراء کو دورہ کراؤ، اور بہترین طالب علم کو جب پڑھاؤ تو پھر ان کو سرکاری اداروں میں بھرتی کرو۔ ان اداروں میں بھرتی کرو جو ملک کو چلاتے ہیں۔ عدلیہ میں، مقننہ میں، فوج میں، پولیس میں، انٹیلی جنس میں، ہر طرف سے گھیرو۔ ان کی تحریر ہمیں ملی ہے جس کے الفاظ ہیں دھیرے دھیرے دھیمے دھیمے خاموشی سے اپنا وجود بڑھاتے جاؤ اس وقت تک جب تک آپ کو پکار نہ آ جائے۔ 14 جولائی کی رات پکار آئی تھی۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس پر لبیک کہنے والے ہاتھ باندھ کر سڑک پر ڈال دیے گئے۔ یہ ان کا طریقہ کار

ہے۔ تعلیمی اداروں سے افراد کی تیاری اور پھر ان افراد کو سرکاری اداروں میں بھرتی کرنا، عہدوں تک پہنچانا اور پھر ان کے ذریعے سے انقلاب لانا۔ اب تک ہم نے تصاویر کی مدد سے گولن صاحب کے افکار ونظریات کا کچھ مطالعہ کیا۔ اب ہم آپ کو کچھ ویڈیوز کے بارے میں بھی بتاتے ہیں جن میں گولن صاحب کے مندرجہ بالا افکار ونظریات کے ثبوت موجود ہیں۔ گولن صاحب امریکا کی ریاست پنسلوانیا کے علاقے سیلرز برگ میں رہتے ہیں۔ وہاں ان کا 400 ایکڑ پر مشتمل وسیع وعریض محل اور "خانقاہ" ہے۔ ان کے مرید لوگوں میں مشہور کرتے ہیں وہاں صحاح ستہ کا درس ہوتا ہے، وہاں تصوف کے حوالے سے ابن عربی کی کتب پڑھائی جاتی ہیں اور وہاں ایک روحانی شخصیت موجود ہے۔ اس ویڈیو میں ان کے بارے میں پڑوسی سے پوچھا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ پراسرار جگہ ہے، یہاں ہیلی کاپٹر آتے ہیں، کسی کو اس جگہ جانے کی اجازت نہیں دی جاتی، اس کے قریب گاڑی پارک نہیں کی جاسکتی۔

اردگان اور پانچ کسوٹیاں:

ایک عرب عالم شیخ وائل الحنبلی نے لکھا ہے کہ جب ہم دمشق میں ہوتے تھے تو ان کی تحریک کے جو ارکان وہاں آتے تھے وہ انتہائی پراسرار ہوتے تھے۔ کسی عالم سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ سنت کا سب سے بڑا حافظ، اور حدیث کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ان کا شیخ ہے۔ کسی سیاست دان سے ملتے تو کہتے امت کے سیاسی مفاد کا سب سے بڑا نگہبان ان کا شیخ ہے۔ اگر کسی تاجر سے ملیں تو ان سے کہیں تجارت میں لگے رہو، امت کی خدمت کرو۔ اسلام سارے کا سارا یہی ہے۔ اگر کسی صوفی سے ملیں تو ان پر حال اور وجد طاری ہو جاتا ہے اپنے شیخ کا ذکر کرتے کرتے۔ یہ عرب عالم نے لکھا ہے۔ عربی میں بھی تحریر موجود ہے، اس کا ترجمہ بھی موجود ہے۔

اردگان کو پرکھنے کی پانچ کسوٹیاں:

اب ہم اردگان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان ہی پانچ معیارات پر جن پر ہم نے گولن صاحب کا تجربہ کیا ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسان کے اپنے قول وفعل کا جائزہ لیا جائے۔ دوسرا محدثین کا طریقہ ہے کہ اس کے اساتذہ کو دیکھا جائے، جن سے اس نے استفادہ کیا ہے اور اس کے شاگردوں کو دیکھا جائے جو اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ تیسرا فقہاء والا کہ "تزكية السر و العلانية" کیا جائے کہ ایک انسان اپنے ہم نشینوں سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ اپنے محلے میں کدھر بیٹھتا ہے؟ مسجد میں آتا ہے؟ یہ سود خوری تو نہیں کرتا؟ قمار بازی تو نہیں کرتا؟ جمعہ نماز میں حاضری دیتا ہے؟ اپنے ہم نشینوں سے انسان پہچانا جاتا ہے۔ گولن صاحب کا ہم نشین سلیمان دیمرل ہے، تانسوچلر ہے۔ نہیں ہے تو عدنان میندرس نہیں ہے۔ نجم الدین اربکان نہیں ہے طیب اردگان نہیں ہے۔ یہ تین طریقے ہوگئے۔ چوتھا یہ ہے کہ عالمی سطح پر باطل کس کو پسند کرتا ہے؟ پروان چڑھاتا ہے؟ پناہ دیتا ہے؟ حمایت کرتا ہے؟ دفاع کرتا ہے؟ اور حق والے کس کے لیے روتے ہیں اور اس کے بارے میں کیا سمجھتے ہیں؟ اور پانچواں اور آخری طریقہ یہ ہے کہ اس کی محنت کا حاصل اور ثمرہ کیا ہے؟ ان پانچوں معیارات پر ہم اردگان کو بھی پرکھتے ہیں اور تنقیدی نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ "إنما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين أخويكم"۔ دو مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ اب اگر دونوں نظریاتی طور پر ٹھیک ہیں، عملاً اجتہادی اختلاف ہوگیا ہے تو صلح کروادو۔ اگر نظریہ ہی ٹھیک نہ ہو اور عمل سے کسی اور کو فائدہ ہوتا ہو اس کی ہم کیا اصلاح کریں گے؟ اس کی ہم کیا اصلاح کریں گے جو ساری دنیا کی اصلاح کرنے نکلا ہوا ہے۔ پہلی چیز پر غور کرتے ہیں۔ "معرفة كل شيء عند أهله"۔ ترکی کے علماء اردگان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد آج تک کوئی حکمران کسی عالم کے پاس گیا ہے؟ کسی مسجد و مدرسہ میں گیا ہے؟ یا اس نے مسجد کے میناروں سے اذان بند کروائی ہے۔ مسجد کے ہالوں میں گھوڑے بندھوائے ہیں۔ کمال اتاترک کے دور میں عربی تحریر، عربی جنتری، عربی تقویم کسی

کے پاس مل جائے تو تھانہ۔ یہ میں سن کر آیا ہوں، دیکھ کر آیا ہوں۔ بعض مسجدوں میں دو دو نمازیں اذانیں ہوتی ہیں: ایک پچھلے ستر سال کی قضا اور ایک ادا۔ ترکی کی سیکولر فوج سیکولر آئین کی محافظ ہے۔ ترکی دنیا کا وہ ملک ہے جہاں کی فوج کی ذمہ داری ہے کہ ملک میں آئین سیکولر باقی رکھے، اس کو نہ بدلنے دے۔ ایسے ملک کا حکمران اگر جنوبی ترکی کی ایک مسجد و مدرسہ میں جاتا ہے علماء کے پاس جاتا ہے تو ہم کو سب سے پہلے اس ملک کے علماء سے پوچھنا چاہیے۔ یہ ہیں صدر عبد اللہ گل، یہ مسجد میں گئے ہیں وہاں کے مقامی علماء و عمائدین ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ ترکی کے ایک عالم استاد خیری صاحب ہیں۔ یہ دار العلوم کراچی کے فاضل ہیں اور استاد محترم شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خصوصی شاگرد ہیں۔ یہ ان کا صاحب زادہ ہے۔ یہ دکتور خیری صاحب کا بیٹا ہے۔ یہ بغاوت والے دن استنبول ایرپورٹ پر جہاز کے سامنے ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اشارہ کیے ہوئے کھڑا ہے۔

ترکی کے علماء و مشائخ اور اردگان:

یہ شیخ محمود آفندی دامت برکاتہم کے مریدین ہیں۔ آج کل ترک عوام راتوں کو دیر تک جاگتے ہیں تاکہ بغاوت کی کوئی دوسری کوشش نہ ہو جائے۔ یہ صوفیاء بھی ان کے ساتھ دیر تک جاگتے ہیں۔ حضرت شیخ کا حکم ہے ان کو۔ یہ حضرت شیخ کے مریدین ہیں۔ یہ ان کا اسلامی لباس ہے۔ یہ کھلی کھلی شلوار بناتے ہیں اور اس میں بیلٹ کی جگہ بھی بناتے ہیں کیونکہ کمال اتاترک نے پابندی لگائی تھی کہ ہمارا لباس شلوار نہیں ہوگا پینٹ ہوگا تو یہ حضرات اس طرح سے پینٹ سے شلوار کی شکل بنا لیتے ہیں۔ مریدین کو حکم ہے کہ تم عوام کے ساتھ بیٹھو۔ ہمارے پاس ویڈیو موجود ہے کہ فاتح میں جہاں حضرت کی خانقاہ ہے وہاں سے حضرت کے مریدین درود شریف پڑھتے ہوئے حضرت کے حکم پر نکلتے ہیں اور دو جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک ترکی کا جھنڈا ایک

جماعت کا جھنڈا۔ پھر وہ درود شریف پڑھ کر، عربی نظمیں پڑھ کر جاتے ہیں عام لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں کہ اردگان کے خلاف نکلنے والے ان باغیوں کو ناکام کرو۔ یہ اردگان کی جماعت کا ایک کارکن ہے۔ یہ پاکستان آیا ہے۔ اس کا ذمہ کیا ہے؟ اسلامی ممالک سے جو طلبہ ترکی میں پڑھنے آئے ہیں ان کو یہ مہمان طالب علم کہتے ہیں غیر ملکی طالب علم نہیں کہتے۔ ان سب کو سہولیات فراہم کرنا، تعلیم کے اندر لیے وظیفہ دینا، ان پر محنت کرنا، اسلامی نظریہ دینا، یہ اس کام کا ذمہ دار ہے۔ یہ دارالعلوم کراچی کی دورہ حدیث کی درس گاہ میں بیٹھا ہے۔ یہ دورہ حدیث کے طلبہ ہیں۔ یہ جب کراچی آیا تو اس نے بتایا کہ میں اٹھائیس ملکوں میں جا چکا ہوں یہ انتیسواں ملک ہے۔ یہاں مجھے مدارس میں لے جاؤ۔ یہ اس وقت وہاں مدرسہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شیخ یوسف قرضاوی ہیں۔ یہ مشہور عالم ہیں۔ قطر میں ہوتے ہیں۔ بغاوت کے بعد تازہ بیان دے رہے ہیں۔

ترک عوام اور اردگان:

یہ بوڑھا بابا اپنی نوجوانی کے دنوں میں عثمانی فوج میں تھا۔ خلافت عثمانیہ 1924ء میں ساقط ہوئی۔ یہ عثمانی لباس پہن کر اس بڑھاپے میں اردگان کی حمایت میں روڈ پر نکل آیا ہے۔ یہ ایک پردہ دار خاتون ہے جو میڈیا پر بہت مشہور ہوئی۔ یہ ڈنڈہ لے کر روڈ پر نکلی ہے۔ یہ دوسری نے بیلن اٹھایا ہوا ہے، یہ سب پردہ دار خواتین ہیں۔ یہ اردگان کی حمایت میں گھروں سے نکلی ہیں۔ ترکی میں پردہ ممنوع تھا۔ اردگان نے پردہ کی اجازت دی۔ یہ خاتون ہے جو گھر سے روٹی کا بیلن لے کر آئی ہے۔ یہ ایک لڑکا ترکی کی خاص روٹی ''سمیت'' بیچ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ہم نے سمیت بیچی ہے، پانی بیچا ہے، وطن نہیں بیچا۔ یہ لوگ فجر کی نماز روڈ پر پڑھتے ہیں۔ گولن صاحب کے بارے میں جو استفتاء آیا تھا اس میں یہ بھی درج ہے کہ نماز سمیت کوئی بھی چیز ایسی ضروری نہیں ہے کہ اگر کسی ماحول میں آپ فٹ نہ ہو رہے ہوں تو اس کو کریں۔ ایک چیز میں آپ کو اور بتاتا

ہوں ہزمت موومنٹ کے تین ادارے پاکستان میں کام کرتے ہیں۔ ایک ادارے نے میڈیا ورکشاپ کرائی۔ اس میں ہمارا بھی ایک ساتھی چلا گیا۔ وہ شریک تھا اس میں۔ اس اختتامی تقریب میں ایک حادثہ ہوگیا۔ اس تقریب میں کالج یونیورسٹی کے طلبہ بھی شریک تھے۔ ہمارے ساتھی نے اختتامی تقریب میں جبہ زیب تن کیا اور لال رومال سر پر رکھ کر تقریب میں گیا۔ یہ میں آپ کو بات بتا رہا ہوں 2002ء کی۔ گولن صاحب کا جو ذمہ دار ہے اسکولوں کا اس کا نام تھا ترگت۔ وہ آگیا۔ اس نے ہمارے ساتھی کے ساتھ بدتمیزی کی۔ یہ کیا ہے یہ کیا ہے؟ ایسے داڑھی میں ہاتھ مارا اور رومال کو ادھر کیا۔ کسی نے آکر بتایا کہ ایسا حادثہ ہوا ہے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے اس کو باہر بلاؤ شامیانے سے۔ جب وہ باہر آیا تو اس سے کہا: یہ آپ نے کیا حرکت کی ہے؟ کہا: آپ کو نہیں پتا کہ ہمارے ملک میں اس پر کتنی پابندی ہے؟ میں نے کہا: آپ کے ملک میں جہاں پابندی تھی وہیں میں ایک ایسا محلہ دیکھ کر آیا ہوں جہاں کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں داڑھی والا آدمی نہ ہو اور کوئی عورت ایسی نہیں ہے جس نے پردہ نہ کیا ہو۔ کیا بہانہ کرتے ہو؟ تم نے توہین کی ہے سنت رسول کی۔ اس سے بھی معافی مانگو۔ اللہ سے بھی معافی مانگو۔ نہیں تو یاد رکھنا پھر آج تک تو ہم آپ کے ساتھ چلتے رہے ہم تو کچھ اور مطلب میں تھے۔ اس کو کسی نے بتایا کہ مفتی صاحب جلالی آدمی ہیں۔ میں نے ان سے صاف کہا: یہ آپ نے توہین کی ہے سنت رسول کی۔ اور اللہ سے بھی معافی مانگیں اور ان سے بھی معافی مانگیں ورنہ آپ کی ساری تحریک لپیٹنے کے قابل ہے۔ یہ آپ کیا بہانہ بنا رہے ہیں؟ اگر پاکستان میں کوئی اسلامی لباس پہن کر آپ کی تقریب میں بطور مہمان شرکت ہوگا، اس کو آپ اس طرح بے عزت کریں گے؟ یہ ماجرا تو میں نے بھی دیکھا ہوا تھا۔ تو اس طرح کی ذھنیت ھے گولن صاحبان کی۔

اردگان پر ایک الزام کی حقیقت:

اردگان پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے بہت بڑا پرتعیش صدارتی محل تعمیر کروایا ہے۔

ہم نے جب تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ محض صدارتی رہائش گاہ نہیں ہے جہاں صرف اردگان کی فیملی رہتی ہے۔ بلکہ ترکی جیسی ترقی یافتہ مملکت کے دفاتر اس میں ہیں۔ اس محل میں ایک چھتری کے نیچے تمام حکومتی مشینری کو جمع کیا گیا ہے تاکہ سرکاری کام تیز رفتاری سے ہوسکیں۔

اس محل میں اردگان نے عالی شان مسجد تعمیر کروائی ہے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا قول یاد آ گیا۔ ولید بن عبدالملک نے جامع مسجد کو بہت عمدہ تعمیر کروایا تھا۔ نہایت اعلیٰ قسم کی تعمیر کی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ قناعت پسند اور زاہد تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ بیت المال کا مال کیوں اسراف کیا؟ واپس کرو۔ شہر کے عمائدین ان سے ملنے گئے کہ درخواست کریں کہ مسجد کو ایسا ہی رہنے دیں اس میں کچھ نہ کریں۔ حضرت نے سوچنے کے لیے وقت لیا۔ اگلے دن واقعہ یہ ہوا کہ روم سے عیسائیوں کا وفد آیا ان کے پوپ نے دیکھا کہ دنیا پروپیگنڈا کرتی ہے کہ عرب بدو، گنوار، پسماندہ ہیں۔ یہ ان کا عبادت خانہ ہے۔ "فخرّ مغشیا علیه"۔ وہ تو دکھ اور صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گرا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر اتنی دولت کا یہ حاصل ہو کہ قسیس اس کو دیکھ کر بے ہوش ہو جائے تو یہ بھی بہت ہے۔

اردگان اور دینی شعائر سے لگاؤ:

بغاوت کے خلاف جرمنی میں ترکوں نے مظاہرہ کیا بہت بڑا۔ اس مظاہرے میں شرکاء نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کی اسلام پسندی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مواقع پر اچھے اچھے دین دار لوگوں سے نماز قضاء ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر ان لوگوں کی ہے جنہوں نے تقسیم اسکوائر پر فوجی ٹینکوں کو روکا ہے۔ باسفورس پل پر ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے ہیں۔ ہمارے علماء کو، ائمہ حضرات کو، دینی تحریکوں کے سربراہان کو ان کا ساتھ دینا چاہیے جیسے اکابر علماء دیوبند نے خلافت عثمانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ اردگان کا تعلق کسی نہ کسی طرح علماء سے دینداروں سے ملتا ہے۔ ہمارے

ہاں صدر مشرف صاحب کو شوق تھا نماز کی امامت کرنے کا، امامت کروانے کا۔ انہوں نے اسلام آباد کی یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر منظور احمد کو بلایا۔ ہم نے اتنا سرمایہ خرچ کر دیا یونیورسٹی پر۔ صرف فوج میں جو امام درکار ہیں وہ بھی آپ ہمیں نہیں دے سکتے؟ یہ مدرسہ کا فاضل بینک میں شرعی ایڈوائزر لگتا ہے۔ یہی فوج میں امام وخطیب لگتا ہے۔ اور یہی ساری مسجدوں میں امام خطیب لگتا ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے؟ آپ فوج کے لیے امام نہیں دے سکتے؟ تو انہوں نے کہا کہ فجر کی نماز کے لیے کون اٹھے گا؟ یہ ملا فجر کی اذان سے پہلے اٹھ جاتے ہیں اور کم تنخواہ پر گذارہ کر لیتے ہیں۔ جبکہ ہمارے فضلاء کم سے کم پینتیس ہزار روپے اسٹارٹنگ تنخواہ بمع بونس والاؤنس کا مطالبہ کرتے ہیں اور فجر ہمارا اگر یجویٹ کبھی بھی نہیں پڑھائے گا۔ فجر اور عشاء بڑی بھاری ہے ان لوگوں پر۔ یہ شیخ محمود آفندی دامت برکاتہم ترکی کے سب سے بڑے روحانی رہنما، پیشوا، بزرگ ہیں۔ ان کی رجوع الی اللہ کی تحریک کا ترکی میں بہت بڑا بنیادی کردار ہے۔ یہ ایک ادارہ ہے باب العالم۔ اس میں دنیا بھر سے آئے ہوئے طلبہ کو ایک ایک کیبن بنا کر دیا گیا ہے۔ اس کا لوگو "نحن أمة واحدة" ہے۔ اردگان بہت اچھی تلاوت کرتے ہیں۔ اپنی گفتگو میں ان شاء اللہ، بفضل اللہ، الحمدللہ وغیرہ کا استعمال بہت کرتے ہیں۔ یہ ایک تصویر ہے جس میں اردگان کو روضہ رسول پر حاضری دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ علماء کو چاہیے ایسی چیزوں کی تحقیق کے لیے وہ ترکی کا دورہ کریں اور خود اپنی آنکھوں سے حقائق کا جائزہ لیں۔ عبداللہ گل (سابق صدر ترکی) کے والد احمد گل ترکی کے صدر کا والد ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ سے محنت مزدوری کرتے ہیں۔

عالم اسلام کی مشہور شخصیات اور اردگان:

اب ہم آتے ہیں عالم اسلام کے چیدہ چیدہ علمائے کرام، مشہور شخصیات اور تحریکات کے مکاتیب کی طرف۔ اگر گولن صاحب کی حمایت میں ہمیں کوئی مکتوب مل جائے تو ہم کو ان کے ساتھ اپنا

وزن ڈالنا چاہیے اور اگر اردگان کے حق میں مل جائے تو "فماذا بعد الحق إلا الضلال" یعنی اس زمین پر ہم حق کو پہچاننا چاہیں تو ہم دیکھیں گے کہ حق کے سربراہان کون ہیں؟ علماء ہیں، مشائخ ہیں۔ علماء ومشائخ میں سے وہ لوگ جن کے علم وتقوی پر جمہور امت کو اعتماد ہے۔ ان کو ان دونوں میں سے کس پر اعتماد ہے؟ اردگان صاحب اور گولن صاحب کے بارے میں خطوط کا موازنہ کریں تو پہلا خط ہمیں ملتا ہے دارالعلوم دیوبند ہندوستان کی طرف سے اردگان صاحب کو مبارک باد کا اور ان کی حوصلہ افزائی کا۔ دارالعلوم دیوبند (وقف) کی طرف سے بھی ان کو خط بھیجا گیا ہے۔ جمعیت علماء ہند کی طرف سے بھی تہنیت اور حوصلہ افزائی کا خط گیا ہے۔ سید سلمان حسن ندوی صاحب نے بھی اپنی فصیح عربی میں ترکی حکومت کے نام خط لکھا ہے۔ ہمارے پاکستان میں اس وقت شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب اللہ تعالی کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک متواضع بندے ہیں۔ علم میں، تقوی میں، خدمات میں ہر اعتبار سے ممتاز ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے علماء کی نمائندگی کرتے ہوئے بغاوت کی ناکامی پر مبارک باد کا خط لکھا۔ ان کے بھائی حضرت مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم انہوں نے بھی خط لکھا۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) کی طرف سے بھی خط لکھا گیا۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے بھی خط لکھا۔ اس وقت اجماع کی سی ایک کیفیت بن رہی ہے۔ تعامل امت اور اتفاق علماء عصر بحکم اجماع ہوتا ہے۔ یہ خط پاکستان کے پچاس سرکردہ علماء نے لکھا ہے۔ علماء افریقہ کی جانب حضرت مولانا شبیر احمد سلوجی صاحب دامت برکاتھم نے بھی ترکی حکومت کو خط لکھا ہے۔ بریلوی علماء میں سے مفتی منیب الرحمٰن صاحب جو معتدل مزاج کے حامل ہیں اور رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین ہیں، انہوں نے بھی ترکی حکومت کو خط لکھا ہے۔ مکاتیب کا سلسلہ ختم ہوا۔

عالم اسلام کے لیے اردگان کی خدمات:

اگر ہم عالم اسلام کے لیے اردگان کی خدمات کا جائزہ لیں تو ان کی خدمات کو کئی حصوں میں

تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم مظلوم و بے کس مسلمانوں کے حوالے سے بات کریں گے۔ اردگان نے فلسطین، شام، برما اور بنگلہ دیش کے لیے کیا کیا ہے؟ اس وقت آسمان کے نیچے زمین پر دیکھیں تو جس گھر سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ مسلمان کا گھر ہے۔ اور کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں ہے۔ کوئی بھی مسلمانوں کا والی وارث نہیں ہے۔ "و اجعل لنا من لدنك وليا، و اجعل لنا من لدنك نصيرا." اردگان نے فلسطین کے لیے فریڈم فلوٹیلا بھیجا۔ ان کے ساتھیوں کو شہید کیا گیا۔ یہ پھر بھی باز نہیں آئے۔ انہوں نے اسرائیلی حکومت سے ہرجانہ بھی لیا اور دوبارہ مدد بھی بھیجی۔ غزہ کے محصورین کے لیے عید کے موقع پر امدادی سامان بھیجا ہے۔ اس سال پھر غزہ اس وقت چاروں طرف سے اسرائیل کے محاصرے میں ہے۔ پوری دنیا میں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ان کی مدد کرے۔

افغان مہاجرین کو ہم نے پناہ دی لیکن بہت اچھا اکرام نہ کر سکے۔ کچھ ہم غریب تھے کچھ ہم سنگ دل تھے۔ ترکوں کو اللہ نے دولت بھی دی تھی اور یہ رحم دل بھی تھے۔ انہوں نے شامی مہاجرین کا شاندار استقبال کیا۔ شامی مہاجرین کے خیموں میں وہ سہولیات دی گئی ہیں جو کسی خاص معزز مہمان کو دی جاتی ہیں۔ مہاجر کی خدمت کوئی احسان نہیں ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ اس پر فخر کا دعوی نہیں کرنا چاہیے، لیکن کوئی تیسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ مہاجرین کی ایسی اعلی خدمت صرف ترکی نے ہی کی ہے۔

برما کے مسلمانوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پٹخ پٹخ کر مارا گیا۔ بنگلہ دیش میں معذور بزرگوں کو پھانسی دی گئی۔ اردگان کے سوا کسی نے مظلوموں کے حق میں آواز بلند نہیں کی۔ انہوں نے بنگلہ دیش سے اپنے سفیر کو واپس بلا لیا اور بنگلہ دیش کے سفیر کو واپس بھیج دیا۔

ہماری آج کی نشست کا پہلا حصہ مکمل ہوا۔ ہمیں غور و فکر کرنا چاہیے کہ ان حقائق کی روشنی

میں استفتاء میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات کیا ہونے چاہئیں؟

☆☆☆☆☆☆☆

سوالات وجوابات:

اب ہم سوالات جوابات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ کوئی ہمارے دوست، مہمان، بزرگ سوال کرنا چاہیں تو کھلے دل سے کر سکتے ہیں۔ میں کسی شخصیت کا وکیل نہیں ہوں۔ انسان کو حق کا وکیل ہونا چاہیے۔ میں اپنی تحقیق کی روشنی میں جس چیز کا قائل ہوں اس کو بولوں گا۔ آپ علماء حضرات ہیں میں آپ پر اپنی رائے مسلط کر ہی نہیں سکتا۔ البتہ حق کی طرف پہنچنے کی مل جل کر مشترکہ کوشش ہونی چاہیے۔ نہ آپ مجھے نیچا دکھائیں نہ میں آپ پر اپنی رائے کو مسلط کروں۔ میں ایک طالب علم ہوں اگر مجھے کسی چیز کا جواب نہیں آتا ہے تو میں آپ سے یا اپنے بڑوں سے پوچھ لوں گا کہ آپ ہی مجھے سمجھا دیں۔

ترکی میں اصلاحی تحریک کس نے شروع کی؟

ایک سوال یہ ہے کہ کمال اتاترک کا جبری دور اور اس کی باقیات کے ختم ہونے کے بعد ترکی میں کس نے اصلاحی کام شروع کیا؟

علماء، مشائخ اور ان کے متعلقین نے شروع کیا۔ عدنان میندریس سے پہلے پہلے کمال پاشا کی باقیات کا غلبہ تھا۔ عدنان میندریس پہلا حکمران تھا جو درحقیقت نقشبندی تھا۔ نقشبندی مشائخ سے فیض یافتہ تھا۔ ترکی حضرات عقیدے کے اعتبار سے سارے کے سارے ماتریدی ہیں۔ مسلک میں دیوبندی ہیں۔ تصوف میں نقشبندی ہیں۔ عدنان میندریس بھی نقشبندی تھا۔ اس کو صرف اذان کی اجازت دینے کے جرم میں پھانسی دی گئی۔ اس کے بعد مارشل لا آیا۔ پھر نجم الدین اربکان نے علماء و مشائخ کی اجازت اور

دعاؤں سے کام شروع کیا۔ اربکان کا شاگرد ہے اردگان۔ 35،40 سال پہلے پاکستان سے ایک پاکستانی طالب علم ترکی گیا تو یونیورسٹی میں نماز پڑھنے کا پوچھا۔ وہاں کے لوگوں نے کہا یہاں نماز کا نام نہ لینا۔ اگر آپ نے نماز پڑھنی ہے تو کسی کونے میں جا کر پڑھ لو۔ اس کو نظریاتی لوگوں نے دیکھ لیا تو اس سے کہا کہ نماز کے وقت ہمارے پاس آ جانا۔ وہ لوگ کمرہ بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ حمام میں نماز پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ اشاروں سے نماز پڑھتے تھے۔ کچھ مسجدوں میں کمال اتاترک کے دور میں گھوڑے باندھے جاتے تھے۔ لیکن اب ماشاءاللہ سے وہاں مساجد آباد ہوگئی ہیں۔ اردگان خود امام خطیب ہے۔ ترکی کے آئین میں یہ بات درج ہے کہ ترکی سیکولر ریاست ہوگی۔ ترکی کا آئین سیکولر ہے۔ فوج اس کی حافظ ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اردگان نے اپنی اہلیہ کو اسکارف اوڑھا دیا۔ شراب پر ٹیکس بڑھا دیا۔ اسکول اور عبادت گاہوں کے سومیٹر کے اندر اسے ممنوع قرار دیا۔ رؤیت ہلال کے نظام اور حلال وحرام کی نگرانی کے اداروں کو فعال کیا۔ آہستہ آہستہ مساجد و مدارس کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔ وہاں کے علماء حضرات کو بہت لمبے عرصے تک درس و تدریس نہ ہونے کی وجہ سے افادہ استفادہ کی ضرورت ہے۔ وہاں پر کچھ علوم کے دوبارہ احیاء کی ضرورت ہے۔

سوال: علماء کو اس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اہل علم حضرات کو وہ بات کرنی چاہیے جو انصاف پسندی اور معتدل مزاجی کے ساتھ میل کھاتی ہو۔ ایک وقت ایسا تھا کہ گولن تحریک کا معاملہ مخفی تھا۔ گولن ترکی سے فرار ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے تعلیمی اداروں میں تحریک جاری تھی۔ ملک کے چاروں ستونوں مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ، میڈیا اور افواج میں ان کے تربیت یافتہ افراد جاتے تھے۔ انہوں نے

اپنے آپ پر اسلام پسندی کا لیبل لگایا ہوا تھا لیکن سب شکوک وشبہات ان میں پائے جاتے تھے۔ سیکولرازم کے، لبرل ازم کے، جدید اسلام کے داعی ہونے کے شکوک وشبہات ان میں پائے جاتے تھے۔ ''و بضدھا تتبین الاشیاء'' جب ان کا تقابل ایسے لوگوں سے ہوا جن کے بارے میں زیادہ رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ وہ سلامتی کی طرف ہیں تو خود بخود اب ان کی طرف ہمیں اپنا رجحان ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ کسی قسم کا تعاون، حوصلہ افزائی اور سرپرستی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ رہ جاتا ہے اگلا مرحلہ بائیکاٹ اور مقاطعہ کا تو آپ علماء حضرات ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس مرحلے میں کرنا چاہیے؟ جب تک یہ چھپے ہوئے تھے تو سب کی زبانیں بھی بند تھیں۔ اب جب بات کھل کر سامنے آگئی کہ ایک بندہ جا کر کسی اور ملک میں ان کی چھتری کے نیچے بیٹھ کر ان کے منظور نظر ٹی وی پر یہ کہہ رہا ہے کہ یورپ کو ترکی پر حملہ کر دینا چاہیے قبل اس کے کہ ترکی میں خلافت رائج ہو جائے۔ اہل علم کو اپنی پوری بصیرت کے ساتھ، حق پسندی کا ثبوت دینا چاہیے۔ نہ تو ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے نہ ساتھ دینا چاہیے۔

سوال: ترکی کی طرح ہم کیسے کام کر سکتے ہیں؟

جواب: الحمدللہ! ہم نے مدارس میں مقدور بھر دینی علوم کی خدمت کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر مدرسے کو ایک وقف ادارہ، ایک معیاری اسکول، ایک اخبار ضرور نکالنا چاہیے۔ علماء کی سرپرستی میں ہر مدرسے کے ساتھ ایک معیاری اسکول ہونا چاہیے۔ ایک وقف ادارہ ہونا چاہیے۔ اصلاحی، تبلیغی دعوتی کام ضرور کرنے چاہییں۔ مدارس کی حد تک ہم خود کفیل ہیں، ان کا نصاب تیار ہے۔ علماء موجود ہیں۔ وفاق کی طرز کے ادارے موجود ہیں۔ معاشرے کے وہ بچے جو اسکول میں تعلیم حاصل کر کے حکومتی اداروں میں جاتے ہیں، ان کی تربیت کرنی

چاہیے۔ اسی طرح فلاحی کام، نومسلموں کی خدمت، مصیبت زدگان سے تعاون کرتے رہنا چاہیے۔ میڈیا کی جو جائز صورتیں ہیں، ان پر ہمیں گرفت ہونی چاہیے۔ چار بلکہ پانچ بڑے شعبوں میں جانے والے افراد آپ کے تربیت یافتہ ہونے چاہئیں۔ صرف مدرسے کے طلبہ نہیں پوری قوم آپ کی شاگرد ہونی چاہیے۔ اس کے لیے آپ کو مساجد میں درس قرآن، حدیث اور درس فقہ شروع کر دینا چاہیے۔

سوال: گولن اور غامدی صاحب کے افکار میں کیا فرق ہے؟

جواب: کافی چیزوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ جن کے شاگرد ہیں وہ ایک جیسے ہیں۔ قرآن پاک کی غلط تعبیر، صحیح حدیث شریف کا انکار، حدیث شریف کا غلط محمل، ضروریات دین میں گڑبڑ۔ عمل میں کچھ بھی نہیں۔ میں نے غامدی صاحب کے شاگردوں سے کہا کہ چلو مان لیتے ہیں کہ سنت کی وہی تعریف ٹھیک ہے جو آپ کرتے ہیں، پردہ اور داڑھی کو بھی ہم تھوڑی دیر کے لیے دین سے نکالتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ بے حیائی حرام ہے؟ سود بھی حرام ہے؟ نماز فرض ہے؟ اتنے سال سے آپ ٹی وی پر آرہے ہیں۔ کبھی آپ نے فرض نماز کا کوئی ایک مسئلہ لوگوں کو بتایا ہے، ایک مرتبہ کہا ہے کہ سود حرام ہے۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب نے اتنے بڑے عالم ہو کر نماز پر اور دعاؤں پر چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ آپ نے کبھی فرض نماز کی تلقین نہیں کی۔ الٹا آپ کہتے ہیں کہ تراویح کی نماز سنت نہیں۔ آپ فرض نماز کی ترغیب نہیں دیتے۔ جو سارا سال نماز نہیں پڑھتے اگر وہ رمضان میں تراویح پڑھ رہے ہیں تو ان کو پڑھنے دو۔ آپ کا کیا جاتا ہے؟؟؟

سود قطعی حرام ہے۔ ایک لفظ آپ سود کے خلاف نہیں بولتے۔ بے حیائی فحاشی کے خلاف نہیں بولتے۔ آپ کا سارا زور اس پر ہے کہ موسیقی اسلام میں درست ہے۔ پردہ ضروری نہیں

ہے۔ پردہ کرنے کی وجہ سے مسلمان خواتین کو کوئی بیماری یا الرجی ہو گئی ہے یا کسی میدان میں پردے نے کام کرنے سے روکا ہے؟ پردہ ہے کہاں جو آپ پردے کے خلاف بول رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے کچھ خواتین پردہ کر رہی ہیں تو آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ بے حیائی تو سب کر رہے ہیں فرض نماز کوئی نہیں پڑھ رہا، داڑھی سب منڈا رہے ہیں۔ سود سب کھا رہے ہیں اس کی فکر کرو۔ خیر کی کوئی ایک بات بتاؤ جو آپ نے آج تک کی ہو۔

گولن صاحبان کا حال بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ ان کی محنتوں کا رخ بھی ایجابیات کے بجائے سلبیات کی طرف ہے۔ تو ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کا ہدف کیا ہے؟ آپ کا مقصد حیات کیا ہے؟ اہل حق علماء آپ کے اور اردگان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ پوری دنیا کے اہل حق علماء کس کے لیے غمگین ہو جاتے ہیں؟ کس کے لیے خوش ہو جاتے ہیں؟ آپ اردگان کو ہٹا کر کونسا نظام لانا چاہتے ہیں؟ اس میں خامی کیا ہے؟ اور آپ کے نظام میں خوبی کیا ہے؟ ہم شخصیات کے نہیں نظریات کے حامی یا مخالف ہیں۔ آپ اپنا نظریہ ہمیں سمجھائیں۔ اردگان کو ہٹا کر آپ کس کو خوش کریں گے اور کس کو غمگین؟ یہ سب کچھ دیکھ کر، سب کے عقل و تجربے سے استفادہ کر کے ہمیں کوئی ایسا فیصلہ کرنا ہو گا جس میں امت کے لیے خیر ہو۔

میرے خیال میں ہم نے کافی گفتگو کر لی ہے۔ اب آج کی سب سے معزز شخصیت جو شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ کے خلفاء میں سے ہیں، سے ہماری درخواست ہے کہ وہ دعائے خیر پر اس مجلس کا اختتام کریں۔

"بغاوت
عالمی لکھاریوں کی نظر میں"

مردِ بحران......طیب اردگان

مفتی عدنان کاکاخیل

ترکی کے مردِ بحران رجب طیب اردغان نے ایک اور حملہ پسپا کر دیا۔ امریکا میں بیٹھے ایک سازشی فرد نے عالمی طاقتوں کی آشیر باد سے فوج میں اپنے زیر اثر ایک حلقے کو استعمال کرتے ہوئے ترکی کی منتخب اور مقبول حکومت کو فوجی بوٹوں تلے روندنے کی کوشش کی، مگر اس کو منہ کی کھانی پڑی۔ طیب اردگان کے ایک ویڈیو پیغام پر لاکھوں کی تعداد میں ترک عوام سڑکوں پر نکل آئی۔

استنبول کی شاہراہوں نے، انقرہ کے چوکوں نے، ازمیر کے چوراہوں نے اور اناطولیہ کی سڑکوں نے ایسے مناظر پہلے کب دیکھے تھے۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بوڑھے اور کیا جوان، سب ہی سڑکوں اور چوکوں پر تھے۔ جہاں جہاں باغیوں کے فوجی کنٹرول سنبھالے بیٹھے تھے وہاں عوام الناس ٹولیوں کی شکل میں پہنچے اور مار مار کر باغیوں کے حلیے بگاڑ دیے۔ سوشل میڈیا پر جاری تصاویر دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ باغی فوجی دونوں ہاتھ جوڑے عوام الناس سے معافی

مانگتے دکھائی دے رہے تھے۔ چند ہی گھنٹوں میں مطلع صاف تھا اور رجب طیب اردگان ایک نئے جوش، ایک نئے ولولے کے ساتھ قوم سے خطاب کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس بات کے واضح اشارے بلکہ ماضی کے کئی اقدامات پہلے سے موجود تھے کہ امریکا میں بیٹھے فتح اللہ گولن مسلسل ترکی کی موجودہ حکومت کو گرانے کے لیے اپنی کوششوں میں مصروف ہیں، مگر یہ ان کی آخری اور انتہائی کوشش تھی جو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بری طرح ناکام ہوئی۔ اب اردگان کے لیے سازشی عناصر کو چھانٹ چھانٹ کر نظام سے باہر نکالنا آسان ہوجائے گا۔ ترکی میں جبر کی یہ آخری ہچکی تھی اور اب ان شاء اللہ! اس کے بعد ایسی کسی مہم جوئی کا امکان کم نظر آتا ہے۔

اس موقع پر دیکھنے میں آیا کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ، حددرجہ شاطرانہ اور خالص جانبدارانہ کردار ادا کیا۔ ابھی فقط بغاوت کی خبر ہی آئی تھی کہ مغربی ذرائع ابلاغ اور ان کے پاکستانی ہم نوا انگریزی اخبارات نے بغاوت کی کامیابی کے شادیانے پیٹنے شروع کردیے۔ کسی نے اس آمرانہ اقدام کی جھوٹے منہ مذمت کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ جب بغاوت ٹھنڈی کردی گئی تو بی بی سی کا شکست خوردہ تبصرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ البتہ سوشل میڈیا چونکہ ایک عوامی ہتھیار ہے، اس لیے اس نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور اس کو ترک حکومت اور عوام کے حق میں موڑے رکھا۔

ترکی کے واقعے میں دنیا بھر کے سیاستدانوں کے لیے عبرت ہے۔ اگر حکومتیں واقعی ڈیلیور کررہی ہوں اور عوام کے دلوں میں دھڑک رہی ہوں تو بغاوت کی کوششوں کو اس طرح ناکام بنایا جاتا ہے، مگر اگر حکومتیں ایسی ہوں جیسی ہمارے ہاں ہوتی ہیں تو پھر ان پر رونے والا کوئی نہیں ہوتا۔

جھوٹ کے پاؤں

مفتی عدنان کاکاخیل

اس بات میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ پاکستانی میڈیا نے ترکی کی ناکام بغاوت، اس کے پس پردہ عوامل اور پھر اس سے نمٹنے کے لیے طیب اردگان کی حکمت عملی کے حوالے سے انتہائی جانبدارانہ، غیر منصفانہ اور خلاف واقعہ رپورٹنگ اور تبصرہ بازی کی۔ پاکستان کے بڑے بڑے میڈیا ہاؤسز کا اس بات پر ایک عجیب وغریب "پراسرار اجماع" دیکھنے میں آرہا تھا کہ جو بات ایک چینل بغیر کسی حوالے اور سند کے بطور پروپیگنڈا نشر کر رہا ہے وہی بات دوسرے معرف میڈیا گروپ کا کالم نگار لکھ رہا ہے۔ صاف معلوم ہورہا تھا کہ سب کی ڈوریں کہیں اور سے ہلائی جارہی ہیں اور واضح طور پر یہ ایجنڈا دیا گیا تھا کہ طیب اردگان کی مبینہ کرپشن، شاہانہ طرز زندگی، اقربا پروری اور انتقامی سیاست کی جھوٹی کہانیاں گھڑ گھڑ کر قوم کو سنائیں جائیں اور پاکستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیت محبوبیت کو جہاں تک ممکن ہوسکے نیچے لایا جائے۔

اس مہم کے پیچھے ان مالیاتی اداروں کے کارپردازوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو میڈیا گروپس کو بڑی بڑی رقومات بطور ڈونیشن دیتے ہیں۔ امریکا نے ایک ایسی NGO کا باقاعدہ اعتراف کیا ہے جس کا مقصد ہی میڈیا ہاؤسز جیسے ''غریب'' اور ''نادار'' اداروں کی ''مالی مدد'' کرنا ہے۔ پاکستانی میڈیا پر بھی اس حوالے سے خاصی زوردار فنڈنگ کی تفصیلات خبروں کی زینت بن چکی ہیں۔

طیب اردگان اور اس کی حکومت کے خلاف جھوٹ اور دروغ گوئی کی ان مہموں میں دو طرح کے لوگ شریک تھے۔ ایک تو وہ لوگ جو کسی بین الاقوامی ایجنڈے کا حصہ تھے اور ترکی حکومت کے خلاف ہونے والی عالمی سازش کے اصل کرداروں کے پے رول پر تھے۔ ان کو نا کام بغاوت اور اس پر کامیاب عوامی ردِعمل کے اس پورے منظرنامے کو بگاڑنے کی ڈیوٹی سونپی گئی جو انہوں نے نمک حلالی کے بھرپور جذبے کے ساتھ نبھائی۔

دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو کسی زمانے میں فتح اللہ گولن کے کام سے واقف ہوئے تھے اور اس کے صوفیانہ رُخ اور مزاج سے گہرا تاثر لیا۔ ان کے لیے اب تک یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ اتنی صوفی مزاج تحریک بھی کسی بین الاقوامی سازش کا شکار ہو سکتی ہے یا عالمی کھلاڑیوں کے ہاتھوں ہائی جیک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ابھی تک اپنے اس غم سے باہر نہیں آئے کہ ترکی میں جاری تنازعہ سیکولر اور اسلام پسندوں کا نہیں، بلکہ درحقیقت دو اسلام پسند جماعتوں کے درمیان چپقلش جاری ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گولن موومنٹ عرصہ ہوا اصل اسلام سے اپنا ربط توڑ کر ایک نئے دین کے تازہ ایڈیشن کی تیاری میں مصروف ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کا یہ نیا ورژن امریکا اور اس کے اتحادیوں کا منظور کردہ ہے۔ فتح اللہ گولن ایک بہت پراسرار کردار ہے جس کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے۔ محمد دین جوہر لاہور سے سہ ماہی جریدہ ''جی'' کے نام سے نکالتے ہیں۔ ذرا سنیے! ان کا تبصرہ کیا ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ وہ (گولن) تہجد گزار، راسخ العقیدہ دیندار اور پکا صوفی ہے۔ اس کی تحریک نے سماجی خدمت کے بڑے بڑے اور حیرت انگیز کام سرانجام دیے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس وقت ایک ارب پتی آدمی ہے اور نہایت ''سادگی'' کی زندگی گزارتا ہے، لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ 2013ء میں اردوغان کے ساتھ اس کے سیاسی اختلاف کی بنیادی وجوہات دو تھیں: ایک اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی۔ اور دوسرے شامی مہاجرین کو ترکی آنے کی اجازت۔

وہ اسرائیل سے ہر شرط پر تعلقات کو باقی رکھنا چاہتا تھا، اور شامی مہاجرین کی ترکی آمد کے سخت خلاف تھا، کیونکہ یہ مہاجرین یورپ اور امریکا کے لیے مسائل کا باعث بن رہے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مغربی سیکولرزم کا زبردست حامی ہے اور اس کی تعلیمی تحریک سی آئی اے کے لیے دنیا بھر میں ایک آڑ کے طور استعمال ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردگان کے اقتدار میں آنے سے پہلے سے دنیا کے کئی ملکوں میں اس پر پابندی ہے یا اس کے خلاف تحقیقات کی گئی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک ڈچ قانونی فرم نے اس کی تحریک کے بارے میں سی این این امریکا پر جو معلومات جاری کی ہیں، وہ نہایت چشم کشا ہیں۔ اور جب ہالینڈ میں اس پر پابندی لگائی گئی تو وہاں کی خفیہ ایجنسی کے محض ایما پر یہ پابندی ختم کی گئی تھی۔ اگر ہمیں خوش فہمی ہے کہ تہجد گزار مسلمان ''بدترین غدار'' نہیں ہوسکتا تو ہمیں اپنی انسانی بصیرت کو ازسرنو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

یہ ایک طویل مضمون کا اقتباس ہے۔ فتح اللہ گولن کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی شافی ہے اور اس میں شک نہیں کہ گولن تحریک کے صوفیانہ مکر کا پردہ چاک ہونے سے جو اصل صورت سامنے آئی ہے وہ بہت بھیانک اور حد درجہ مکروہ ہے۔

108 سال کا سفر

(23/جولائی 1908ء سے 15/جولائی 2016ء تک)

 مولانا محمد اسماعیل ریحان

23/جولائی 1908ء کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ استنبول کے گلی کوچوں میں سکوت طاری تھا۔ قصرِ خلافت میں کوئی چہل پہل نہ تھی۔ ہر شے ماتمی لباس میں لپٹی محسوس ہوتی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا، اس کے پیچھے ایک صدی کی محنت تھی۔ مغربی مفکرین اور زعماء نے تعلیم، میڈیا اور لٹریچر کے ذریعے اپنی سوچ کو ترک نوجوانوں کی رگوں میں اتار دیا تھا۔ سرکاری فوج مغربی افکار سے متاثر اور اسلامی روح سے محروم ہو چکی تھی۔ اگر فوج دین دار رہتی تو یہودی اور ان کے تربیت یافتہ سیاست دان اور جدت پسند صحافی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی خلافتِ عثمانیہ کو جنبش نہیں دے سکتے تھے، مگر اب آوے کا آوا بگڑ چکا تھا۔ 1901ء میں یہودیوں کے عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی سے فلسطین کے متعلق مذاکرات ناکام ہو گئے۔ خلیفہ نے ارضِ مقدس کی ایک انچ زمین دینے سے بھی انکار کر دیا۔ تب صہیونی لابی نے خلافت کے خاتمے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور ترک فوجی افسران صہیونیوں کا ہراول دستہ ثابت ہوئے۔

23/جولائی 1908ء کو باغی افسران نے سلطان عبدالحمید کا گھیراؤ کر کے خلیفہ سے بہت سے اہم اختیارات سلب کر لیے۔ ترک عوام دم سادھے رہے۔ ان کے سامنے خلافت کی آن بان نیلام ہوگئی، مگر باغی اس پر مطمئن نہ ہوئے۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ 24/اپریل 1909ء کو باغی فوج لشکرِ حریت کا نام اختیار کر کے استنبول میں داخل ہوئی اور کسی خاص مزاحمت کا سامنا کیے بغیر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد سلطان کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے دینی تعبیرات کا سہارا لیا گیا اور شہر میں درج ذیل مضمون کی اشاعت کی گئی: ''اے مسلمانو! ہم نے ظالم، بے ایمان، قرآن کو پامال کرنے والے، ایمان اور ضمیر کو روندنے والے سلطان کے اقتدار سے تمہیں نجات دلا دی ہے۔ اے امتِ محمدیہ بیدار ہو جاؤ۔ دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کرو۔ اللہ مدد کرے گا۔ اے توحید پرست مسلمان! اٹھ کھڑا ہو، اور اپنے دین کو ظالموں سے بچا۔ یہاں ایک ظالم شیطان سر پر تاج آراستہ کیے بیٹھا ہے۔ سلطان عبدالحمید شریعت کے لحاظ سے سلطان ہے نہ خلیفہ۔ اس کے خلاف اسلحہ اٹھانا لازم ہے۔ جو اس میں کوتاہی کرے گا، سلطان کے گناہوں کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔''

استنبول میں اب بھی کچھ نہ ہوا۔ لوگ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنے رہے۔ 28/اپریل کو فوج نے خلیفہ کی رہائش گاہ پر حملہ کیا۔ سلطان کو گرفتار کر لیا گیا اور قصرِ خلافت کو لوٹ لیا گیا۔ سلطان کو معزول کرنے کی ذمہ داری جس کمیٹی کے سپرد کی گئی تھی، اس کا سربراہ ''عمانوئیل قراصو'' نامی یہودی تھا جو مقدونیہ کے فری میسن لاج کا گرینڈ ماسٹر تھا۔ اس کمیٹی نے اپنے ناپاک مقاصد کے لیے علماء کا نام بھی استعمال کیا۔ سلطان کے خلاف استفتاء تیار کیا گیا جس میں اس پر درج ذیل جھوٹے الزامات عائد کیے گئے تھے: ''13/اپریل کے باغیانہ مظاہرے کی منصوبہ بندی

کرنا۔ قرآن مجید کے نسخوں کو نذرِ آتش کرنا۔ فضول خرچی و اسراف کرنا۔ ظلم وستم اور خونریزی کرنا۔" حالانکہ یہ تمام الزامات بالکل بے بنیاد تھے۔ خلیفہ کے مخالفین کے پاس ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی کوئی ثبوت نہ تھا۔ بہرکیف خلیفہ کو معزول کر کے کنبے سمیت ایک قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ 11 رفروری 1918ء کو قید ہی کی حالت میں ترکوں کے اس آخری بااختیار خلیفہ کی وفات ہوگئی جس نے نہایت ناسازگار حالات میں بھی اُمت کی ناؤ پار لگانے کی پوری کوشش کی۔

یہ سب کچھ ہوا۔ اور اس کے بعد 1924ء میں مصطفی کمال پاشا کے ہاتھوں خلافت کی رسمی حیثیت بھی ختم کر دی گئی۔ اسلامی شعائر کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے۔ مدرسے بند ہوگئے۔ مساجد آثارِ قدیمہ بنا دی گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ترکی کا اسلام سے کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہیں، مگر 108 سال بعد اسی استنبول میں طیب اردگان کی حکومت ہے، جو عثمانی خلفاء کا عاشق ہے، جو ملتِ اسلامیہ کا درد آشنا ہے، جو قرآن مجید کو بڑی حلاوت اور قلبی لذت کے ساتھ پڑھتا ہے۔

108 سال بعد 15 رجولائی کو اسی استنبول میں ایک بار پھر فوجی بغاوت ہوئی، مگر تاریخ ہر جگہ خود کو نہیں دہراتی۔ کبھی تاریخ بدل بھی جاتی ہے۔ ترک قوم جو 1908ء میں مغربی افکار کے نشے میں غرق ہو چکی تھی، آج بیدار ہے۔ اس بیداری کے پیچھے گزشتہ کئی عشروں کی محنت کارفرما ہے۔ وہ محنت جو تہہ خانوں، خانقاہوں، مسجدوں اور حجروں سے شروع کی گئی، پھر اسکولوں، اکیڈمیوں اور کیڈٹ کالجوں تک پہنچی۔ جس نے ترک قوم کو نجم الدین اربکان اور طیب اردگان جیسے لیڈر دیے۔ اس ترک قوم نے 15 رجولائی کو ثابت کر دیا کہ وہ ماضی کی غلطیوں کا اعادہ اب نہیں ہونے دی گی۔ فوج اسلام پسندوں کو روندنے کا شوق پورا نہیں کر سکتی۔ ترک نوجوان طیب اردگان کی کال پر گھروں سے نکل آئے۔ وہ فوج کی گاڑیوں اور ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے۔ استنبول کے چوراہوں پر شیخ سعدیؒ کے اس قول کا عملی مشاہدہ

ہو رہا تھا کہ ''چڑیاں جمع ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔''

واقعی باغیوں کی کھال اتر گئی۔ وردیاں پامال ہو گئیں۔ غدار فوجیوں کی جو خاطر تواضع ہوئی وہ پوری دنیا نے میڈیا پر دیکھی۔ اس دن ہر طرف حمد کے ترانے تھے۔ پوری دنیا میں مسلمان شکرانے کے نوافل ادا کر رہے تھے۔ دامن اشکہائے تشکر سے بھیگ رہے تھے کہ مدتوں بعد ایک عظیم فتح نصیب ہوئی تھی۔ الحمدللہ! ایک صدی کا سفر رائگاں نہیں گیا۔ ترکوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ وہ عالم اسلام کی قیادت کا خلا پر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں دکھا دیا کہ کہنے اور کر کے دکھانے میں کیا فرق ہے؟ اگرچہ یہ سیکھنے میں انہیں ایک سو آٹھ سال لگ گئے، مگر دیر آید درست آید۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کب کہنے سے کرنے کے مقام تک پہنچ پاتے ہیں؟

تین بروقت کام

مفتی فیصل احمد

ترکی میں ''ناکام بغاوت'' کیونکر کچلی گئی۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر آج کل تجزیوں کی بھرمار ہے۔ سطحی بات تو فقط اتنی سی ہے کہ صدر اردگان نے ''بروقت'' فیس ٹائم کے ذریعے ایک ٹی وی اینکر کو فون کر کے قوم سے خطاب کی درخواست کی۔ خاتون اینکر نے تمام تر سیاسی دباؤ اور مزاحمت کے امکانات کے باوجود صدر کو قوم سے ''بروقت'' خطاب کرنے دیا۔ پھر قوم نے ''بروقت'' لبیک کہتے ہوئے سڑکوں پر آ کر طاقت کے نشے میں چور ''باغی فوجیوں'' کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ کیا اتنے سارے ''بروقت کام'' محض قسمت کی یاوری کا نتیجہ تھے یا ان کو یقینی بنانے کے لیے طویل منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ یوں اس ناکام بغاوت کا مطالعہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور مذہبی تنظیمات کے لیے انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ نیز جس انداز سے اس ناکام بغاوت کے وائرس کو ختم کرنے

کی کاوشیں سامنے آ رہی ہیں تو یہ کہنا ناروا نہ ہوگا کہ خود ترکی کی فاتح حکومت کو بھی اس فتح کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ فتوحات کا تسلسل باقی رکھا جا سکے۔

غور کیا جائے تو کچھ اس طرح کا منظرنامہ سامنے آتا ہے: ترکی کے صدر کی ایمانی اور اعصابی قوت نے انہیں ایسے مشکل حالات میں فیصلہ سازی کی ہمت دی۔ ان کے میڈیا اینکرز سے قریبی دوستانہ روابط اور اعتماد نے بند میڈیا کے دروازے ان پر کھول دیے۔ ایک ہی مختصر کال پر عوام کا کروڑوں کی تعداد میں سڑکوں پر آ جانا اس بات کی واضح علامت تھی کہ صدر کی شخصیت اور حکومت پر انہیں مکمل سیاسی و نظریاتی اعتماد ہے۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ترکی میں سابقہ کامیاب بغاوتوں اور ان کے بعد اسلام پرستوں پر مسلسل ڈھائے جانے والے مظالم کی تاریکی کے سامنے اردگان حکومت کے تسلسل کے ساتھ سیاسی و معاشی ترقی کا نور غالب آ گیا اور عوام نے اس اعتماد پر یہ رسک لیا کہ یہ حکومت ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔ یہاں سے ہمیں عوام میں مقبولیت کے کئی راز معلوم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح میڈیا کی تمام تر خرابیوں کے باوجود میڈیا کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میڈیا اینکرز کی تمام تر ذاتی بے دینی اور آزاد زندگی کے باوجود ان میں سے محب وطن اور مذہب پسند لوگوں سے تعلق رکھنے کی ضرورت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہمیں دینی طبقے کے اپنے چینل اور ابلاغی ذرائع کی اہمیت بھی واضح ہو سکتی ہے۔ ہمیں سوشل میڈیا کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے اور iPhone جیسی خفیہ پیغام رسا ڈیوائس کے ممکنہ فوائد و نقصانات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اب تمام دینی تحریکیں، دینی شعبے اور دینی خدمات پیش کرنے والے ادارے اس حوالے سے غور فرمائیں۔ کیا ان کی جڑیں عوام میں اتنی گہری ہیں؟ کیا ان پر عوام کو اتنا اعتماد ہے؟ کیا عوام ان کی خاطر بستروں سے نکل کر سڑک پر اور سڑک پر دندناتے ٹینک کے سامنے لیٹ سکتے ہیں؟ شاید کوئی کہے کہ 1953ء کی ختم نبوت کی تحریک میں عوام نے ہمارے کہنے پر جانوں کے نذرانے

پیش کیے تھے۔ تو معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ وہ دینی طبقے کی راہنمائی پر نہیں، بلکہ عقیدے پر غیر متزلزل اعتماد کا ثمرہ تھا۔ اگر دینی طبقے کی راہنمائی کا اثر ہوتا تو ہر عنوان پر عوام کو نکالا جا سکتا تھا، لیکن تاریخ میں ایسا اعتماد کم نظر آتا ہے، جبکہ ترکی میں لوگ راہنماؤں پر اعتماد کر رہے تھے۔ دیکھیے! ترکی میں لوگ حکومت کو بچانے کے لیے نکلے تھے، کسی مذہبی عقیدے کی حفاظت کے لیے نہیں نکلے تھے۔ اس سے ان کی عوام میں جڑوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ باقی عقیدے پر تو لوگ خود ہی نکل آتے ہیں۔ عامر چیمہ شہیدؒ کو کسی نے بیان نہیں کیا تھا۔ عقیدے کی غیرت خود ہی بہت بڑا محرک ہوتی ہے۔ عوام کا یہ اعتماد ترکی حکومت کی کئی دہائیوں پر مشتمل تعلیمی وفلاحی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے حکومت میں آنے سے بہت پہلے سے پورے ترکی میں اسکولوں، کالجوں، نجی یونیورسٹیز اور طبی مراکز کا جال بچھایا ہوا ہے۔ حکومت میں آنے کے بعد بھی ان کی نظر کرم مذہبی وسیکولر ہر تاجر پر برابر پڑتی رہی ہے۔ انہوں نے سہولیات دیتے ہوئے مذہب اور تقویٰ کی شرط نہیں لگائی۔ گویا ایک ماں کی طرح اپنے فرمانبردار اور بگڑے ہوئے سب بچوں کو گلے سے لگایا ہوا تھا۔ دشمنانِ ترک ہمیشہ سے پروپیگنڈے کرتے، لیکن ترک حکومت کی دانشمندی اور دور اندیشی انہیں بچاتی رہی۔ یہاں تک کہ دینی مزاج عوام کو یقین ہوگیا کہ مذہبی قیادت کے یہی اہل ہیں اور سیکولر طبقے کو یقین آ گیا کہ معاشی ترقی انہی کی مرہون منت ہے، لہٰذا ان کے لیے بستروں سے نکلنا اور ٹینکوں کے آگے لیٹنا آسان ہوگیا۔ یہاں یہ نکتہ ترکی حکومت کو بھی سمجھنا چاہیے کہ فتح اللہ گولن کی جانب سے بھی تعلیمی اداروں کا ایک بڑا نیٹ ورک قائم ہے۔ یہ وہی نتائج دینے والا طریقہ ہے جو اوپر ذکر ہوا، لہٰذا بغاوت کے ماسٹر مائنڈز کو ضرور کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے۔ احتیاطاً حساس عہدوں سے گولن تحریک کے کارکنوں کو برطرف بھی کرنا چاہیے، بلکہ کسی نئی بغاوت کو روکنے کے لیے جو بھی اقدامات ہیں وہ کیے جانے چاہییں، لیکن غیر متوازن کریک

ڈاؤن منفی جذبات اور پروپیگنڈے کو ہوا دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے ترک حکومت کی دانشمندی پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا، لہٰذا امید ہے کہ وہ خود بھی ان امور کا خیال کر رہے ہوں گے۔

اسی طرح مذہبی تنظیموں اور اداروں کو جدید مواصلاتی آلات کے استعمال اور میڈیا سے تعلقات پر بھی نظرثانی کرتے رہنی چاہیے۔ کیا ہم اہم اینکرز اور مذہب پسند اینکرز سے تسلسل سے تعلقات رکھتے ہیں؟ کیا ہم سوشل میڈیا اور بھرپور استعمال کرتے ہیں؟ کیا ہمارے پاس آئی فون جیسی ڈیوائسز ہوتی ہیں جن پر کسی دشمن ملک کا بس نہیں چل پاتا؟ ظاہر ہے یہ سب کام ہم کریں گے تو ہم دنیا سے ہم کلام ہوسکیں گے اور جب تک ہم اپنی بات لوگوں کو ''بروقت'' نہیں پہنچائیں گے دنیا ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ ہوگی۔ ترکی کی حکومت کے ''تین بروقت'' کام آج ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

ناکام انقلاب کی کہانی

مولانا انور غازی

طیب اردگان نے 1994ء سے لے کر 2016ء تک 22 سال ملک وقوم کی ہر قسم کی خدمت کی ہے۔ بائیس سال پہلے جب استنبول کے میئر بنے تو استنبول ہر قسم کے جرائم کی آماجگاہ اور گندگی کا ڈھیر تھا۔ انہوں نے چند ہی سالوں میں استنبول کو فری جرائم اور فری کرپشن کر دیا۔ جس شہر میں لوگ آنے سے ڈرتے تھے، وہاں لاکھوں کی تعداد میں سیاح آنے لگے۔ جب ترکی کے لوگوں نے طیب اردگان کی خدمت کو دیکھا تو انہوں نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ ترکی کے وزیراعظم اور صدر منتخب ہو گئے۔ طیب اردگان ترکی کو جدید فلاحی اور اسلامی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ سفر جاری تھا کہ ترکی کے نام نہاد بہی خواہوں نے شب خون مار دیا، مگر عوام نے انہیں ناکام بنا دیا۔ جب سے ترکی میں فوجی بغاوت ناکام ہوئی ہے تب سے بہت سے دانشوروں نے طیب اردگان کے خلاف الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر ایک

محاذ کھول لیا ہے۔ سیکولرازم کے حامیوں نے طرح طرح کے الزامات لگا کر ان کی، ان کی پارٹی کی اور ان کے وزراء کی کردار کشی شروع کر دی ہے۔ گھسے پٹے و پرانے سوالات اور بوگس و بودے اعتراضات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی سعی کی جارہی ہے کہ اسلام پسندوں کی حکومت مکمل کرپٹ ہے اور انہوں نے ترکی کی کوئی خاص خدمت نہیں کی ہے۔ اس تحریر میں ہم طیب اردگان اور ان کی جماعت پر لگائے گئے کرپشن اور دیگر الزامات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے اور قارئین کو بتائیں گے کہ کرپشن کے ان الزامات کی حقیقت کیا ہے؟

سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ انہوں نے عوامی پیسے سے 150 ایکڑ زمین پر انقرہ میں پہاڑ کی چوٹی پر 615 ملین ڈالر کی لاگت سے ایک پرشکوہ شاہی محل تعمیر کروایا جس میں ایک ہزار کمرے ہیں۔ اس کی وسعت کا اندازہ یوں لگائیں کہ یہ امریکا کے وہائٹ ہاؤس سے 30 گنا بڑا ہے۔ اس قصرِ شاہی میں صرف قالین بچھانے پر 7.8 ملین پاؤنڈ خرچ ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میرے بھائی! یہ محل صدر طیب اردگان نے تعمیر نہیں کروایا، بلکہ تعمیرِ نو کروا کر بحال کیا ہے۔ یہ صدارتی رہائش گاہ نہیں، صدارتی دفتر ہے۔ جس میں تمام سرکاری محکموں کے ذمہ دار اور ان کے نمائندے ایک چھت کے نیچے دستیاب اور اردگان کو براہ راست جواب دہ ہیں۔ اس میں غلط بات کیا ہے؟ یہ تو اردگان کی کام کی مخصوص رفتار، فوری عمل اور قلیل وقت میں نتائج کے حصول والے مزاج کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس کام کی تحسین کرنی چاہیے۔

دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ طیب اردگان کے کئی وزراء بھی کرپشن میں ملوث ہیں۔ طیب اردگان نے ان وزراء سے فوری طور پر استعفیٰ لے کر انصاف کی اعلیٰ مثال قائم کیوں نہیں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طیب اردگان نے اپنی کابینہ، وزراء اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر مردِ بیمار کو مردِ توانا بنایا ہے۔ انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر ملک کو اقتصادی لحاظ سے 111 نمبر پر

موجود ملک کو اٹھا کر 16 ویں نمبر پر پہنچایا۔ ترکی پہلی بار دنیا کے اقتصادی لحاظ سے مضبوط 20 ممالک کے گروپ G-20 میں شامل ہوا۔ 2013ء میں ترکی کی سالانہ قومی پیداوار 1100 ارب ڈالر تک جا پہنچی تھی۔ 10 سال پہلے ایک عام ترکی کی سالانہ آمدن 3500 ڈالر تھی، اب وہ آمدن بڑھ کر 11 ہزار ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ ترکی میں اقتصادی خوش حالی کے نتیجے میں لوگوں کی تنخواہوں میں 300 فیصد اضافہ ہوگیا ہے۔ ملازم کی بنیادی تنخواہ جو کسی دور میں 340 لیرا تھی، اب بڑھ کر 957 لیرا تک پہنچ گئی ہے۔ ترکی کا بجٹ خسارہ جو بڑھ کر 47 ارب تک پہنچ گیا تھا، اس کو ختم کر دیا۔ ورلڈ بینک نے ترکی کو قرض دے رکھا تھا۔ اردگان نے سارا قرض لوٹا دیا۔ اس کے برعکس ترکی نے ورلڈ بینک کو 5 ارب ڈالر قرضہ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ترکی کے خزانے میں 100 ارب رکھے ہیں۔ اس دوران یورپ کے متعدد ممالک قرض کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہاں غربت کی شرح بڑھ رہی ہے۔ 10 سال قبل ترکی کی برآمدات 23 ارب تھیں، اب وہ بڑھ کر 153 ارب تک پہنچ گئی ہیں، یہ برآمدات دنیا کے 190 ملکوں میں پہنچ رہی ہیں۔ اس وقت یورپ میں فروخت ہونے والے الیکٹرانک سامان میں سے ہر تیسرا سامان ترکی کا تیار کردہ ہوتا ہے۔ 2023ء وہ سال ہے جس کے بارے میں طیب اردگان نے اعلان کیا کہ ترکی اس سال دنیا کی سب سے پہلی اقتصادی اور سیاسی قوت بن جائے گی۔ اردگان نے 50 کے لگ بھگ ایرپورٹ تعمیر کیے ہیں۔ تیز رفتار سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ تقریباً 19 ہزار کلومیٹر طویل نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں، جبکہ ملک میں ٹریفک حادثات کی تعداد 50 فیصد کم ہوگئی۔ گزشتہ تین سال سے ترکی کے فضائی راستوں کو دنیا کے بہترین فضائی رستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دس سال کے دوران اردگان کی حکومت نے ملک بھر میں دو ارب 77 کروڑ درخت لگائے ہیں۔ ترک حکومت نے کچرے کو ری سائیکل کر کے توانائی بنانے کے منصوبوں پر کام شروع کیا ہے۔ اس منصوبے سے

ترکی کی ایک تہائی آبادی فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس وقت ترکی کے 98 فیصد شہروں اور دیہاتوں میں بجلی ہے۔ 10 سال میں اردگان نے 125 یونیورسٹیاں بنائیں، 189 اسکول قائم کیے اور 510 ہسپتال تعمیر کیے۔ سرکاری اسکولوں میں 169 ہزار نئی کلاسز کا آغاز کیا اور شرط لگادی کہ کسی بھی کلاس میں 21 بچوں سے زیادہ کو داخلہ نہیں دیا جائے گا۔ یورپ میں آنے والے حالیہ اقتصادی بحران کے فوری بعد یورپ اور امریکا بھر میں یونیورسٹی اور اسکول فیسوں میں بے تحاشا اضافہ کردیا گیا۔ اس کے برعکس طیب اردگان نے سرکاری حکم نامہ جاری کیا کہ یونیورسٹی اور اسکول کی تعلیم مفت ہوگی اور تمام تر اخراجات حکومت برداشت کرے گی۔ ترکی کا ہدف ہے کہ 2023ء تک 3 لاکھ محققین تیار کیے جائیں گے، تاکہ ملک میں نت نئی تحقیقات کا دروازہ کھل سکے۔ ترکی میں تعلیم کا بجٹ بڑھا کر دفاع کے بجٹ سے بھی زیادہ کردیا گیا ہے۔ ایک استاد کو ڈاکٹر کے مساوی تنخواہ دی جاتی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی پر تحقیق کے لیے 35 ہزار لیبارٹریاں قائم کی گئی ہیں۔ جب طیب اردگان حکومت نے ایسے ایسے بے مثال و قابلِ تقلید کارنامے سرانجام دیے تو ان کے حریفوں سے ان کی کامیابیاں ہضم نہ ہوسکیں، اور ان کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کی کردار کشیاں شروع ہوگئیں۔ انہی میں سے کرپشن کے الزامات بھی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان وزراء پر صرف الزامات ہی لگے ہیں۔ عدالت میں مقدمے چل رہے ہیں۔ تاحال کسی وزیر پر کرپشن ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اور جب تک الزامات ثابت نہیں ہوجاتے، اس وقت تک یہ کہنا کہ طیب اردگان نے ان کا دفاع کیا ہے، صریح غلط اور ناانصافی والی بات ہے۔

ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ طیب اردگان نے میڈیا پر قدغن لگائی، کئی ٹی وی چینلز کو بند کیا اور صحافیوں کو جیلوں میں ڈالا؟ اس اعتراض میں بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ طیب اردگان نے اپنے 12 سالہ دورِ حکومت میں میڈیا کو ہر قسم کی آزادی دی۔ ملک میں درجنوں ٹیلی ویژن

چینلز اور سیکڑوں ایف ایم ریڈیو کے لائسنس جاری کیے۔ اردگان میں دورِ حکومت میں ترک ڈرامے پوری دنیا کی میڈیا انڈسٹری پر چھا گئے۔ 2008ء تک فتح اللہ گولن طیب اردگان کے ساتھ تھے، نہ صرف ساتھ تھے بلکہ طیب اردگان کی حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کررہے تھے۔ اس کے بعد اختلافات ہوئے اور سرد جنگ چلتی رہی۔ انہوں نے امریکا کی ریاست پنسلوانیا کے شہر سیلز برگ میں پناہ لے لی اور امریکا کی گود میں چلے گئے۔ وہاں سے یہ طیب اردگان اور ان کی جماعت کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ 2013ء کے بعد جب گولن اور گولنسٹ ترکی کے صدر طیب اردگان کے خلاف کھل کر سامنے آ گئے تو ان کے گروپ آف چینل نے طیب اردگان کے لوگوں اور اس کی حکومت کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیا۔ پروفیسر گولن نے پچھلے 12 برسوں میں اپنے میڈیا ہاؤسز کو بہت مضبوط کرلیا تھا۔ اردگان مخالف کئی صحافیوں کو بھاری معاوضوں پر اپنے ہاں ملازم رکھا ہوا تھا۔ ان میڈیا ہاؤسز اور صحافیوں میں کئی قومی اور بین الاقوامی ادارے اور میڈیا پرسن بھی شامل ہیں۔ جب بغیر ثبوتوں کے الزامات لگانے اور کردار کشی کو اپنا وطیرہ بنالیا تو پھر ردِعمل کے طور پر گولن کے صرف ایک چینل اور گولن نواز چند صحافیوں کو کسا گیا، ان کو عدالتوں کا سامنا کرنا پڑا، جیسا کہ گزشتہ دنوں ترک سفیر نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ''ترکی میں میڈیا کو کچلنے کا پروپیگنڈہ من گھڑت اور بے بنیاد شر انگیز ہے۔ ترک میڈیا اب بھی اتنا ہی آزاد ہے جتنا کہ پہلے تھا۔'' خیر آمدم برسرِ مطلب!

فوجی بغاوت کے بعد طیب اردگان کی حکومت جانا یقینی تھا۔ 15 منٹ کے بعد ترکی صدر اپنی کابینہ سمیت جیل میں ہوتے، لیکن جب عوام نے ان کا ساتھ دینے کا ارادہ کرلیا تو حالات پلٹ گئے۔ عوام نے بوٹوں اور ٹینکوں کو شکست دیدی۔ عوام ہمیشہ انہی کا ساتھ دیتے ہیں جو ان کے مسائل کا حل کرتا ہے۔ جو ان کے دُکھ درد میں شریک ہوتا ہے، جو ان کے آنسو پونچھتا ہے، جو

ان کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی راحت قربان کر دیتا ہے۔ اگر ہمارے سیاستدان اور حکمران چاہتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت چلے تو پھر انہیں چاہیے کہ وہ طیب اردگان کی طرح ملک وقوم کی خدمت کریں۔ وہ غیر ملکی آقاؤں پر تکیہ کرنے کے بجائے عوام کی خدمت کر کے ان کے دل جیتیں۔

کامیابی کیسے ملی؟ ترکی سے سیکھیے

یاسر محمد خان

مصطفیٰ کمال نے خلافت کو ختم کیا اور ترکی کو ایک یورپی ملک کے سانچے میں ڈھالنا شروع کردیا۔ اُس نے داڑھی اور پردے پر پابندی لگائی اور نصاب تعلیم سے اسلام کو خارج کردیا۔ اُس کی وفات تک ترکی نام کی حد تک ایک اسلامی ملک تھا، اصل میں ساری قوم کی کایا کلپ ہوچکی تھی۔ مصطفیٰ کمال دنیا سے رخصت ہوا تو ترکی میں اسلام پسندوں نے ترکی میں مذہبی اقدار کے لیے ایک خاموش جنگ لڑنا شروع کردی۔ اُس وقت کی ترک فوج لادینیت میں مغربی یورپ کی قوموں سے بھی آگے نکل چکی تھی۔ یورپ میں فوجیوں کی کیتھولک یا پروٹسٹنٹ ہونے پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ ترکی میں کسی فوجی کا مسجد جانا، نماز پڑھنا، روزے رکھنا یا قرآن کی تلاوت کرنا ایک ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ سیاست دان بھی اس رنگ میں رنگے گئے تھے۔ ترکی کے ایک ہردل عزیز وزیراعظم عدنان میندرس نے اپنے دورِحکومت میں چند ایسے اقدامات اُٹھائے جو

فوج کو ناگوار گزرے۔ مئی 1960ء میں عدنان میندرس اور حکمران ڈیموکریٹ پارٹی کی سرکردہ قیادت کے خلاف پہلی فوجی بغاوت ہوئی۔ پارٹی پر پابندی لگی اور لیڈروں کو جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ ترکی کی عدلیہ جو عرصۂ دراز سے فوجیوں کی رکھیل بن چکی تھی، اُس نے فوج کے ایما پر عدنان میندرس، اُس کے وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ کو پھانسیوں کی سزائیں سنائیں۔ دنیا بھر میں ہونے والے احتجاج کے باوجود ان لیڈروں کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ ان لیڈروں کی پھانسی کا تاریک سایہ ترکی کی آنے والی دہائیوں میں دور تک اندھیرا پھیلا گیا۔ فوجیوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف ترک معاشرے میں جو ردِعمل ظاہر ہوا، اُس نے ترکوں کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کے احیا کی طرف موڑ دیا۔ فوجی اقتدار کے بعد سلیمان ڈیمرل وزیر اعظم بنے تو وہ اسلام پسندوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ 1971ء میں فوج نے سلیمان ڈیمرل کو استعفٰی پر مجبور کیا۔ مارشل لا نافذ کیا اور ٹیکنوکریٹس کی حکومت کھڑی کردی۔ اُس وقت تک فوج ایک مقبول وزیر اعظم اور اُس کے ساتھیوں کے عدالتی قتل کی پاداش میں عوام میں غیر مقبول ہو چکی تھی۔ 1980ء میں نئی جوان ہونے والی نسل میں اسلام پسندوں اور سیکولروں کے درمیان خوں ریزی شروع ہو گئی۔ ترکی کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ کے گروہوں کے تصادم نے ملک کو خانہ جنگی کے خطرے کی طرف دھکیل دیا۔ فوج کے سربراہ کنعان ایورن نے صدر کا عہدہ سنبھالا اور ترکی کے آئین میں بڑے پیمانے پر ترامیم کی گئیں۔ فوج کے سیاسی اقتدار کے لیے ہر قدغن کو ہٹا دیا گیا۔ ملک ایک فوجی سیکولر ریاست قرار پا گیا۔ 1997ء میں اُس دور کے نامور لیڈر نجم الدین اربکان کی اسلام پسند اتحادی حکومت کے سربراہ کو فوج کے استعفٰی دینے پر مجبور کر دیا۔

طیب اردگان کا تعلق ایک دینی اسلامی گھرانے سے ہے۔ اُن کا بچپن ایک ایسے ماحول میں گزرا جہاں اُنہیں اسلامی شعائر کی پابندی سکھائی گئی۔ 1994ء سے اُن کا سیاسی سفر شروع ہوا جو

اُن کو ترکی کی صدارت تک لے گیا۔ بطور صدر انہوں نے نہایت مشاقی سے ترکی کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ ہر ترک کی زندگی کو آرام دہ بنانے کی پالیسیاں بنائی گئیں۔ روزگار کے مواقع پیدا کیے۔ عوام کے لیے خوشحالی اور آسودگی کے دروازے کھولے گئے۔ شہریوں کا معیارِ زندگی حیران کن انداز میں بلند کر دیا گیا۔ مسلمان ہونا، اسلامی عبادات کی پابندی کرنا، قابل گرفت نہیں، قابل ستائش بن گیا۔ اُن کے خلاف متعدد بار سازشوں کے جال بنے گئے۔ یورپی یونین نے ترکی کے خلاف متعدد ضرر رساں پالیسیاں بنائیں۔ امریکا نے فتح اللہ گولن کو اپنا بالکا بنا کر اُس کی ''روحانی'' تربیت کے لیے اپنے خلاف اُٹھائے گئے ہر اقدام کو شکست دی۔ اُن کی ہر دل عزیز نے اُن کی محبت کو عوام کے دلوں میں مزید گہرا کر دیا۔ 15 رجولائی کی شام کو ترک فوج کا اعلان سامنے آیا کہ ترکی میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔ ہوائی اڈے بند، سماجی رابطے کی ویب سائٹس بلاک، آرمی چیف یرغمال اور فوج دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اردگان نے پکارا کہ عوام سڑکوں پر نکل آئیں۔ جواب میں 30 لاکھ ترک انقرہ، استنبول اور دوسرے بڑے شہروں کی سڑکوں پر نکل آئے۔ عوام نے وزیرِاعظم ہاؤس کی طرف بڑھتے ہوئے ٹینکوں پر قبضہ کر لیا۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد ترکی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ عوام نے ٹینکوں کے آگے لیٹ کر جمہوریت بچالی۔ ہزاروں فوجی اور جج گرفتار کر لیے گئے۔ ترکی نے فتح اللہ گولن کی حوالگی کا مطالبہ امریکا سے کر دیا۔ اردگان نے کہا کہ امریکا ترکی کو توڑنا چاہتا ہے۔ اردگان کے خفیہ سفر کی اطلاع ایک امریکی تھنک ٹینک نے باغی فوجیوں کو دی تھی۔ دارالحکومت میں صدر کی عدم موجودگی نے اُن کو کارروائی کی شہ دی۔ 15 رجولائی کے بعد آنے والے دنوں میں ترک عوام سڑکوں پر ہی رہے۔ باغیوں اور اُن کے ساتھیوں کو ملک بھر سے گرفتار کیا گیا۔ بیرون ملک فرار ہونے والوں کی گرفتاری کے لیے ترک وزارت خارجہ سرگرم ہو گئی ہے۔ ترکی کی پولیس، عدلیہ اور فوج کے اندر صفائی کا عمل شروع

کر دیا گیا ہے۔ بین الاقوامی پریس اور الیکٹرانک میڈیا باغی فوجیوں کے عبرت ناک انجام کو مسلسل خبروں اور تصویروں کے ذریعے نمایاں کر رہا ہے۔ طیب اردگان کی حمایت میں ساری اپوزیشن اکٹھی ہوگئی ہے۔ اُن کی مقبولیت نئی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ عوامی سطح پر ایسی پذیرائی ترکی میں آج تک کسی لیڈر کو نصیب نہیں ہوئی۔ سعودی حکومت نے بھی اردگان کی فتح پر انہیں مبارکباد دی ہے۔

طیب اردگان پر مخالفین الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ترک فوج کو نقصان پہنچایا، اسی لیے اُن کے خلاف بغاوت ہوئی۔ یہ الزامات حقیقتوں کے بالکل منافی ہیں۔ درست ہے کہ ترک فوج کی تعداد 1985ء میں 8 لاکھ تھی جو اب کم کر کے 6 لاکھ 39 ہزار 551 فوجی اور نیم فوجی دستوں پر مشتمل ہے۔ اردگان نے فوجیوں کی تعداد کی بجائے اُن کی حربی صلاحیتوں کی بہتری پر زیادہ توجہ دی۔ یوں بری فوج میں 4 لاکھ 2 ہزار، بحریہ میں 48 ہزار 600 فوجی اور فضائیہ میں 60 ہزار فوجی ہیں۔ ترک فضائیہ کے پاس 200 ایف سولہ طیارے ہیں۔ ترک بحریہ کے پاس 13 بڑی آبدوزیں 18 فریگیٹس اور 6 کارویٹس موجود ہیں۔ اردگان نے اپنی فوج کو نہایت جدید اسلحہ مہیا کیا ہے۔ اپنے فوجیوں کو دنیا کی ایک بہترین فوج بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردگان نے فوجی بجٹ کو پارلیمنٹ میں بحث مباحثے کے لیے پیش کرنے کی منظوری دی ہے۔ انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ بے مہار فوج کو سویلین لیڈرشپ کے تابع لانے کے لیے قانون سازی کی ہے۔ فوجیوں کے جرائم کا ٹرائل عام کورٹس میں کیا جانے لگا۔ کئی جرنلوں و سنگین جرائم میں عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ 2003ء سے 2016ء تک درجنوں جرنلوں، ایڈمرلوں اور ایئر چیفس کو 20،20 سال قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ ان سب کو نہایت شفاف انداز میں غیر متعصب عدالتوں سے گزارا گیا اور اپنے دفاع کے بھرپور مواقع دیئے گئے۔

ترک فوج جسے بلا روک ٹوک قانون شکنی کا لائسنس حاصل تھا۔ اب اپنے غیرانسانی جرائم پر کٹہرے شکنی میں کھڑی کی جانے لگی۔ طیب اردگان اور عبداللہ گل کی اسلام دوست پالیسیاں بھی سیکولر فوجیوں کے لیے آزار کا باعث تھیں۔ عبداللہ گل کی بیوی کے اسکارف پہننے پر فوج کی ٹاپ لیڈرشپ نے احتجاج کیا اور محفلوں کا بائیکاٹ کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اردگان نے ان کے کس بل نکال دیئے اور انہیں پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ بنایا۔ ترک جنرل ملک کی ہر پالیسی پر رائے زنی اور تنقید کرنے کی روش اپنائے ہوئے تھے۔ اردگان نے اس پر سخت پابندی لگائی اور افواج کے سربراہوں کو بڑے اجلاس میں اپنی رائے حکومت کے سامنے رکھنے کی اجازت دی۔ اردگان نے ہمیشہ کوشش کی کہ ترک افواج خود کو اپنے پیشہ وارانہ امور تک محدود کرلیں۔ انہوں نے اپنے فوجیوں کو جدید ترین جنگی ٹریننگ کے اداروں میں تربیت دلوائی۔ انہیں اسٹیٹ آف دی آرٹ حربی سازوسامان مہیا کیا۔ اُن کی ہر جائز ضرورت کو پورا کیا۔ اردگان نے کبھی کسی فوجی کے مذہبی یا سیکولر ہونے کو اُس کی ترقی کی راہ میں سہولت یا رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ انہوں نے کبھی مذہبی معاملات میں بے جا سختی کو اپنا وطیرہ نہیں بنایا۔ لوگ اُن کی لیڈرشپ کی خوشبو میں مست ہو کر اسلام کے قریب آتے تھے۔ یوں ایسے لیڈر کی ایسے بے رحم انداز میں بے دخلی پر ترکی کی عوام نے اپنی فوج کو شکستِ فاش دے دی۔

پاکستان میں 15 رجولائی کی رات میڈیا سے وابستہ چند نامور شخصیات نے جشن منایا۔ سوشل میڈیا پر انہوں نے ترک فوج کی کامیابی اور اردگان کی بے دخلی پر دبی دبی خوشی کا اظہار کیا۔ کٹار جیسی تیز آواز والی ایک خاتون نے کمال معصومیت سے پوچھا: ''کیا اب اردگان پاکستان میں پناہ گزین ہوگا؟'' اخبارات میں فوجی اقتدار کے دسترخوان پر ہڈیاں چچوڑنے والے دانش وروں کا پیچ وتاب دیکھنے کے لائق تھا۔ دوسری طرف حکمران جماعت اور اس کے اتحادی اردگان کی فتح کو اپنی

کامیابی دکھا کر پیش کرتے رہے۔ ان حکمرانوں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ اردگان نے ترکی کا تعلیمی بجٹ 7.05 ارب لیرا سے بڑھا کر 34 ارب لیرا کیا ہے جو 12 ارب ڈالرز کے برابر رقم ہے۔ 2002ء میں ترکی کی بڑی یونیورسٹیوں کی تعداد 98 تھی جو اب 200 کا ہندسہ پار کر گئی ہیں۔ 2002ء میں ترکی پر قرضہ 23.05 ارب ڈالرز تھا جو 10 سالوں میں کم ہو کر صرف 900 ملین ڈالرز رہ گیا۔ جی ڈی پی میں 64 فی صد اضافہ کیا گیا۔ ترکی اس قابل ہو گیا کہ دوسرے ملکوں کو قرض دے سکے۔ 2002ء میں زرمبادلہ کے ذخائر 26.05 بلین ڈالرز تھے جو دس برسوں میں 92 بلین ڈالرز کی حدود سے آگے نکل گئے۔ 12 سال اقتدار میں اردگان نے ترکی میں بین الاقوامی ہوائی اڈوں کی تعداد کو دوگنا کر دیا۔ وہ 26 سے بڑھ کر 50 ہو گئے۔ سیاحت سے آمدن 20 ارب ڈالرز تک پہنچ گئی۔ 10 سالوں میں ترکی میں 13500 کلومیٹر لمبی نئی معیاری سڑکیں بنائی گئیں۔ 1076 کلومیٹر لمبی نئی ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ 5449 کلومیٹر ریلوے لائنوں کی مرمت ہوئی۔ پچھلے سات سالوں میں ترکی نے جدید ترین ٹرینوں کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ ان میں سفر نہایت آرام دہ، کرایہ انتہائی موزوں اور وقت کی حیرت انگیز بچت جیسی ترغیبات ہیں۔ ترکی نے اردگان کے دور میں زراعت، صنعت و حرفت، برآمدات و درآمدات میں ایسی ترقی کی ہے جو ان برسوں میں یورپ کے کسی بھی ملک میں نہیں ہوئی۔

ہمارے حکمران اردگان کی فتح پر بغلیں بجانے کی بجائے اُن سے سبق سیکھیں۔ اگر پاکستان ترقی کرتا ہے، عام آدمی کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔ غربت، مہنگائی، بے روزگاری ختم ہوتی ہے۔ ہمارے دفتری نظام کی آدم خوریت دور ہوتی ہے۔ عام پاکستانی کو ایک باوقار زندگی ملتی ہے تو لوگ اردگان کی طرح ہمارے حکمرانوں کے گرد بھی آہنی حصار بنا دیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو جمہوریت کے کاغذی پھول ادبار کی پہلی بارش میں ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ گتے کی

دیواریں سیلابی یورش میں بہہ جائیں گی۔ جمہوریت کو بچانے پاکستانی گھروں سے نہیں نکلیں گے۔ ترک جمہوریت کے خول کو پوجنے کی بجائے اُس کے مغز کو دیکھنے والی آنکھیں درکار ہیں۔ کاش! کورچشم جان سکیں!!

مشتری ہشیار باش

سجاد وسیم راجہ

''ترکی میں انقلابیوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ انہیں اپنی کارروائی کا آغاز ترک صدر اردگان کی گرفتاری سے کرنا چاہیے تھا۔ اگر انقلابی یہ غلطی نہ کرتے تو آج نتائج کچھ اور ہوتے۔ ترک صدر کو گرفتار نہ کرنے سے انہیں قوم سے خطاب کا موقع میسر آ گیا اور ان کی اپیل پر لاکھوں ترک عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ جیسے ہی انقلابی فوجی دستوں نے غضب ناک عوام کو سڑکوں پر دیکھا، اسی لمحے انقلاب ناکام ہو گیا۔ انقلاب کے منصوبہ بندی کرنے والے بیس اعلیٰ فوجی افسر تصادم میں مارے گئے۔ باقی تقریباً 30 شدید زخمی ہو گئے جن پر اب بغاوت کے مقدمے چلیں گے۔''

یہ بیان ہے اسرائیل کے عسکری امور کے ماہر رون بن نشائی کا جو انہوں نے اسرائیل کے مشہور اخبار ''یدعوت احرونوت'' کو جاری کیا۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ترک حکومت کی پالیسیاں

اندرونی دشمنوں سے زیادہ بیرونی دشمنوں کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ ''انقلاب'' کی ناکامی پر مغرب کے بعض حلقے اور ان کے اتحادی یہ باور کراتے بھی نظر آئے کہ یہ سب کچھ اردگان کا ڈرامہ تھا۔ یہ بیان اس کی قلعی کھولتا ہے اور اسرائیل کی موجودہ ڈپٹی وزیرخارجہ الون لیفن کا ایک بیان بھی اس تناظر میں زیرگردش ہے کہ ترکی میں اردگان کی جماعت کو اقتدار سے بے دخل کرنا اسرائیل کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فتح اللہ گولن امریکی ریاست پنسلوانیا میں مقیم ہیں اور ان کے اسرائیل سے تعلقات دوستانہ ہیں جس کا ثبوت دیہ ہے کہ اردن کے مقبوضہ مغربی کنارے میں بھی اس جماعت کے تین اسکول موجود ہیں جس کی اجازت اسرائیل نے اُسے دی۔

فتح اللہ گولن طیب اردگان کو نجم الدین اربکان کی جماعت رفاہ پارٹی سے الگ کرنے والے تھے۔ طیب اردگان کی کامیابی اور اس کے بعد ان کی پالیسیوں پر تنقید ان کا معمول رہا۔ بظاہر وہ مذہبی خدمات انجام دیتے ہیں، لیکن ان کی خدمات کی پراسرار بتاتی ہے کہ وہ کسی کے اشارے پر کام کررہے ہیں۔ ترک حکومت نے غزوہ کے مظلوم فلسطینیوں کی حمایت کے لیے امدادی جہاز ''فلوٹیلا'' روانہ کیا تو گولن نے طیب اردگان پر سخت تنقید کی۔ پھر مذہبی تحریک کے اس قائد نے اردگان کی ہر اس پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا جو امریکا اور اسرائیل کے مفاد کے خلاف تھی۔ فتح اللہ گولن طیب اردگان کو شیطان سے بھی بڑا دُشمن قرار دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں اس بغاوت کو ڈرامہ قرار دینا احمقانہ سوچ کا انداز قرار دیا جاسکتا ہے یا شاید انقلاب کی ناکامی کے بعد اپنے مذموم رول پر پردہ ڈالنا مقصود ہے۔

انقلاب اگرچہ ناکام ہوگیا اور یہ شاید تاریخ کا پہلا واقعہ ہے، مگر اردگان کے دشمن چپکے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کی حکومت کے خلاف سازشیں مزید بہتر ہوجائیں گی۔ اس وقت ترکی میں ''تطہیری مہم'' جاری ہے، مگر اس میں بھی ہوشمندی اور تحمل کی ضرورت ہوگی۔ شفاف تحقیقات کے

بغیر ''صفائی کی مہم'' کے اثرات منفی ہو سکتے ہیں۔ طیب اردگان اب اسی لیے کامیاب ہوتے رہے کہ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد اعتدال پسندی کی راہ اختیار کی اور ہر معاملے میں رواداری کا مظاہرہ کیا، یہ ان کی کامیابی کی کلید ہے۔ انتقام کے ذریعے معاشرے کی یکجہتی کو نقصان پہنچتا اور معاشرہ تقسیم ہوتا ہے اور مخالفین کو پروپیگنڈے کا موقع ملتا ہے۔ بغاوت کا قلع قمع کرنا اردگان کا حق ہے، مگر اس کے لیے حوصلہ مندی اور برداشت کی ضرورت ہے۔ تدبر اچھی حکمرانی کا خاصہ ہوتا ہے۔ طیب اردگان نے اپنی معتدل پالیسیوں سے ووٹ کو طاقت بنایا۔ اس کے لیے انہوں نے تمام تر طعن و تشنیع کے باوجود ایسی پالیسیوں سے احتراز کیا جس سے ان پر کٹر پن کا الزام لگتا۔ اسلامی اقدار کے تحفظ کی بات کی تو اس میں اسلوب سطحی اختیار کرنے کے بجائے عملیت کو اپنا ہتھیار اس طرح بنایا کہ انہوں نے انتخابات چاہے وہ قومی ہوں یا بلدیاتی ان میں کامیابی کے بعد عوام سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کیا اور انہیں انصاف، امن، صفائی، صحت، تعلیم اور روزگار جیسی بنیادی سہولتیں میسر کیں جس کی وجہ سے ایک مخصوص طبقے کے سوا سب نے ان کی حمایت کی۔ عمومی اعتماد کی اسی فضا کے باعث تمام تر اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باوجود وہ عوامی حمایت سے محروم نہیں ہوئے۔ کرپشن کے الزامات کے پروپیگنڈے باوجود ان کے دشمنوں کے تمام وار خالی گئے۔ فوجی بغاوت کے فرو ہو جانے کے بعد یہی انداز اختیار کیا جانا ضروری ہے تاکہ ان کے اعداء کو جو اندرونی اور بیرونی محاذ پر ان کے خلاف برسرپیکار ہیں، پروپیگنڈے کے لیے ہتھیار میسر نہ آئے۔

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا خواب دیکھنے والوں کی نظریں ترک قیادت پر ہیں۔ امید کا یہ دیا روشن رہے۔ ''تطہیری مہم'' میں بھی مجرموں کو ضرور کیفر کردار تک پہنچایا جائے، مگر اس کا دائرہ کار اتنا وسیع نہ ہو کہ گھبراہٹ اور خوف زدگی کا عنصر سامنے آئے، کیونکہ آنے والی خبریں بتا رہی ہیں کہ تطہیری

مشرق کے شب و روز

مہم میں تعلیمی اداروں کے سربراہان، اساتذہ، ججز اور بعض روحانی سلسلوں سے وابستہ افراد کو بھی حراست میں لیا جارہا ہے اور انہیں ملازمتوں سے بھی معطل کیا جارہا ہے۔ بلاشبہ عجلت میں کیا جانے والا اقدام الٹا پڑ سکتا ہے۔ ترکی کی عظمت رفتہ کی بحالی کی علامت جسٹس پارٹی نے بغاوت کے خاتمے کے لیے جو حمایت حاصل کی وہ ضائع نہ ہو، ورنہ سیکولرازم کی علمبردار جماعتیں اور ان کے پشت پناہ موقع کی تلاش میں ہیں، کہیں ایسا نہ کہ طیب اردگان بھی ہر ''عروج وزوال'' کا مصداق بنیں اور عالم یہ ہو جائے ؎

خون اپنا چمن کو میں نے دیا
لے گیا آرزوئے بہار کوئی

ترکی میں جمہوریت یا نظریات کی فتح؟

اوریا مقبول جان

سرکس کے کرداروں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک ماہر اور مشاق فنکار جو رسے پر چلتا ہے، قلابازیاں لگاتا ہے، دونوں ہاتھوں سے کس قدر مہارت سے گیندوں کو اچھالتا ہے، غرض طرح طرح کے ماہرانہ کرتب دکھا کر داد وصول کرتا ہے اور تالیوں کی گونج میں رخصت ہوتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد عجیب وغریب لباس، پھندنے والی ٹوپی اور چہرے پر چونے سے نقش ونگار بنائے ہوئے ایک مسخرہ داخل ہوتا ہے اور وہی سارے کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رسی پکڑ کر جھولنے لگتا ہے تو دھڑام سے زمین پر گر جاتا ہے، گینداس کے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں اور قلابازیاں وہ اس مضحکہ خیز انداز میں لگاتا ہے کہ پورا پنڈال ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک اپنی مہارت کی داد وصول کرتا ہے تو دوسرا اپنے مسخرا پن کی۔ دونوں کی اپنی اپنی دنیا اور اپنی اپنی حیثیت ہے، لیکن سرکس کے مسخرے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہیرو نہیں بن سکتا۔ اس میں

وہ صلاحیتیں ہی موجود نہیں۔ اس لیے وہ ہیرو والی داد نہیں چاہتا، بلکہ مسخرے والی داد پر خوش ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں جب ترکی میں طیب اردگان کی حکومت کے خلاف فوج کے ایک مختصر ٹولے نے بغاوت کی کوشش کی تو ترکی کے اس مقبول صدر کی اپیل پر ترک عوام سڑکوں پر نکل آئے، ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے، سپاہیوں کے سامنے دیوار بن گئے۔ ایسے میں پاکستان کے کچھ سیاست دان اور عظیم دانشور بھی اپنے ''عظیم الشان'' تبصرے کرنے لگے کہ اب عوام جمہوریت کا خود دفاع کریں گے۔ طالع آزماقوتوں کے لیے یہ بہت بڑا سبق ہے۔

اب ڈکٹیٹرشپ کے زمانے گزر گئے۔ گزشتہ دو دنوں سے پاکستانی قوم ان کے منہ سے یہ تبصرے سنتی اور ویسے ہی مسکراتی رہی جیسے مسخرے کے کرتبوں پر مسکراتی ہے، کیونکہ سرکس میں مسخرہ بھی اپنی ناکام پرفارمنس پر ہیرو کی طرح ہاتھ اٹھا کر داد کا طالب ہوتا ہے۔ کیا ان رہنماؤں نے ٹھنڈے دل کے ساتھ دامن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں اور طیب اردگان میں کیا فرق ہے۔ اس کی بیرون ملک سے ایک ٹیلیفون پر دی گئی کال پر لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور ان کے ہر دفعہ جانے کے بعد لوگ مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ دانشوروں کا تو کیا کہنا، ان کی خبروں، ٹویٹر کے ٹویٹ اور فیس بک کے تبصروں میں صبح تک یہ خواہش امڈ امڈ کر سامنے آ رہی تھی کہ فوجی بغاوت کامیاب ہو جائے گی اور ترکی کا اسلامی چہرہ سیکولرازم اور لبرل ازم میں بدل جائے۔ یہ دانشور، تجزیہ نگار اور تبصرہ نگار پوری رات پاکستان میں نہیں، بلکہ پوری دنیا کے میڈیا پر چھائے رہے۔

پاکستان کے سیکولر اور لبرل دانشور تو اپنے ان ہی آقاؤں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ اپنے میڈیا اور سوشل میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ بس اب طیب اردگان کی اسلام پسند حکومت کا سورج غروب ہو گیا۔ ذرا مغرب کے میڈیا اور اس کے کرتا دھرتا افراد کی ناکام خواہشوں اور حسرتوں کا تماشا ملاحظہ کریں۔ برطانیہ کا مشہور اخبار ٹیلی

گراف خبر لگاتا ہے۔ ''The Army Sees Itself as the Guardian of Turkey's Secular Consitution'' (فوج اپنے آپ کو ترکی کے سیکولر آئین کی محافظ سمجھتی ہے) یعنی پارلیمنٹ نہیں فوج آئین کی محافظ ہے۔ جب فوجی دستے بغاوت کے لیے نکلے تو نیویارک ٹائمز نے تو فوج کی جانب عوام کی ہمدردیاں موڑنے کے لیے یہ خبر لگائی: ''A Look at Erdogan, Controvesial Rule in Turky'' (ترکی میں اردگان کے متنازعہ اقتدار پر ایک نظر)۔ اس دوران دنیا بھر کے اخبار اردگان کے بارے میں افواہیں پھیلاتے رہے۔ ڈیلی بیٹ نے ایک اپ ڈیٹ لگائی: ''Erdogan Reportedly Denied Assylum in Germany, Now Headed to London'' (جرمنی نے اردگان کو پناہ دینے سے انکار کر دیا، اب وہ لندن جا رہے ہیں) Vox نیوز تو کھل کر بولنے لگا: ''rdogan Is Clearly a Threat to Turkish Democracy and Secularism'' (اردگان واضح طور پر ترکی کی جمہوریت اور سیکولرازم کے لیے ایک خطرہ ہے)۔ انتہائی معتبر جانا جانے والا فوکس (FOX) نیوز اپنے تبصرہ نگاروں میں کرنل رالف پیٹرز (PetersRalf) کو لے کر آیا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے 2005ء میں پینٹاگان کے جرنل میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں پوری مسلم دنیا کا ایک نیا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس کرنل صاحب نے اردگان کے خلاف ایک تفصیلی تبصرہ کیا اور کہا: "If The Coup Succeeds, Islamists Loose and We Win" (اگر بغاوت کامیاب ہو جاتی ہے تو اسلامسٹ ہار جائیں گے اور ہم جیت جائیں گے)۔ بددیانتی کا ''شاندار'' مظاہرہ روس کے اخبار سپتنک (Sputnik) نے کیا۔ عوام کی تصویریں لگا کر کیپشن لگایا: Images From The Ground in Turkey Show People Celebrating Coup" (بغاوت پر خوشی منانے والے عوام کی

تصاویر) پاکستان کے سیکولر میڈیا نے بھی اپنے مغربی آقاؤں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی خواہش کو خبر بنایا۔ ایک انگریزی معاصر نے آٹھ کالمی سرخی لگائی ERDO-GONE اس سرخی میں چھپی ان کی حسرت کتنی واضح نظر آ رہی ہے۔ سوشل میڈیا کے سیکولر اور لبرل بلاگرز تو پوری رات تڑپتے رہے کہ کسی طریقے سے طیب اردگان کے خلاف بغاوت کی خوش کن خبر سنیں۔ لیکن ناکامی کے بعد جمہوریت کی بقا اور فتح کا نعرہ لگانے لگے۔

کیا یہ جمہوریت کی فتح ہے یا طیب اردگان کے ان نظریات کی فتح ہے جو وہ اپنے ملک کو بتدریج اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگا رہے ہیں۔ ایک ایسا ملک جسے جنگ عظیم اول اور خلافت کے خاتمے کے بعد کمال اتاترک نے سیکولر ڈھانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔ قدیم ترکی لباس ضبط کر لیے گئے تھے اور پینٹ کوٹ اور سکرٹ اور بلاؤز کو لباس بنا دیا گیا۔ عربی رسم الخط کی جگہ رومن رسم الخط نافذ کیا گیا۔ یہاں تک کہ اذان بھی ترکی میں دی جانے لگی۔ ظلم اس قدر کہ پارلیمنٹ میں ارکان نے عربی میں اذان دینا شروع کی تو انہیں گولیوں سے بھوننا شروع کیا گیا اور سات ارکان نے جام شہادت نوش کر کے اذان مکمل کی۔ ان اقدامات کے خلاف جلال بایار اور عدنان مندریس کی حکومت آئی تو فوج نے اقتدار پر قبضہ کر کے وزیر اعظم عدنان مندریس کو پھانسی دے دی اور صدر جلال بایار کو عمر قید۔ سو سالہ سیکولرازم اور امریکی مدد پر چلنے والی سیکولر فوج کی موجودگی میں طیب اردگان لوگوں کے دلوں میں چھپی اسلام سے محبت کو سامنے لے آیا اور اب پورا مغرب اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھتا ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ اردگان کے یہ چند اقدامات معاشرے کو وہاں لے جائیں گے جہاں شریعت معاشرے کا قانون بن جائے گی۔

وہ معاشرہ جہاں مساجد ویران ہو چکی تھیں، طیب اردگان نے نہ صرف انہیں آباد کیا، بلکہ صرف دو سالوں 2002ء اور 2003ء میں 17 ہزار نئی مساجد تعمیر کروائیں۔ حجاب جس پر

پابندی لگائی گئی تھی، یہ پابندی اٹھالی گئی اور نومبر 2015ء میں عالمی میڈیا میں یہ خبر بن گئی کہ ایک جج نے حجاب پہن کر کیس سنا۔ اتاترک نے تمام مدارس ختم کر دیے تھے اور ان کی جگہ ''امام ہاتپ'' اسکول قائم کیے گئے جہاں اسلام کی مسخ شدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اردگان نے پہلے ان کا نصاب بدلا اور اب ان اسکولوں میں جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا تھا، 10 لاکھ طالب علموں نے داخلہ لیا۔ جب وہ برسرِ اقتدار آیا تو ان اسکولوں میں صرف 65 ہزار طلبہ تھے۔ تمام اسکولوں میں مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور قرآن پاک کی عربی میں تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ اتاترک کے زمانے سے ایک پابندی عائد تھی کہ بارہ سال سے پہلے آپ قرآن پاک کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

اردگان نے یہ پابندی اٹھالی۔ سیکولر لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ ایک بچے کو 12 سال تک سیکولر نظریات پر پختہ کر لیا جائے اور پھر بے شک وہ قرآن پڑھے، اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھے گا۔ ایک مغرب میں رچے بسے معاشرے میں 2013ء میں اردگان نے اسکول اور مسجد کے سو میٹر کے اردگرد شراب بیچنے اور اس کے اشتہار لگانے پر پابندی عائد کر دی۔ ''زراعت اسلامی بینک'' کو سودی بینکوں پر ترجیح دی۔ اگرچہ کہ یہ تمام اقدامات بنیادی نوعیت کے ہیں اور معاشرے کو مکمل طور پر اسلامی اصولوں پر نہیں ڈھال پاتے، لیکن اس کے باوجود بھی خوف کا یہ عالم ہے کہ اردگان کے یہی اقدامات اگر جاری رہے تو ایک دن ترک معاشرے سے ایسی لہر ضرور اٹھ سکتی ہے جو شریعت کو نافذ کر کے دکھا دے گی اور شریعت اور خلافت یہ دو لفظ تو مغرب اور سیکولر لبرل طبقات کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ لوگ جمہوریت کے لیے نہیں، بلکہ اردگان کے اسلامی اقدامات کے حق میں نکلے۔ اس کے لیے کہ اس سے پہلے کئی بار فوج نے اقتدار پر قبضہ کیا لوگ مزے سے سوتے رہے، یہ اسلامی اقدار جو ان کی روح میں رچی بسی ہیں۔ دنیا بھر کے سیکولر لبرل ساری رات بغاوت کی کامیابی کی خواہش میں تڑپتے رہے۔

اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو پھر ان کے تبصرے دیکھنے کے قابل ہوتے۔ کیسے فوجی بغاوت کی حمایت میں رطب اللسان ہو جاتے۔ اب ناکام ہو گئے ہیں تو جمہوریت اور سسٹم کے بقا کے لیے عوام کی جدوجہد کا نعرہ لگا دیا اور پھر ان کی ہمنوائی میں پاکستان کی جمہوری سیاست کے بددیانت، کرپٹ اور چور سیاستدان بھی میدان میں آ گئے جنہوں نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی اور اپنی جائیدادیں بنائیں۔ ترک عوام نے سرکس کے ہیرو کی طرح اپنی فنکاری دکھائی اور داد وصول کی، لیکن اب یہ ویسی ہی داد وصول کرنا چاہتے ہیں، لیکن کیا کیا جائے لوگ ان کی خواہشوں اور گفتگو پر ویسے ہی مسکراتے ہیں جیسے سرکس کے مسخرے کی حرکتوں پر مسکراتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مسخرہ اپنے مسخرے پن پر داد چاہتا ہے اور وصول کرتا ہے، لیکن یہ چاہتے ہیں کہ حرکتیں مسخرے والی کریں اور داد ہیرو کی وصول کریں۔

طیب اردگان کی ملک وقوم کے لیے خدمات

مولانا عبدالمنعم فائز

ترکی نے تاریخ کا رخ ایک بار پھر موڑ دیا ہے۔ طیب اردگان نے ثابت کردکھایا کہ جس حکمراں کی محبت عوام کے دلوں میں بستی ہو، اسے ٹینکوں اور توپوں سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ اردگان نے ثابت کردکھایا ہے کہ اسلام پسندوں کو نہ صرف حکومت کرنے کا حق ہے، بلکہ وہ اس قدر کامیاب حکمراں ہیں کہ عوام ان پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔ ناکام بغاوت کے بعد پاکستان اور دیگر ممالک میں سیکولر ازم کے حامیوں نے ایک بار پھر پرانے الزامات کی جگالی شروع کردی ہے۔ گھسے پٹے سوالات اور بوگس اعتراضات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ترک عوام گمراہ ہوچکے ہیں۔ آج ہم حقائق کی دنیا میں اندازہ لگاتے ہیں کہ عوام کیوں طیب اردگان کے گرویدہ بنے ہیں؟ اردگان پر لگے اعتراضات کی حقیقت کیا ہے؟ اردگان کے حیرت انگیز اقدامات کیا ہیں؟

اقتصادی اور معاشی اقدامات:

اردگان نے اپنے ملک کو اقتصادی لحاظ سے 111 نمبر پر موجود ملک کو اٹھا کر 16 ویں نمبر پر لے گیا۔ اس طرح ترکی پہلی بار دنیا کے اقتصادی لحاظ سے مضبوط 20 ممالک کے گروپ (G-20) میں شامل ہو گیا۔ 2013ء میں ترکی کی سالانہ قومی پیداوار 1100 ارب ڈالر تک جا پہنچی تھی۔ دس سال پہلے ایک عام ترکی کی سالانہ آمدن 3500 ڈالر تھی، اب وہ آمدن بڑھ کر 11 ہزار ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ یہ آمدن فرانس کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ترکی میں اقتصادی خوش حالی کے نتیجے میں لوگوں کی تنخواہوں میں 300 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ ملازم کی بنیادی تنخواہ جو کسی دور میں 340 لیرہ تھی، اب بڑھ کر 957 لیرہ تک پہنچ گئی ہے۔ روزگار تلاش کرنے والے افراد کی تعداد جو کبھی 38 فیصد تھی اب گر کر 2 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ ترکی کا بجٹ خسارہ جو بڑھ کر 47 ارب تک پہنچ گیا تھا۔ اس کو ختم کر دیا۔ ورلڈ بینک نے ترکی کو قرض دے رکھا تھا۔ اردگان نے سارا قرض لوٹا دیا۔ آخری قسط 300 ملین ڈالر کی تھی۔ اس کے برعکس ترکی نے ورلڈ بینک کو 5 ارب ڈالر قرضہ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ترکی کے خزانے میں 100 ارب رکھے ہیں۔ اس دوران یورپ کے متعدد ممالک قرض کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہاں غربت کی شرح بڑھ رہی ہے۔ دس سال قبل ترکی کی برآمدات 23 ارب تھیں، اب وہ بڑھ کر 153 ارب تک پہنچ گئی ہیں، یہ برآمدات دنیا کے 190 ملکوں میں پہنچ رہی ہیں۔ ترکی کی گاڑیاں پہلے نمبر پر، دوسرے نمبر الیکٹرانک سامان ہے۔ اس وقت یورپ میں فروخت ہونے والے الیکٹرانک سامان میں سے ہر تیسرا سامان ترکی کا تیار کردہ ہوتا ہے۔ 2023ء وہ سال ہے جس کے بارے میں طیب اردگان نے اعلان کیا ہے کہ ترکی اس سال دنیا کی سب سے پہلی اقتصادی اور سیاسی قوت بن جائے گی۔

انفرااسٹرکچر اور دفاع سے متعلق اقدامات:

اردگان نے ترکی کی تاریخ میں پہلی بار اپنا ٹینک بنایا، پہلا بحری فریگیٹ تیار کیا، پہلا ڈرون طیارہ اور فوجی سیٹلائیٹ بھی اسی دور میں بنایا گیا۔ استنبول کا ہوائی اڈہ یورپ کے بڑے ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایک دن میں اس ہوائی اڈے سے 1260 ہوائی جہاز اڑان بھرتے ہیں۔ اردگان نے 50 کے لگ بھگ ایئرپورٹ تعمیر کیے ہیں۔ تیز رفتار سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ تقریبا 19 ہزار کلومیٹر طویل نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ جبکہ ملک میں ٹریفک حادثات کی تعداد 50 فیصد کم ہوگئی۔ گزشتہ تین سال سے ترکی کے فضائی راستوں کو دنیا کے بہترین فضائی رستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دس سال کے دوران اردگان کی حکومت نے ملک بھر میں دو ارب 77 کروڑ درخت لگائے ہیں۔ ترک حکومت نے کچرے کو ری سائیکل کر کے توانائی بنانے کے منصوبوں پر کام شروع کیا ہے۔ اس منصوبے سے ترکی کی ایک تہائی آبادی فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس وقت ترکی کے 98 فیصد شہروں اور دیہاتوں میں بجلی ہے۔

تعلیم کے میدان میں:

دس سال میں اردگان نے 125 یونیورسٹیاں بنائیں، 189 اسکول قائم کیے اور 510 ہسپتال تعمیر کیے۔ سرکاری اسکولوں میں 169 ہزار نئی کلاسز کا آغاز کیا اور شرط لگادی کہ کسی بھی کلاس میں 21 بچوں سے زیادہ کو داخلہ نہیں دیا جائے گا۔ یورپ میں آنے والے حالیہ اقتصادی بحران کے فوری بعد یورپ اور امریکا بھر میں یونیورسٹی اور اسکول فیسوں میں بے تحاشا اضافہ کردیا گیا۔ اس کے برعکس طیب اردگان نے سرکاری حکم نامہ جاری کیا کہ یونیورسٹی اور اسکول کی تعلیم مفت ہوگی اور تمام تر اخراجات حکومت برداشت کرے گی۔ ترکی کا ہدف ہے کہ 2023ء تک 3 لاکھ محققین تیار کیے جائیں گے۔ تاکہ ملک میں نت نئی تحقیقات کا دروازہ کھل

سکے۔ ترکی میں تعلیم کا بجٹ بڑھا کر دفاع کے بجٹ سے بھی زیادہ کردیا گیا ہے۔ ایک استاد کو ڈاکٹر کے مساوی تنخواہ دی جاتی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی پر تحقیق کے لیے 35 ہزار لیبارٹریاں قائم کی گئی ہیں۔

سیاسی کامیابیاں:

دنیا کی تاریخ میں پہلی بار فوجی بغاوت کو عوام کی طاقت سے کچل کر دکھایا۔ سیاسی طور پر اردگان کا بڑا کارنامہ قبرص کے دونوں حصوں کے درمیان امن قائم کرنا اور تشدد پر آمادہ کردوں کو پرسکون کرنا بھی ہے۔ یہ مسائل گزشتہ برسہا برس سے ترکی کا سردرد بنے ہوئے تھے۔ اردگان نے ایک ٹی وی پروگرام میں بارہ سالہ بچی کے ساتھ مکالمہ کیا۔ اس مکالمے کا موضوع ترکی کا مستقبل تھا۔ اردگان نے اس بچی کی ذہانت کی تعریف کی اور ترک بچوں کو یہ تربیت دی کہ اپنے مستقبل کے بارے میں اس طرح سے سوچیں۔ اردگان نے اسرائیل جیسی قوت کو معذرت کرنے پر مجبور کردیا اور معذرت قبول کرنے کی شرط یہ رکھی کہ غزہ کا محاصرہ ختم کردے۔ شمعون پیریز کے ساتھ عالمی اقتصادی کانفرنس میں شریک اردگان نے کانفرنس سے صرف اس لیے واک آؤٹ کیا کہ اسرائیل نے معصوم فلسطینیوں پر جنگ مسلط کررکھی تھی۔ اردگان وہ واحد سربراہ حکومت ہیں جنہوں نے برما کے مظلوم مسلمانوں کے پاس جاکر ملاقات کی اور مسلمانوں کو دلاسہ دیا۔

اردگان نے تقریباً نوے سالہ فوجی حکومت کے بعد سرکاری اسکولوں میں قرآن اور حدیث کی تعلیم کی اجازت دی۔ دینی اقدامات: اردگان نے اس ترکی کو بدل کر دکھایا جہاں نوے سال تک اتاترک کی دین دشمن پالیسیاں غالب رہیں۔ دین کا نام لینے کی پاداش میں منتخب وزیراعظم عدنان میندرس کو پھانسی ہوچکی ہے۔ اس کے بعد منتخب وزیراعظم نجم الدین اربکان کو بھی معزولی اور قید کا سامنا کرنا پڑا۔ اردگان نے مطیع الرحمٰن نظامی کو پھانسی دینے پر بنگلہ دیش سے اپنا سفیر

واپس بلالیا۔ اردگان نے حکومتی یونیورسٹیوں میں اسکارف پہننے کی اجازت دی۔ جس وقت ایک عرب ملک میں دنیا کی سب سے بڑی کرسمس ٹری بنایا گیا، جس کی مالیت 4 لاکھ ڈالر تھی، اس وقت اردگان نے دنیا کی سب سے بڑی لائٹنگ کے ذریعے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا لفظ روشن کیا۔ اردگان نے سات سال عمر کو پہنچنے والے تقریباً 10 ہزار بچوں پر مشتمل استنبول کی سڑکوں پر ریلی نکالی۔ اس ریلی میں بچے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اب سات سال کے ہو گئے ہیں، اب ہم نماز پڑھ سکیں گے۔

ترکی بغاوت کا اصل محرک

مؤلف : نامعلوم

ترکی کی حالیہ ناکام بغاوت چند دنوں، چند مہینوں اور چند افراد کی محنت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے ایک شخص کی پوری زندگی کی جدوجہد اور اس کے تیار کردہ لاکھوں لوگوں جو ترکی کے ہر محکمہ میں اعلیٰ پوسٹوں پہ موجود ہیں، کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا۔ اور اس کی پشت پناہی عالمی سامراج بڑی ڈھٹائی سے کر رہا تھا، جن لوگوں نے پہلے دو تین گھنٹے عالمی میڈیا پہ نظر رکھی، وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اس ناکام بغاوت کا بنیادی کردار فتح اللہ گولن نام کا ایک شخص ہے، جو اس وقت امریکی ریاست پنسلوانیا کے ایک شہر سالس برگ میں امریکی چھتر چھایا تلے 1400 ایکڑ یعنی 3200 کنال کے گھر میں عیش وعشرت کی زندگی گذار رہا ہے، اس شخص کی سالانہ آمدن 31 بلین ڈالر سے زائد ہے۔

فتح اللہ گولن ترکی کا متنازعہ ترین کردار ہے، جو چند لاکھ لوگوں کی نظر میں تو ہیرو ہے، لیکن ترکی کے کروڑوں عوام اسے ملک وملت کا باغی اور غدار سمجھتے ہیں، ترکی میں اس شخص کی جڑیں اتنی گہری ہیں، کہ اب تک اس کے پیروکار ہزاروں کی تعداد میں ہر محکمہ سے گرفتار کئے جا چکے ہیں، جن میں سے صرف عدلیہ میں سے 2500 سے زائد جج اب تک گرفتار ہو چکے ہیں۔ فتح اللہ گولن صرف ایک شخص نہیں، ایک تحریک کا نام ہے۔ اندرون خانہ ان کا نام "جیش النور" اور "جنود الحق" ہے، جس سے وابستہ افراد صرف ترکی ہی نہیں، بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک خصوصا پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور فتح اللہ گولن کو پیغمبر یا امام تو نہیں لیکن اس کے قریب قریب درجہ ومقام دیتے ہیں۔

فتح اللہ گولن 65 کتب کا مصنف ہے، جن کا دنیا کی 35 زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اس کی 13 کتب کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، آڈیو وڈیو کیسیٹس کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

ترکی میں فتح اللہ گولن کے اثر ورسوخ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے، کہ اس کے معتقد اعلیٰ حکومتی شخصیات کے ٹیلی فون تک ٹیپ کرتے پکڑے گئے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں! فتح اللہ گولن کون ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ اور اس کا مشن کیا ہے؟

فتح اللہ گولن کی جائے پیدائش ایک چھوٹی سی بستی ہے، جس میں سال کے نو ماہ موسم سرما رہتا ہے۔ اس بستی کا نام کوروجک (Korucuk) ہے، جو صوبہ ارض روم (Erzurum) کے شہر ''حسن قلعہ'' کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ اس بستی کی آبادی ساٹھ ستر گھرانوں سے زائد نہیں۔ گولن کے آباؤ اجداد ''اخلاط'' نامی تاریخی گاؤں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ''اخلاط'' صوبہ بتلیس میں پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ کرام کی اولاد میں سے بعض حضرات وادی بتلیس کے علاقے کی طرف آئے

اوراس علاقے کے لوگوں کے روحانی پیشوا بن گئے، جس کے نتیجے میں اس علاقے کے ترک قبائل کے دلوں میں اسلامی روح جاگزیں ہوگئی۔

اس کوروجک نامی گاؤں کے امام مسجد رامز آفندی کے گھر 1941/04/27 کو پیدا ہونے والے بچے کا نام محمد فتح اللہ گولن رکھا گیا۔ یہ گھرانہ اتنا مذہبی تھا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی طرف سے مذہبی تعلیم پہ سخت پابندی کے باوجود اس کی والدہ اپنے گاؤں میں عورتوں اور بچیوں کو مذہبی تعلیم دیتی رہی اور کسی پابندی کی پرواہ نہ کی۔ فتح اللہ گولن کی ذاتی ویب سائٹ کے مندرجات جس کی آزاد ذرائع سے تصدیق نہیں ہوسکی، کے مطابق چار سال سے بھی کم عمر میں اپنی والدہ سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور صرف ایک ماہ میں مکمل ناظرہ قرآن مجید ختم کرلیا (میں اس کا انکار اس لیے نہیں کرسکتا کہ ماضی قریب کے کچھ ایسے لوگوں کو میں ذاتی طور پہ جانتا ہوں، جنہوں نے مکمل حفظ قرآن صرف ایک ماہ میں کرلیا اور یہاں تو ناظرہ قرآن مجید کی بات ہے) گولن نے ابتدائی پرائمری تعلیم اپنے گاؤں کے اسکول ہی میں حاصل کرنا شروع کی، اور عربی و فارسی زبانوں کی تعلیم وابتدائی دینی تعلیم اپنے والد رامز آفندی سے حاصل کی، کچھ عرصہ بعد آپ کے والدین اپنے بعض دوستوں کے ظلم وستم و بیوفائی کا نشانہ بنے، اور اس علاقہ کو چھوڑنے پہ مجبور ہوگئے۔ دوسرے علاقہ میں چلے جانے کی وجہ سے ارض روم کے مختلف مدارس میں حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

رامز آفندی کا تعلق علماء وصوفیاء سے بہت گہرا تھا، اور ان کا دسترخوان وسیع ہونے کی بناء پہ جید ترین علماء وصوفیاء کا ان کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ علماء وصلحاء کی گفتگو اس کے کانوں میں پڑتی رہتی تھی، اوران سے ایک قلبی تعلق بننا شروع ہوگیا۔ اپنے بچپن کے دور میں جس شخصیت کے

افکار و خیالات سے گولن بہت زیادہ متاثر ہوا، ان کا نام شیخ محمد لطفی الوارلی تھا۔ پون صدی کے قریب وقت گذر جانے کے باوجود گولن آج بھی ان کا نام انتہائی احترام اور محبت سے لیتا ہے اور اس بات کا برملا اعتراف کرتا ہے کہ میں اپنے جذبات، احساسات، اور بصیرت میں بڑی حد تک ان سے سنی ہوئی باتوں کا احسان مند ہوں۔ ایک وقت تھا، میں ان کے منہ سے نکلنے والی ہر بات کو کسی دوسرے جہاں سے وارد ہونے والے الھامات سمجھتا تھا۔

اوائل عمری میں جس دوسری شخصیت کا فتح اللہ گولن کی فکری و علمی نشو نما پہ گہرا اثر رہا، وہ اس زمانہ کے بہت بڑے عالم اور چوٹی کے فقہاء میں سے ایک نام ''عثمان بکتاش'' کی شخصیت ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ''رسالۂ نور''، اور ''طلب نور'' کی تحریک سے گولن کی شناسائی ہوئی۔ یہ ایک ہمہ گیر احیائی اور تجدیدی تحریک تھی، جس کے بانی خلافت عثمانیہ دور کے ممتاز عالم دین و مجاہد بدیع الزمان سعید النورسی رحمہ اللہ تھے (جنہیں مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں زندگی کا زیادہ حصہ جیلوں میں گذارنا پڑا، اور ان کے ہزاروں معتقدین کو پھانسیاں دی گئیں) آخری بار جب ان کو جیل سے رہا کیا گیا، تو چھبیس رمضان کو رہا کیا، اور ستائیس رمضان کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ گولن اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ان سے بھی بہت متاثر رہا اور ان کا معتقد تھا۔ (افسوس بعد میں وہ ان سب بزرگوں کی تعلیمات بھلا بیٹھا)

صرف چودہ سال کی عمر میں فتح اللہ گولن نے اپنے والد کی مسجد میں خطبۂ جمعہ دیا، جسے علاقہ کے لوگوں نے بہت سراہا۔ گولن نے سعید نورسی کے آئیڈیاز اور ان کی تحریک کو لوگوں تک پہنچانا شروع کیا، انیس سال کی عمر میں گولن ارض روم کو چھوڑ کے مغربی ترکی کے شہر ادرنہ کا رخ کیا، جسے ترکی کا مغربی دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے اس شہر کی جامع مسجد " اُچ شرفلی " کا امام وخطیب مقرر کیا گیا۔ اڑھائی سال کے بعد یہاں سے ''کرکلارالی'' نامی شہر میں امام مقرر ہوا۔ یہاں

سے 1966 میں ازمیر میں تبادلہ ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں جب ازمیر شہر کی ایک مسجد میں گولن امام وخطیب تھا تو اس نے چھوٹے بزنس مینوں اور بیوروکریسی کے افراد کو نورسی تحریک کے روشن اصول وضوابط کے ذریعہ اپنے حلقۂ اثر میں لانا شروع کیا۔ ازمیر کی جامع مسجد ''کستانہ بازاری'' سے ملحق "مدرسہ تحفیظ القرآن" کو اپنا مرکز مقرر کر کے اپنے کام کا آغاز کیا، قصبوں دیہاتوں چھوٹے اور بڑے شہروں میں وعظ کرنے شروع کئے، اور اتنا مقبول ہو گیا، کہ پورے صوبہ ارض روم اور دیگر صوبوں میں شیخ فتح اللہ کے نام سے مقبول ہو گیا۔

1970 کے آغاز میں تربیتی کیمپ لگانے شروع کئے اور اپنا حلقۂ اثر وسیع کرنا شروع کر دیا۔ مارچ 1971 میں اس وقت کی حکومت پہ فوجی دباؤ کے نتیجہ میں گولن کو اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ گولن ملکی نظام کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی بنیادوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چھ ماہ کے بعد عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں گولن کو بھی رہا کر دیا گیا۔ یہی وقت تھا کہ گولن کی سوچ وفکر میں یہ تبدیلی آئی کہ جب تک فوج اور بیوروکریسی میں وسیع پیمانے پہ اپنے ہم خیال لوگ نہیں ہو جاتے، کامیابی ناممکن ہے۔

ارباب اختیار نے گولن کو پہلے ادرمیت پھر مانیسا، اور اس کے بعد ازمیر کے ایک علاقہ بورنوا کی طرف منتقل کیا۔ 10 سال کا عرصہ گولن کو فٹ بال کی طرح مختلف علاقوں میں لڑھکاتے رہے، لیکن گولن جس علاقہ میں بھی گیا، اپنی تقاریر اور شعلہ بیانی سے لوگوں کو متاثر اور اپنے قریب کرتا رہا۔

گولن بنیادی طور پہ قوم پرست ہے، اور اس کی سوچ وفکر کا بنیادی زاویہ ترکی میں قوت و طاقت کا حصول وذاتی معاشی استحکام تھا۔ گولن وجودی فلاسفہ مارکوس، البرٹ کامو اور سارتر سے بہت زیادہ متاثر ہے۔

1980 کے بعد کمالسٹ فوج اور بیوروکریسی کی مدد سے گولن نے "خدمت" (ترکی نام:

ہیزمت) تحریک کی ابتدا کی شام کے ایک ممتاز عالم الشیخ محمد وائل الحنبلی جن کی خدمت تحریک کے سرکردہ افراد سے تقریباً دس سال قبل شام اور کویت میں ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، کے بقول خدمت تحریک کے سرکردہ افراد جب شام اور کویت میں تبلیغ کے بہانہ سے آتے تھے تو ان کا اصل مطمح نظر بڑے بڑے بزنس مینوں سے اور سرکردہ افراد سے ملاقات اور ان کو اپنے حلقۂ اثر میں لانا اور ان سے چندہ بٹورنا ہوتا تھا۔ تصوف سے وابستہ لوگوں کے سامنے یہ فتح اللہ گولن کو بہت بڑا صوفی بنا کے پیش کرتے۔ سائنٹسٹوں کے سامنے بہت بڑا اسائنٹسٹ، علماء کے سامنے بہت بڑا عالم اور حافظ الحدیث اور سیاست دانوں کے سامنے بہت بڑا سیاست دان بنا کے پیش کرتے وغیرہ وغیرہ۔

خدمت تحریک نے اپنے کام کا آغاز ترکی میں اسکولوں، اکیڈمیوں اور تربیتی مراکز کے قیام سے کیا، جن میں پہلے درجہ سے ہی انگلش تعلیم لازمی تھی۔ مرد و خواتین اساتذہ کے درمیان ناجائز تعلقات کی حوصلہ افزائی کی جاتی، نیز بارہ چودہ سال کے بچے اور بچیاں جو نوجوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ رہے ہوتے تھے کو بھی آپس میں تعلقات بنانے کی طرف راغب کیا جاتا۔ اس سسٹم آف اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے لیے ہاسٹل میں رہنا لازمی ہے، نیز سرکاری اسکولوں کے گریڈ آٹھ تک کے وہ بچے جو لائق ہوتے تھے، ان کے والدین سے ملاقاتیں کر کے ان کو یہ لالچ دیا جاتا کہ اگر آپ کے بچے ہمارے اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے، تو فوج، پولیس، عدلیہ و بیوروکریسی کے دیگر محکموں میں ان کی ملازمتیں ہماری ذمہ داری ہے۔

کچھ عرصہ بعد دیگر اسلامی و مغربی ممالک میں بھی مہنگے مخلوط اسکول بنانے شروع کیے۔

1998 میں پوپ جان پال دوئم کی دعوت پہ اس سے اور کچھ ہی عرصہ بعد صیہونیوں سے ملاقاتوں کے بعد فتح اللہ گولن نے فتوی جاری کیا کہ یہودی اور عیسائی بھی جنت میں جائیں گے،

اور قرآن مجید یا احادیث میں جنت کا جو وعدہ صرف مسلمانوں کے لیے مسلم اسکالر پیش کرتے ہیں، یہ عرب کے جاہل بدوؤں کی طرف سے قرآن میں کی گئی تحریف ہے۔ (نعوذ باللہ)

اس فتویٰ کے بعد صیہونی سرمایہ کاروں کی طرف سے گولن کو اس کی تنظیم خدمت کے لیے لاکھوں ڈالر کے عطیات دیئے گئے، جن سے اس نے ترکی اور دیگر ممالک میں اپنے اسکولز کی تعداد تین ہزار تک بڑھالی، اور پھر ان اسکولوں کی آمدن سے پہلے جرائد و رسائل، پھر ریڈیو اسٹیشنز، پھر ٹی وی و دیگر شعبوں بنکنگ، اسٹاک ایکسچینج وغیرہ میں سرمایہ کاری کی گئی۔ ترکی میں اس وقت آٹھ ٹی وی اسٹیشن فتح اللہ گولن کی ملکیت ہیں۔ ترکی کے جن ڈراموں کو پاکستان میں بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھا جاتا ہے، وہ ڈرامے گولن ٹی وی نیٹ ورک ہی کے تیار کردہ ہوتے ہیں، ان تمام کاروبارز سے 2013 تک گولن تحریک (خدمت) کی آمدن 30 بلین ڈالر سالانہ سے زائد تھی۔ امریکا میں موجود صیہونی لابی کے تعاون سے گولن نے امریکا میں 129 اسکول قائم کیے، جن کی سالانہ آمدن 400 ملین ڈالر ہے۔ پاکستان، بنگلہ دیش، و دیگر اسلامی ممالک میں خدمت نے صیہونی فنڈنگ سے سینکڑوں اسکول قائم کیے ہیں جن کا بظاہر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ٹرکش کلچر اور ٹرکش زبان کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان اسکولوں کے قیام کے لیے ٹرکش نیشنلسٹ بزنس مینوں سے بھی کروڑوں ڈالر عطیات لیے گئے ہیں، نیز امریکا میں موجود صیہونی لابی سے بھی کروڑوں ڈالر کے عطیات لیے گئے ہیں جو تجربہ وہ کامیابی سے ترکی میں کر چکے ہیں، وہی تجربہ پاکستان، بنگلہ دیش و دیگر کئی عرب و مسلم ممالک میں کرنا چاہتے ہیں کہ فوج اور سول بیوروکریسی میں ہمارے لوگ موجود ہوں۔

ترکی میں اس وقت کوئی محکمہ ایسا نہیں، جس میں گولن کی تنظیم خدمت کے افراد کلیدی عہدوں پہ موجود نہ ہوں۔

گولن نے 1980 کے جنرل کنعان ایورن کے مارشل لاء کی ظاہری بھی اور اندرون خانہ

بھی بہت زیادہ حمایت کی تھی۔ انعام کے طور پہ فوجی حکومت نے گولن کو مالی انعامات سے نوازا۔
''زمان'' اخبار جو اس سے قبل ایک چھوٹا سا علاقائی اخبار تھا دفعتاً پورے ملک کا دوسرے نمبر کا بڑا اخبار بن گیا، گولن 2013ء تک صدر رجب طیب اردگان کا بظاہر بہت بڑا حمایتی تھا، لیکن اندرون خانہ گورنمنٹ میں مختلف خفیہ اقدامات خصوصاً اعلیٰ افسران کی فون ریکارڈنگ، اور اس کے نتیجہ میں ان کو بلیک میل کرنا، جعلی آڈیو ٹیپس بنانا، اور اردگان کی پارٹی پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے کی وجہ سے اردگان نے 2013ء میں اتحاد ختم کرلیا، اور ترکی میں اس کے اثاثوں کی چھان بین شروع کردی۔

بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کے لیڈروں کو جب سزائے موت سنائی گئی تو طیب اردگان نے ان کی سخت ترین مخالفت کی، جب کہ گولن نے بنگلہ دیشی حکومت کی حمایت کی۔

غزہ میں معصوم فلسطینی بچوں اور عورتوں پہ اسرائیلی فوجیوں کے ظالمانہ و بہیمانہ اقدامات کے خلاف سب سے مضبوط آواز عالم اسلام سے طیب اردگان کی تھی، جب کہ گولن اسرائیلی اقدامات کی حمایت اور ان کو اس کا اندرونی معاملہ قرار دیتا رہا۔

غزہ کے مظلومین کے لیے 2013ء میں غذائی اجناس پہ مشتمل ایک فلوٹ بھیجا گیا، جسے اسرائیلی فوجوں نے بیچ سمندر کے روک لیا۔ پوری دنیا سے گولن کی واحد آواز اسرائیل کے حق میں اٹھی کہ انہیں امداد لیجانے سے قبل اسرائیل سے اجازت لینی چاہیے تھی۔

رجب طیب اردگان کے خلاف 2013ء میں گیزی پارک میں ہونے والے مظاہرے کی کرتا دھرتا گولن کی خدمت تحریک ہی تھی اور نوے فیصد سے زائد مظاہرین کا تعلق گولن تحریک ہی سے تھا۔

اسرائیل اور صیہونیوں سے قریبی اور مضبوط تعلقات اور ان مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر

طیب اردگان نے فیصلہ کیا کہ ہر سطح پہ گولن تحریک سے وابستہ افراد کے ملکی واسلامی مفاد کے خلاف اقدامات کو سبوتاژ کیا جائے گا، پچھلے تین سالوں میں اس سلسلہ میں کافی مؤثر اقدامات کیے گئے، اور ہزاروں گولنی افراد کو مختلف محکموں سے کان پکڑ کے باہر نکال دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں طیب اردگان کی حکومت کو فوج میں موجود اپنے حامیوں کے ذریعہ ختم کرنے اور ملک میں مارشل لاء لگانے کی کوشش کی گئی، اس بار تو اردگان اللہ کی رحمت اور عوام کی مدد سے بچ گئے ہیں، لیکن امریکی، ایرانی اور صیہونی آلہ کار مستقبل میں بھی طیب اردگان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے، اگر ان کا مکمل قلع قمع نہیں کیا جاتا۔

رجب طیب اردگان کو اب پہلے سے بھی بہت زیادہ اپنے عوام کے قریب ہونا پڑے گا اور ملکی وعوامی فلاح و بہبود کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کرنا پڑے گا۔ اللہ کریم ترکی کے غیور و بہادر مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے اور اندرونی و بیرونی دشمنوں سے ان کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

فتح اللہ گولن اور اسکی جماعت ۔ ایک مختصر سکیچ

شیخ محمد وائل الحنبلی

شام کے ایک عالم، سوشل میڈیا کی ایک معروف شخصیت محمد وائل الحنبلی کی عربی تحریر، جس کو اردو میں ڈھالا گیا ہے:

یہ میرے وہ ٹویٹ ہیں جو میں نے گولن کی جماعت سے متعلق اپنا ذاتی علم شیئر کرنے کے لیے کیے تھے:

فتح اللہ گولن کی جماعت سے متعلق میرا ذاتی علم دس سال پیچھے جاتا ہے۔ یہ لوگ دمشق میں تعلیم کے لیے آتے تھے، اوروں کی طرح ان کا بھی ہم پرتپاک استقبال کرتے۔

گولن کے لوگ دمشق میں اپنی ہی ایک مخصوص دنیا بنا کر رکھتے۔ باقیوں کے ساتھ ویسا رہن سہن نہ رکھتے۔ ایک عجیب بات دیکھنے میں یہ آئی کہ شام میں یہ بڑے بڑے تاجروں کے متلاشی رہتے، اور اثر ورسوخ رکھنے والے طبقوں کے یہاں قربت کی جستجو کرتے۔

ان کا معاملہ یوں دیکھنے میں آیا کہ یہ کسی تاجر کے پاس بیٹھتے تو کچھ ایسا تاثر دیتے کہ دین سب کا سب تجارت سے متعلق ہے۔ سیاستدان کے پاس بیٹھتے تو گویا دین سب کا سب سیاست سے متعلق ہے۔ وقس علیٰ ذلک۔

یہ لوگ احادیث و آثار کے ساتھ شغف رکھنے والی کسی علمی شخصیت سے ملتے تو کہتے: ہمارے شیخ فتح اللہ گولن کے ہاں روزانہ کتب ستہ اوران کی شروح پر درس ہوتا ہے۔

تربیت کے موضوع سے شغف رکھنے والی کسی علمی شخصیت سے ملتے تو کہتے: ہمارے شیخ فتح اللہ گولن ہر روز ابن عربی کی "فتوحات مکیہ" کا درس ارشاد فرماتے ہیں۔ غرض اسی طرح کے حربے۔

معلوم رہے، یہ میں ان کے عام طلبہ کی بات نہیں کر رہا۔ بلکہ یہ ان لوگوں کی بات ہے جو ان کی جماعت میں بڑے ذمہ داروں کی حیثیت رکھتے اور اپنے طلبہ کو وہاں باقاعدہ رہنمائی دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

تقریباً سات سال پرانی بات ہے، کویت میں علم حدیث کی ایک مجلس میں گولن کے سکول چین کا ایک ذمہ دار بھی مدعو تھا۔ مجلس میں میں نے اسے اپنا تعارف کروایا تو اس نے مجھے پہچان لیا اور خوب اپنائیت کا اظہار کیا۔ کہا اس نے ترکی ٹی وی میں میرا ایک انٹرویو دیکھ رکھا ہے۔ اس کے بعد مجلس حدیث میں اس کو گفتگو کے لیے کہا گیا۔ وہاں فتح اللہ گولن کے اس شاگرد نے اپنے شیخ کو کچھ اس طرح پیش کیا گویا وہ وقت کے کچھ عظیم حفاظِ حدیث میں آتے ہوں اور گویا علومِ سنت کے علاوہ شیخ کا کوئی شغف ہی نہیں ہے۔ جبکہ حال یہ ہے کہ جس نے بھی گولن صاحب کے دروس سن رکھے یا ان کی کتابوں کا کچھ بھی مطالعہ کر رکھا ہے، اسے اندازہ ہے کہ وہ موضوع اور جھوٹی احادیث کا پورا ایک مجموعہ ہے۔ اسی پر اس کی فکر کی پوری عمارت کھڑی ہے اور اسی کو وہ خلق خدا کو گمراہ کرنے کے کام لاتا ہے۔ میں یہ قصہ یوں ہی بیان نہیں کر رہا۔ مقصد یہ کہ ہمارے عرب

لوگ ان حضرات سے کن کن حربوں کے نتیجے میں دھوکہ کھاتے ہیں۔ تاکہ یہ لوگ ان کی بابت ہوشیار ہو جائیں۔ البتہ ان کی بابت خوفناک ترین بات میں اب شیئر کرنے لگا ہوں: پندرہ سال سے مجھے ترکی میں علمی مخطوطات اور وثائق کو دیکھنے کا موقع ملتا آرہا ہے۔

فتح اللہ گولن کی جماعت میں اعلی ڈگریوں کی حامل شخصیات کو قریب سے جانتے ہوئے مجھے معلوم ہوا، یہ لوگ استنبول میں صلیبیوں کے حقوق اور اوقاف سے متعلق تحقیقات اور ان موضوعات پر نشر وکلام سے ایک تعلق رکھتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کے لیے زور لگاتے ہیں کہ صلیبیوں کا کوئی بہت بڑا حق ترکی کے اندر غصب ہوا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ مختلف شہروں کی بلدیہ میں یہ تحریک اٹھاتے رہے کہ یہ ان 'چھنے ہوئے' صلیبی حقوق کا احیاء کریں، عین اسی طرز پر جس طرح اسلامی اوقاف کا احیاء کیا گیا ہے۔

اس پر مستزاد یہ لوگ ہر طرح کے خبط مارنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی یہ اپنی نسبت سلف سے کرتے ہیں تاکہ ''تکفیر'' پر اتھارٹی بنیں۔ اور کبھی صوفی بنتے ہیں تاکہ بعض جماعتوں کو اپنے قریب کریں۔ کسی وقت مغرب کے لیے رطب اللسان ہوتے ہیں کہ اصل ترقی، تہذیب اور آزادی تو وہاں آئی ہے۔ کسی وقت ان کا اینٹی عرب چہرہ ہوتا ہے گویا پسماندگی کا منبع یہی (عرب) ہیں، اور یہ کہ عثمانیوں کو گرانے والے بھی اصل میں عرب ہیں۔

یہ سب باتیں موقع اور مخاطب کا اندازہ کر کے مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ کس طرح یہ بعض عرب مخیر شخصیات کو شیشے میں اتارتے اور ان سے بڑی بڑی امدادیں نکلواتے ہیں۔ یہ ان کو قائل کرتے ہیں کہ اسلام ترکی کے اندر اگر بچارہ گیا ہے تو وہ ان کے شیخ گولن کے دم سے اور بس اس کی جماعت کی کوششوں سے! حالانکہ (ترکی میں) وہ کسی بھی دوسری جماعت کی طرح کی ایک جماعت ہیں۔

پھر اس سے بھی گھناؤنی صورت ان کی یوں سامنے آئی کہ پچھلے سات سال سے یہ حالیہ ترکی حکومت کی مخالفت میں اس کے ہر (برے سے برے) مخالف کا ساتھ دے رہے ہیں، خواہ وہ نیشنلسٹ ہوں یا کمیونسٹ۔ جس کے پیچھے صرف ان کا کینہ اور بغض ہے۔ یا پھر اس کے پیچھے کچھ ایسی قوتوں کا ایماء ہے جنہیں ترکی کے اندر ہونے والی حالیہ دینی ومعاشی وصنعتی ترقی تکلیف دیتی ہے اور جو کہ ترکی کے اندر پوری دنیا کو نظر آتی ہے سوائے ایک فتح اللہ گولن کی جماعت کے۔

رہ گیا ان کا عالمی سطح پر خدا کے کچھ بڑے بڑے دشمنوں کے ساتھ کھڑے ہونا، اپنے تمام تر میڈیا اور اپنے غیر معمولی تاثیر کے حامل مجلّات وجرائد اور الیکٹرونک چینلز اور ویب سائٹس کے ساتھ۔۔۔ تو یہ اظہر من الشمس ہے۔ کسی بھی تحقیق کار کے لیے اس حقیقت کا پتہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

جو کچھ کہا جا سکتا ہے اس کی جانب میں یہاں ایک اچٹتا اشارہ ہی کر پایا ہوں۔ اصل جھگڑے تو خدا کے ہاں جا کر نمٹیں گے۔ کل ترکی میں جو واقعہ پیش آیا، میرے نزدیک یہ خدا کی طرف سے ان کو گویا بے نقاب کرنے کا ایک واقعہ ہے۔

آخر میں، میرا مشورہ عالم اسلام کے اہل علم اور مخیّر حضرات کے لیے: باہر سے آنے والوں کی چکنی چپڑی باتوں میں مت آئیے، جب تک آپ اپنے یہاں کے ان لوگوں سے ان کے متعلق تحقیق نہ کر لیں جن کی معلومات (ان کے متعلق) پوری طرح قابل بھروسہ ہوں۔

فتح اللہ گولن کون ہیں؟

حامد کمال الدین

زیرِ نظر تحریر کوئی ریسرچ پیپر نہیں ہے، جس میں ایک شخص کے افکار و آراء کے حق یا مخالفت میں جانے والے دلائل کا سیر حاصل تقابل کیا گیا ہو۔ نیز اس کی سرگرمی کے متنازعہ حصوں کو پوری دقت اور تفصیل کے ساتھ سلجھایا گیا ہو۔ یہ ایک سرسری مضمون ہے جو ترکی میں حالیہ ناکام فوجی بغاوت کے پس منظر میں اٹھنے والے ایک سوال سے بحث کرتا ہے۔ یہ سوال ہے: ترک صدر رجب اردگان کی جانب سے اس بغاوت کے پیچھے متحرک اصل کردار culprit قرار دی جانے والی شخصیت سے متعلق، کہ وہ کون ہے اور اس کا فکری و سیاسی پس منظر کیا ہے؟

ایک متنازع شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا اس لیے آسان نہیں ہوتا کہ اس کے بارے میں کچھ بھی کہتے ہوئے خود آپ کو نزاع کا ایک فریق بن جانا ہوتا ہے۔ پھر بھی اس معاملہ میں آپ کچھ ایسی بنیادیں اختیار کر سکتے ہیں جن کی بابت کم سے کم نزاع ہو سکے۔ اس حوالہ سے جو نہایت سامنے کی بات ہے، وہ ہم عین شروع میں ذکر کرنا چاہیں گے:

عالم اسلام میں ''معتدل اسلام'' (Islammoderate) کی دعویدار جماعتیں اور تحریکیں اس وقت شمار سے باہر ہیں۔ بلکہ کوئی جماعت یہاں ایسی نہیں جو اپنے فہم و ترجمانیِ اسلام کو ''معتدل'' نہ کہتی ہو۔ اپنی تعبیرِ اسلام کو ''معتدل'' ثابت کرنے کی کچھ مخصوص وجوہات بھی، حالیہ عالمی تناظر میں کسی سے روپوش نہیں! لیکن 'اپنے منہ معتدل' ہونے سے اِس تیز طرار دنیا میں اگر کام چل جاتا تو بھلا رونا کیا تھا! عربی کا ایک مشہور شعر ہے: ''کل یدعی وصل بلیلی ولیلی لاتقرلہم بذاک'' ''سبھی عاشق یہاں وصلِ لیلیٰ کے دعویدار ہیں۔ مگر لیلیٰ ہے جو ان میں سے کسی ایک کی بھی توثیق نہیں فرما رہی!''۔ چنانچہ اصل مسئلہ دعوائے اعتدال نہیں بلکہ 'عالمی مصر' سے اِس دعویٰ کی توثیق پانا ہے۔ یہ فی الحقیقت جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہر مدعی کے واسطے یہ 'دار و رسن' کہاں! جناب فتح اللہ گولن وہ شخصیت ہوتے ہیں جنہیں خود مغرب ہی اپنے علمی ریفرینسز کے اندر ''قدرے معتدل'' مانتا ہے (''مکمل معتدل'' مغرب کی ڈکشنری کے اندر، ہمارے علم میں ابھی تک عالمِ اسلام کی کوئی تحریک نہیں)۔ نہ صرف 'قدرے معتدل' بلکہ عالم اسلام میں بسا غنیمت۔

فتح اللہ گولن کے تعارف میں اس بات کو ہمارے نزدیک مرکزی ترین حیثیت حاصل ہے۔ ان کے باقی مواقف اور سرگرمیوں، نیز ترکی کی اسلامی تحریکوں کے جانب سے ان کی بابت سامنے آنے والی شکایتوں اور اندیشوں کو، فتح اللہ گولن کی بابت بیان کیے گئے اِسی مرکزی نقطے کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ یہ نقطہ چھوٹ جانا جا بجا ابہامات کا موجب اور اشیاء کو 'سمجھ سے بالاتر' رکھنے کا سبب بنے گا۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں، جہاں اسلامی تحریکیں مغرب کے ساتھ اپنی تہذیبی جنگ کے انتہائی جان لیوا اور فیصلہ کن معرکے لڑ رہی ہوں وہاں مغرب کے کاغذوں میں پاس ہو کر دکھانے والی تحریکوں کے ساتھ ان کو قدم قدم پر کیسے کیسے شکوے اور مسائل پیش نہ آئیں گے! اس چیز کو سمجھنے کے لیے فی الواقع کسی ریسرچ پیپر کی ضرورت نہیں۔

مغرب سے 'معتدل' کی سند پانا کس قدر مشکل ہے؟ اس کا اندازہ آپ اس سے کر لیں کہ اخوان، نہضہ، رفاہ اور انصاف و ترقی پارٹی وغیرہ جو عالم اسلام میں جمہوریت کو بھی کھلے دل سے قبول کرتی ہیں (بلکہ مسلم ملکوں میں معیاری جمہوریت دستیاب نہ ہونے کا گلہ رکھتی ہیں) مغرب کے دیے ہوئے نیشن سٹیٹ کو بھی سر تا سر تسلیم کرتی ہیں، آئین و قانون کی بالادستی کو بھی یہاں کی کسی بھی سیاسی جماعت سے بڑھ کر مانتی ہیں، پارلیمنٹ کی مرکزیت کو بھی، نیز اپنی پوری سیاسی مہم میں ''شریعت'' کا نام تک نہیں لیتیں. یہ سب کر لینے کے باوجود 'شدت پسندی' اور 'بنیاد پرستی' سے مغربی مبصر کے یہاں ان پارٹیوں کی جان نہیں چھوٹتی! مغربی مبصر کے یہاں یہ 'ریڈیکل اسلام' کے طعنے سے ہی نوازی جاتی اور ''جہانِ نو'' کے حق میں برابر ایک خطرہ باور ہوتی ہیں! یہاں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں معتدل کی 'اصلی وحقیقی' سند اِس جہانِ نو میں کیسی ایک نایاب سوغات ہے اور اگر کسی کو آج یہ حاصل ہے تو عالم اسلام میں اس کا شمار کن خوش قسمتوں کے اندر ہے؛ اور جو کہ ''بلاوجہ'' نہیں ہو سکتا۔ جناب فتح اللہ گولن یہ اعزاز رکھنے والے سرفہرست ناموں میں آتے ہیں۔

اسی حقیقت کا ایک مظہر... جناب فتح اللہ گولن امریکی سیاسی ایلیٹ کے مسکن پنسلوانیا کے اندر چھبیس ایکڑ اراضی پر مشتمل ایک بلند فصیل کمپاؤنڈ کے اندر رہائش پذیر ہیں۔ یہ دیوہیکل کمپاؤنڈ آیا انہوں نے خود حاصل کیا یا ان کو ہدیہ ہوا، ایک ثانوی بحث ہے۔ اصل چیز امریکی ایلیٹ کے مسکن میں اس بڑے حجم اور اعزاز کے ساتھ وجود رکھنا ہے، جو اس پوسٹ نائن الیون جہاں میں کوئی معمولی بات نہیں۔ امریکا میں اسلام کے داعیوں کے ساتھ ویسے کیا کچھ ہوتا ہے، اس اعزاز کو اس تناظر میں دیکھیں تو آپ پر معاملے کی اصل تصویر کھلتی ہے۔ (آپ اس سے اندازہ کر لیں شیخ قرضاوی ایسے کھلے ذہن، جمہوریت اور مکالمۂ ادیان کے سرگرم داعی پر امریکا کے دروازے پچھلے ڈیڑھ عشرہ سے بند ہیں، کسی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے وزٹ ویزہ

تک سے انکار ہو جاتا ہے)۔ مختصراً، فتح اللہ گولن ان اسلامی داعیوں میں آتے ہیں جو اس پوسٹ نائن الیون دنیا میں اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے ہیڈکوارٹر کے طور پر عالم اسلام کی بجائے امریکا کو ہی اپنے حق میں سب سے محفوظ جگہ اور سب سے زیادہ قابل بھروسہ دوست اور پشت پناہ دیکھتے ہیں۔ اور خود امریکا بھی ان کو، اور عالم اسلام میں ان کی اصلاحی کوششوں کو، قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

ابھی تک بات ''امریکا'' سے متعلق ہوئی ہے جو عالم اسلام کی کئی ایک تحریکوں کا غیر معمولی قدردان ہے (عالم اسلام میں صرف بم برساتا نہیں پھر رہا!)۔ ہر اسلامی ملک میں آپ کو اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوگا۔ امریکا براہِ راست نہ سہی، تو یو-ایس-ایڈ سے غذا پانے والی ابلاغیات و ادبیات تو اس کا کچھ اندازہ آپ کو کروا ہی دیتی ہیں۔ گو امریکا کا براہِ راست کسی کا میزبان، اور بنفسِ نفیس اس کی خودساختہ جلاوطنی کے لیے جائے امان کے طور پر پیش ہونا اس کے سپیشل ہونے پر ایک دلیل ضرور ہے۔

البتہ فتح اللہ گولن وہ شخصیت ہیں جن کے ملک کی اسلامی تحریکیں مسئلہ کو امریکا تک نہیں رکھتیں بلکہ ان تعلقات کے تانے بانے اسرائیلی موساد تک پہنچاتی ہیں۔ بحث کرنے کو ظاہر ہے یہ ڈیبیٹ ہو سکتی ہے کہ پاکستان میں جن مقامی قوتوں پر ''بھارتی را'' سے آشیرباد پانے کے حوالے سے انگلی اٹھائی جاتی ہے اور اس کے اچٹتے شواہد بھی کچھ جلتے بجھتے دکھائی دیے جاتے ہیں، ان الزامات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ ایک معقول مطالبہ تو بہرحال یہی ہے کہ کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پہلے وہ اس کو عدالت میں ثابت کر کے دکھائے۔ ظاہر ہے عدالت میں پاکستانی سیاست کے اندر ملٹی پل باریاں لے چکے کسی ایک سیاستدان کو بھی 'کرپٹ' ثابت نہیں کیا جا سکا باوجود اس کے کہ 'کرپشن' اس قوم کا صبح شام کا رونا ہے! عین جس طرح یہاں بیرونی ایجنسیوں کے مبینہ زیر اشارہ چلنے والا مار دھاڑ کا عمل جو ملک کا اچھا خاصا ستیاناس کر چکا ہے، مگر عدالتی

ثبوت یہاں کی کسی مخصوص شخصیت یا جماعت کے حوالے سے ہر دو امر کے مفقود ہی چلے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ''ریسرچ میتھڈ الوجی'' کے تو فی الواقع یہاں ہاتھ کھڑے ہیں: یہاں نہ کوئی کرپشن کنگ ہے اور نہ امن وامان کی اس دگرگوں صورتحال میں بیرون کا کوئی ہاتھ! لہٰذا الزامات کے ثبوت کی یہ عدالتی سطح تو فی الواقع یہاں مفقود ہے۔ اور اس سطح کے یقین کے ساتھ الزامات لگانا تو فی الواقع ناممکن ہے۔ تاہم جس طرح کرپشن اور مار دھاڑ کے حوالے سے ملک میں ہر دم ڈولتی لرزتی صورتحال آپ کو عدالتی سطح سے کم کسی درجے میں ایک رائے بنانے پر مجبور کرتی ہے، کیونکہ مسئلہ آپ کے ملکی وجود اور بقاء کا ہے نہ کہ کسی ذہنی عیاشی کا، اسی طرح ترکی کی ڈولتی کشتی کو حالیہ خونخوار بیرونی واندرونی لہروں سے نکالنے کے لیے پتوار تھامے ہوئے لوگ بھی اپنی اس کشتی کو درپیش خطرات میں موساد کی جانب اشارے کرتے ہوئے فتح اللہ گولن کا کچھ ذکر خیر کر جاتے ہیں۔ تحقیق کاروں کے یہاں اس پر کچھ کہنا گو ابھی باقی ہے، عین جس طرح پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی کوششوں کے حوالے سے 'بیرونی مداخلت' کی بابت کچھ کہنا یا یہاں کرپشن کے ذمہ دار عناصر کی بابت یقین سے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

فکری وسیاسی حدودِ اربعہ:

فکری وسیاسی سٹیچر کے لحاظ سے: مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے یہاں کی دو شخصیات جناب جاوید غامدی اور جناب طاہر القادری کو جمع کر لیں تو کسی حد تک ترکی کے فتح اللہ گولن بنتے ہیں۔ مع کچھ اضافی خصوصیات، جن کے لیے کسی حد تک حسن بن صباح کی تشبیہ ذہن میں آتی ہے۔ خدانخواستہ قتل وغارت گری کے حوالے سے نہیں بلکہ انٹیلیکچولز میں اپنے فدائی تیار کرنے اور ایک کلٹ (cult) کے طور پر مقامی وعالمی سرگرمی رکھنے کے حوالے سے، جو کہ ایک باطنی نیٹ ورک کے طور پر ہر جا عمل پذیر ہے۔ یہ وجہ ہے، مخالفین کے یہاں ان کے لیے 'منظم سرطان' یا 'متوازی

ریاست' یا 'ریاست کے اندر ریاست' ایسے الفاظ رائج ہیں۔ جو کہ صرف اردگان نہیں ترکی کی ہر حکومت کے ان سے خائف ہونے کی ایک بڑی وجہ رہی ہے۔ اِس تیسرے حوالے سے، فتح اللہ گولن دورِ حاضر میں اپنی مثال آپ ہیں، پاکستان کی ان دونوں شخصیات سے ان کا موازنہ درست نہ ہوگا۔

ترکی کی حالیہ اسلامی بیداری کا مردِ میدان، یا پھر وہ شخصیت جس نے اتاترک کے اٹھائے ہوئے اندھیروں اور آندھیوں میں بھی اسلام کی قندیل بجھنے نہ دی یہاں تک کہ ان جھکڑوں کے تھمنے کے ساتھ ہی اُس ایک مشعل سے بہت سی مشعلیں جل اٹھیں، جناب بدیع الزمان سعید نورسی ہیں (تاریخ پیدائش 1877، تاریخ وفات 1960)۔ یہ ایک یگانہ روزگار عالم، صوفی، مجاہد اور متکلم تھے۔ (''صوفیت'' تو عثمانی ماحول کا ایک ترکہ سمجھیے۔ آج ترکی کی جتنی اسلامی تحریکیں ہیں ''صوفیت'' سے ہر ایک نے ہی کچھ نہ کچھ حصہ پا رکھا ہے۔ خود اربکان اور اردگان کی بابت بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ''صوفیت'' کے معاملہ میں وہ مودودی کی راہ پر ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ بھی ایک درجہ میں صوفی ہیں اور یہ بھی بدیع الزمان نورسی کا تسلسل۔ خاص اس حوالہ سے گولن اور اردگان کی فکری راہوں کا موازنہ کرنا یا ان کے راستے جدا ٹھہرانا ترکی ماحول سے ناواقفیت کی دلیل ہوگا)۔

کہا جاتا ہے سعید نورسی سے علمی وروحانی جلا پانے والا ترکی مذہبی سیکٹر اب آگے پانچ بڑے دھاروں (streams) میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا اور سب سے منظم دھارا فتح اللہ گولن کا باور کیا جاتا ہے۔ تاہم بقیہ دھاروں کے لوگ شروع سے ہی فتح اللہ گولن کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور کچھ عمومی تاثر ان میں سے بہت سوں کے یہاں ایسا رہا ہے کہ جس طرح خلافت عثمانیہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے فری میسن نے ترک معاشرے میں گہرا اتر کر کچھ دوررس کارنامے انجام دیے تھے... اسی طرح خلافت کو گرا لینے کے بعد اُس کے نظریاتی ورثاء (ترکی

کے مذہبی صوفی سیکٹر) کو ڈی ٹریک کرنے کے لیے بھی فری میسن کچھ غیر معمولی اقدامات زیر عمل لے کر آئی ہے، جن میں فتح اللہ گولن کو ایک غیر معمولی شخصیت و راہنما کے طور پر آگے کرنا بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے یہ ان کا دعویٰ یا ان کا تاثر ہے، اس کے شواہد کی تفصیل میں جانا ہمارے لیے یہاں ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فتح اللہ گولن ایک نہایت ذہین اور محنتی شخصیت ہیں۔ ترکی میں دینداری کے عمل کو 'آسان' اور 'کم لاگت' بنانے ایسے اجتہادات سامنے لانے میں ان کا موازنہ پاکستان کے جاوید احمد غامدی صاحب سے کسی قدر ہوتا ہے۔ دینی سیکٹر میں تقریباً وہ پہلی آواز ہیں جس کا کہنا تھا کہ ''شریعت'' کا نفاذ ریاست کی سطح پر خاصی حد تک ایک غیر ضروری امر ہے۔ شریعت کا بڑا حصہ انفرادی ہدایات پر مشتمل ہے لہٰذا شریعت کا معاملہ افراد ہی کے ساتھ مختص رکھنا چاہئے۔ عام دینی حلقوں میں ان کے لیے ناپسندیدگی اَسّی کی دہائی میں اُس وقت بڑھی جب حکومت کی جانب سے ''سکارف'' کے تیزی کے ساتھ مقبول ہوتے فنامنا کی مخالفت ہوئی تو فتح اللہ گولن کی طرف سے فتویٰ آیا کہ پردہ اور سکارف وغیرہ اسلام کے بنیادی مسائل میں نہیں آتے۔ خواتین کو چاہئے کہ وہ سکارف کے بغیر تعلیم گاہوں میں جائیں۔ رفتہ رفتہ، معاملہ سکارف ایسے مظاہر تک نہ رہا۔ تقریباً کوئی 'اسلامی' قید ایسی نہ رہی جو روزمرہ حیات میں ایک مسلمان مرد یا عورت کی راہ کی رکاوٹ بنے، اور وہ بھی ترکی ایسے غیر اسلامی ماحول کے اندر۔ جو چیزیں اس سے پہلے کسی مجبوری کے تحت ہو رہی تھیں وہ اب باقاعدہ 'دلیل' کے ساتھ ہونے لگیں۔ ایک ایسا ہلکا پھلکا اسلام ترکی کے اندر متعارف کرانے میں فتح اللہ گولن کو سب سے بڑا نام ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ غرض شریعت کا معاملہ 'ریاست' کی سطح پر ہی نہیں 'فرد' کی سطح پر بھی انتہائی ہلکا پھلکا کر دینا، اور وہ بھی باقاعدہ اسلامی استدلال کے پراسیس سے، اور یوں بدیع الزمان کے روحانی ورثے کو ایک ایسی راہ دکھانا جو اس سے پہلے اس پر او جھل رہی تھی اور اس کے کام کو کسی قدر دشوار کر رہی تھی، جناب گولن کا اصل فکری کارنامہ ہے۔

اس کے علاوہ کسی عالمی اسلامی وحدت ایسے تصور کو جناب فتح اللہ گولن بڑے زور سے رد کرتے ہیں۔ ترکی کے لیے عالم عرب کو اپنے ساتھ ملانے کو ایک غیر ضروری اور ضرر رساں چیز باور کرتے ہیں۔ عالم اسلام یا عالم عرب کے ساتھ یکجہتی کی بجائے وہ ''تورانی وحدت'' کا نام لیے بغیر ترکی جڑیں رکھنے والے خطوں کو ایک وحدت میں پرونے پر زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، ترکی کو چاہئے کہ ترکی جڑیں رکھنے والے وسط ایشیائی ملکوں کا ایک بلاک سامنے لے کر آئے اور کسی اسلامی بلاک کے خواب دیکھنے سے احتراز کرے۔ اردگان پر اس حوالے سے یہی ان کا ایک بڑا اعتراض ہے۔ اردگان کے غزہ کے لیے فریڈم فلوٹیلا بھیجنے کے خلاف بھی وہ بہت کھل کر بولے تھے۔ ان کا کہنا تھا یہ اسرائیل کے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑانے کے مترادف ہے۔ غزہ کے لیے کچھ کرنا ہے تو وہ اسرائیل کی اجازت کے دائرہ میں رہنا چاہئے تھا۔ تاہم یہ بات تسلیم کرنے کی ہے کہ ہماری یہاں کی المورد اور منہاج القرآن وغیرہ کے برعکس، فتح اللہ گولن کی جماعت فلسطین خصوصاً غزہ میں اسرائیلی مظالم کے خلاف آواز بہرحال اٹھاتی رہی ہے۔ البتہ اس کا کہنا ہے کہ فلسطینیوں کی یہ انسانی مدد (آٹا، ادویات اور ملبوسات وغیرہ تک بھیجنا) اسرائیلی مرضی واجازت کے تابع رہنا چاہئے اور اس معاملہ میں اسرائیل کو ناراض کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ جبکہ اردگان اس معاملہ میں اسرائیل کے خلاف شدید ترین لہجہ اختیار کر لینے تک جانے کے قائل ہیں۔ گولن کا نقطہ نظر اس کے مقابلے پر یہ ہے کہ عربوں یا فلسطینیوں کی خاطر ترکوں کو یہودیوں اور مغربی قوتوں کے ساتھ بگاڑنے کی کیا ضرورت؟ اس کے مقابلے پر فارسی وعبرانی چیرہ دستیوں کے آگے عربوں کو ان کے حال پر چھوڑ رکھنے کی قیمت ترکی کو یہ لینی چاہئے کہ ایک تورانی بلاک کا روحِ رواں بننے کے بھرپور مواقع حاصل کیے جائیں۔

ترکی کے کئی اسلامی حلقے فتح اللہ گولن کی جماعت کو ترکی قومیت (نیشنلزم) کا غیر معمولی پرچارک دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، گولن کا عالمی تعلیمی نیٹ ورک اپنے زیر انتظام سکولوں میں

جاتے رہے ہیں اور اسلامی آپشن کو سپورٹ کرنے میں اپنا پورا زور صرف کردیتے رہے ہیں۔ سوائے فتح اللہ گولن کی جماعت کے جو اسلامی آپشن کو شکست دینے اور ملک میں اس کو بے اعتبار بنا رکھنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیتی رہی ہے۔ (اردگان کی سپورٹ محض ایک استثناء ہے، اس پر ہم ذرا آگے چل کر بات کریں گے)۔

فتح اللہ گولن عالم اسلام کی ان ابتدائی شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے تقارب ادیان کی داغ بیل ڈالی۔ بقول اسماعیل پاشا: یہ 1998 میں پوپ جان پال دوم کی زیارت کو ویٹی کن تشریف لے کر گئے۔ نیز ایک عالمی شہرت کی یہودی شخصیت ابراہام فوکس مین اور کچھ دیگر مذہبی شخصیات کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع فرما کر آئے۔ اس کے بعد پھر عالم اسلام میں یہ سلسلہ چل نکلا۔

مابین رجب اردگان و فتح اللہ گولن:

پیچھے ہم ذکر کر آئے کہ فتح اللہ گولن ہمیشہ سے ہی ترکی سیاست میں اسلامی جماعتوں کے مخالف کیمپ کے اندر اپنا وزن ڈالتے اور مغربی اسٹیبلشمنٹ میں اس کو اپنی نیک نامی کا ایک ذریعہ بناتے رہے ہیں۔ تاہم اردگان کے ساتھ ان کی قربت ایک استثناء کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ حیرت انگیز واقعہ کیسے ہوا؟ اس پر بات کرنے سے پہلے ہم گولن نیٹ ورک جو "خدمت" موومنٹ کے نام سے ترکی میں معروف ہے، کی بابت چند باتیں ذکر کریں گے: جیسا کہ پیچھے بیان ہوا، "خدمت" موومنٹ کو متوازی ریاست کا نام دیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں "ریاست کے اندر ریاست" کی یہ ایک قابلِ ذکر مثال ہے۔ اشرافیہ میں جڑیں بنانا اور ان کے ذریعے ریاست کے مؤثر شعبوں میں بہت اوپر تک جانا، جبکہ ان افراد کی وفاداریاں ریاست سے زیادہ جماعت کی قیادت کے ساتھ ہی وابستہ رہیں، اور جس کے اندر ایک کلٹ ذہنیت (mentality cult) کا بدرجۂ اتم استعمال کیا گیا ہو، گولن رفاہی نیٹ ورک کا ایک مخصوص طریقہ رہا ہے۔ قریب سے دیکھنے والے اس کے طریق عمل کو اکثر فری میسن کے طریق

عمل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آدمی کو درجہ بدرجہ اپنے نیٹ ورک میں اوپر لے جایا جاتا ہے اور 'قیادت' کے ساتھ اس کی وفاداری دنیا کی ہر وفاداری سے بالاتر کروا دی جاتی ہے۔ حکومتوں کا ایسے کسی نیٹ ورک سے خائف یا متنبہ ہونا طبعی امر ہے۔ اس نیٹ ورک نے ترکی فوج، پولیس، عدلیہ، بیوروکریسی اور تعلیم ورائے سازی کے شعبوں میں حیرت انگیز حد تک قدم جمائے ہیں، اور یہ بات ترکی کے حالات سے باخبر ہر شخص جانتا ہے۔ کسی بھی شعبے میں جماعت کی ناپسندیدہ شخصیت کو ناکام اور زچ کر کے رکھ دینا نیٹ ورک کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے۔ بڑے بڑے اس سے ٹکر لینے سے کتراتے اور اس کے ساتھ بنا کر رکھنا عقلمندی باور کرتے ہیں۔ قوت اور تاثیر کے تمام عوامل کو ایک غیر رسمی انداز میں اپنے دھارے کے اندر لانا اور اپنی مٹھی میں کرنا اس نیٹ ورک کی ایک بڑی ترجیح ہوتا ہے۔

ایک تو یہ بات تھی جو فتح اللہ گولن کو اردگان کی صورت میں ایک نئی ابھرتی ہوئی قیادت کو اپنے ''ارادت مندوں'' میں جگہ دینے پر راغب کر گئی۔ یعنی تعلیم، فوج اور بیوروکریسی کے بعد اب سیاست میں بھی اپنے مہرے لے کر آنا۔

دوسرا، نوجوان اردگان کا گولن کے مسلمہ حریف اربکان سے اپنے راستے الگ کر لینا بلکہ بظاہر اربکان سے بغاوت کر آنا بھی فتح اللہ گولن کی اردگان میں ایک خصوصی دلچسپی کا باعث بنا۔ اردگان کا اربکان سے علیحدہ ہونا اور اسلامی حوالے سے بھی اربکان کی نسبت ایک واجبی سا انداز اختیار کرنا عملاً ایک بہت بڑی 'ٹرکی' تھی۔ چونکہ اردگان کا رخ اربکان کی نسبت ایک خاصے 'غیر اسلامی' چہرے کے ساتھ سیاست میں آنے کی طرف تھا... لہٰذا اس سے بھی گولن کو یہ ترغیب ہوئی کہ ترکی میں اربکان کے 'پولیٹیکل اسلام' کے راستے مسدود کر دینے اور جماعت کے ایک بڑے حصے کو (پولیٹیکل اسلام کی) یہ راہ چھڑوا دینے کی کچھ کامیاب صورتیں ہاتھ آ سکتی ہیں!

مختصراً، اردگان کے ذریعے اپنی 'متوازی ریاست' کو بامِ عروج تک پہنچانا اور اربکان کی

چلائی ہوئی 'سیاسی اسلام' کی راہ سے اسلام پسندوں کے ایک بڑے حصے کو برگشتہ بھی کر ڈالنا، جس پر آخر میں مغرب کو گولن کا شکر گزار ہونا تھا، مگر ہوا یوں کہ بظاہر سادگی سے استعمال ہونے والا، ہوشیاری سے استعمال کرنے والے کو، بڑے غیر محسوس طریقے سے استعمال کر گیا!!!

حق یہ ہے، گولن کے علیحدگی اختیار کرنے سے پہلے ہی اردگان انتظامیہ نے ''خدمت'' نیٹ ورک پر گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا، مگر خاصے اصولی طریقے سے۔ استادِ محترم کے ساتھ ایک بے نیازی والا معاملہ ہونے لگا تھا۔ ملک کے پورے تعلیمی نظام کو ایک کرنے اور اشرافیہ کے لیے بننے والے خصوصی اسکولوں کو ختم کرنے سے متعلق اردگان کے حکومتی اقدامات سامنے آنے لگے تو ''خدمت'' موومنٹ اردگان کی اس حرکت کو دیکھتی رہ گئی۔ جبکہ ''خدمت'' نیٹ ورک کے اسکول تو تھے ہی اشرافیہ کے لیے بنائے گئے اسکول جو بیک وقت کمائی بھی تھی اور اشرافیہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا ایک اہم ذریعہ بھی۔ اس موقع پر گولن کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا دیکھا گیا اور میڈیا نے صفائے نفس کے داعی ایک صوفی بزرگ کو جماعتِ اردگان کے خلاف بددعائیں کرتے سنا: 'ان کا خانہ خراب، خدا کرے ان کے گھروں کو آگ لگے'! شاید یہ بیداری کی حالت کا ایک کشف تھا جس کی تاب نہ لائی جا سکی: ایک طفلِ مکتب بزرگِ جہاندیدہ کے ساتھ ہاتھ کر گیا۔ 'پولیٹیکل اسلام' تھوڑی راہ بدل کر اور کچھ ناقابلِ تسخیر سا ہو کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا!

اردگان کے ساتھ گولن کی قربت اور جدائی کی داستان دیکھیں تو آپ کو فاطمی (فی الحقیقت باطنی عبیدی) حکمران ''العاضد'' کا واقعہ یاد آ جاتا ہے جب اس نے اسد الدین شیرکوہ اور بعد ازاں اس کے ہونہار بھتیجے صلاح الدین (ایوبی) کو عباسی خلیفہ کے وفادار شام کے سلطان نورالدین زنگی سے برگشتہ کرنے کے لیے مصر میں اپنا وزیر اعظم بننے کی پیش کش کر ڈالی تھی۔ البتہ اس ''وزیر اعظم'' نے کچھ ہی عرصہ میں عوام کے اندر اپنی جڑیں بنا لینے کے بعد ''العاضد'' کو فارغ

کیا اور ایک دو سو سالہ تعطل کے بعد مصر کو عباسی خلافت کی قلمرو میں واپس کروالیا! (جس سے صلیبیوں کے خلاف عالم اسلام کا ایک بڑا محاذ تشکیل پایا، جو بعد ازاں بیت المقدس کی فتح کی بنیاد بنا)۔

ہمارے ترک دوست بتاتے ہیں، پچھلے چند سالوں میں ترکی کے اندر ''متوازی ریاست'' کو اچھا خاصا ہلکا پھلکا کر دیا گیا ہے۔ اِس بار مقابلے پر بھی باقاعدہ ایک تحریک ہے جس کے پاس باصلاحیت افراد کی کمی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے ''متوازی ریاست'' کے پاؤں تلے سے زمین جس تیزی کے ساتھ سرک رہی تھی، 'ابھی یا کبھی نہیں' کا موقع بڑی دیر سے آن پہنچا تھا۔ دسمبر 2013ء میں بھی ایک ناکام کوشش ہوئی، مگر اس کا درجۂ تمام اب تھا۔ لیکن شاید یہ اپنی موت کو صاف صاف دعوت تھی۔ حالیہ بغاوت کی ناکامی نے ترکی کی تاریخ پر اور بہت پہلوؤں سے دُور رس اثرات چھوڑے۔ ان میں ایک شاید یہ بھی ہوگا کہ 'متوازی ریاست' ترکی میں ایک قصۂ پارینہ بن جائے۔ صفائی کا ایک بڑا عمل یقیناً عمل میں آچکا ہے۔ اِس بات کے شواہد پائے گئے ہیں کہ اردگان صاحب ''منظم سرطان'' کی کمر توڑ دینے کے لیے اس موقع کو کئی ایک انداز سے استعمال کریں گے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اِس عمل میں انصاف کے دائرہ سے باہر نہ نکلیں۔

یہ کہنا تو ابھی مشکل ہے کہ مدہم رفتار سے 'اسلام' کی جانب بڑھنے والا ترکی اس واقعہ کے بعد خطرات سے باہر آ گیا ہے۔ ایسا سمجھ لینا شاید اسلام کے دشمنوں اور بدخواہوں کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہو۔ البتہ یہ بات قدرے آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ حالیہ بغاوت کی ناکامی کے بعد ترکی کے اسلامی مستقبل کے خلاف کوئی بڑا اقدام اٹھانے کے لیے عالمی قوتوں کو خاصا برہنہ ہو کر سامنے آنا ہوگا۔

آپ کو یاد ہوگا، کوئی عشرہ پیشتر رینڈ کارپوریشن کی جانب سے امریکی پالیسی سازوں کے

لیے عالم اسلام کے حوالہ سے مشہورِ عام سفارشات آئی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ کہ: ''جہاد'' اور ''پولیٹیکل اسلام'' کے خطرے سے نمٹنے کے لیے مسلم دنیا میں امریکا کے جو کوئی طبعی حلیف ہو سکتے ہیں ان میں ''صوفی اسلام'' پر خصوصی دستِ شفقت رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یاد ہے امریکا تا مشرقِ بعید 'رقصِ رومی' کی پھر کی گھوم اٹھی تھی۔ نزار قبانی، حمزہ یوسف اور نوح حامیم کیلر وغیرہ پر وائٹ ہاؤس کے دروازے وا ہو گئے۔ بھارت میں صوفیہ کانفرنسوں کے میلے لگنے لگے جن کا مرکزی نقطہ عالم اسلام میں مغرب کو چبھنے والے عناصر کو اسلام سے عاق ٹھہرانا تھا۔ شام میں امریکی آشیر باد یافتہ صوفیہ کا گڑھ دیکھتے ہی دیکھتے مرجعِ خلائق بننے لگا (ہمیں یاد ہے ایک 'غیر مرئی' نیٹ ورک امریکی نومسلم جوانوں کو ابتدائی پراسیسنگ کے بعد 'سیریا' روانہ کیا کرتا تھا، جہاں سے وہ نوجوان ایسی برین واشنگ کروا کر آتا کہ لوگ اس کے ساتھ بات چیت کرنا وقت کا ضیاع جانتے)۔ پاکستان سے طاہر القادری صاحب کے لیے 'مواقع' نے اپنے منہ کھول دیے اور اردو بولنے والی دنیا کے لیے ان کی قوالی شمالی امریکا تا یورپ تا شام تا ہندوستان ہونے لگی۔ آپ نوٹ کریں گے، طاہر القادری صاحب پر یہود و نصاریٰ کے لیے خصوصی قربت و اپنائیت (عالمی تحریکِ تقاربِ ادیان کی ترویج) پر مبنی کچھ غیر معمولی لہجے نائن الیون کے کہیں بعد جا کر طاری ہوئے۔ ایسا ہی معاملہ کچھ دیگر خطوں کے صوفیہ کے ساتھ رہا۔ یہ سست لوگ تھے جو بہت بعد میں جاگے اور قافلے کے اندر شامل 'ہوئے' نہیں بلکہ 'کیے' گئے۔ البتہ فتح اللہ گولن، نزار قبانی ایسے اُن بیدار مغزوں میں آتے ہیں جن کے دستِ ہنر نے یہ سب قافلہ تشکیل دیا۔ یہ باصلاحیت لوگ نائن الیون سے بہت پہلے عالم اسلام کے اندر اپنے 'فرائض' سے آگاہ تھے۔ ان کے ''اجتہادات'' سن اَسّی اور نوے کے عشرے سے ہی سامنے آنے اور ''پولیٹیکل اسلام'' کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے تھے۔

(صوفیہ کا بڑا طبقہ بلاشبہ اسلام کا سچا محافظ اور استعمار کو للکارنے والے جہاد اور پولیٹیکل

اسلام کا روحِ رواں رہا ہے، یہ بات ہم پر نہایت واضح ہے۔ یہاں بات صوفیہ کے اس طبقہ کی ہو رہی ہے جو خانقاہی نظام کا غلط استعمال کرتا آ رہا ہے، اور ایسے لوگ ہر طبقے میں ہیں۔ قاری ہماری کسی بات سے عام صوفیہ سے متعلق کوئی رائے نہ بنائے)۔

فتح اللہ گولن کی تحریک عالم اسلام کی ان معدودے چند تحریکات میں سے ہیں جن سے ہمارے ہندوستان کے ایک بزرگ وحیدالدین خان ٹھنڈی ہوائیں پاتے رہے ہیں۔ وحیدالدین خان صاحب اپنی پسند و اطمینان کے معاملہ میں اسلامی تحریکوں کی بابت جس قدر سیلیکٹو (selective) ہیں وہ افکار کی دنیا سے شغف رکھنے والے اکثر لوگوں پر واضح ہے۔ فتح اللہ گولن کی بابت آپ اگر اور کچھ بھی نہیں جانتے تو اسی ایک بات سے گولن کی خوش قسمتی اور عالم اسلام میں ان کے کردار کی اہمیت کا اچھا خاصا اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ نظر یہ آتا ہے، حالیہ واقعہ کے بعد فتح اللہ گولن کا یہ کردار اچھا خاصا سکڑ جائے گا۔

ما لکم! کیف تحکمون؟

محمد الفیصل، حبیب خان

مزاحمت کی بے رحم موجوں سے دائم لڑکر، کئی دہائیوں کی جد جہد سے اردگان ترکی کو اس مقام پر لاکر سرخ رو ہوئے۔ دشمنوں کا انبوہ اور بدخواہوں کا ریوڑ ہر دم یلغار کرنے پر آمادہ۔ حزم واحتیاط اور حکمت وتدبر کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف گامزن اردگان پر کتنی بار بیچ راہ میں شب خون مارا گیا۔ مگر وہ عزم کی ناقابل تسخیر چٹان بنے رہے۔ اگلی بار نئے حوصلے سے جاگتے اور ترکی کو اٹھان دیتے رہے۔

قربانیوں کا تھکا دینے والا ماضی، ہمت وثبات کا حال اور روشن مستقبل، خیرہ امکانات رکھنے والا مستقبل۔ اس تکون کے ساتھ وہ ترکی کے تاریخ کا لافانی جز بن گئے۔

اردگان نے ترکی ہی نہیں اطراف عالم میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کا درد اپنا درد سمجھا اور عملا انہیں اپنی پالیسیوں سے باور بھی کرایا۔ اس بار اس پر شب خون مارا گیا تو پوری مسلم دنیا اس کی پشت بان بنی۔

بھلا شب خون مارنے والوں کے ساتھ اب کی بار نرمی برتنے کا آخر کوئی جواز باقی بچا بھی؟
میرے ان دوستوں کو کیا ہوگیا جو ظلم وتعدی کا رونا رو رہے ہیں اور ترکی کے اس مسیحا پر جذباتیت کی پھبتیاں کس رہے ہیں؟ مالکم کیف تحکمون؟
سادہ لوحی کی انتہاء ہے اور ناطقہ سر بہ گریباں۔ایک کالم نگار گولن کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں، اس نے اردگان کی سخت گیری کا شکوہ کیا تو حمایتی برساتی مینڈکوں کی طرح اس کی تائید میں پوسٹ لڑھکانے لگے۔کیا یہ خدا کے بندے اپنی عقل کو بروے کار لانے کی بجائے دائم دوسروں کی سوچ مستعار لیتے رہیں گے اور انہی کی رائے کی جگالی کرتے رہیں گے؟

ترکی کا مختصر تفریحی سفر اور اس کی روداد

عظیم الرحمن عثمانی

الحمدللہ ۔۔ ترکی میں سات روز کی تعطیل گزار کر گزشتہ رات انگلینڈ واپسی ہوگئی۔ لکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ تفصیل سے لکھوں تو شائد ایک مختصر سفرنامہ بن جائے مگر اتنا لکھنے کا نہ ارادہ ہے نہ ہمت۔ البتہ یہ لکھنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ میری اب تک کی زندگی کا سب سے پرسکون اور یادگار سفر رہا ہے۔ مجھے دور یا نزدیک سے جاننے والوں کو بجا طور پر مجھ سے یہ امید ہوا کرتی ہے کہ میں ان جگہوں پر جانا ہی پسند کرتا ہوں گا جہاں تاریخ یا فلسفے کا سامان ہو یا پھر چکا چوند کردینے والی تعمیرات ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے نزدیک مثالی و من پسند جگہیں وہ ہیں جہاں اردگرد قدرت کے فطری مظاہر ہوں، جو شہر کی مصنوعیت سے دور ہوں، جہاں لوگ سادہ مزاج ہوں، جہاں ہریالی ہو، جہاں شفاف سمندر ہو، جہاں ٹھیلوں سے سجے بازار ہوں، جہاں چائے قہوے کے ڈھابے ہوں۔ یہی کچھ ذہن میں سجا کر میں ترکی کے ایک ایسے ہی علاقہ میں مقیم تھا جسے

انطالیہ کہا جاتا ہے۔ گو میرا قیام ایک خوبصورت فائیو اسٹار ریسورنٹ میں تھا جو سوئمنگ پول، جکوزی، شفاف ترین نیلے ساحل سمندر، ان گنت پکوان، انواع واقسام کے مشروب، آرام دہ کمروں جیسی بیشمار سہولیات سے لبریز تھا۔ مگر ہوٹل سے باہر کا علاقہ نہایت سادہ اور فطرت کے سحر انگیز مظاہر سے مزین نظر آتا تھا۔ ترکی واقعی ایک ایسا ملک ہے جو مجموعہ اضداد ہے۔ جو ایک طرف عظیم اسلامی تاریخ سے مالا مال ہے تو دوسری طرف رومن امپائر کے باقیات کو پوری شان سے سموئے ہوئے ہے۔ جو ایک جانب مغرب کی فحش روایات کو خود میں جگہ دیے ہوئے ہے تو دوسری جانب اسلام کی شرم وحیاء کا بھی پوری شدت سے معترف ہے۔ جہاں ایک طرف یورپی بننے کے جنون میں ہر حد پھلانگ لینے کی خواہش ہے تو دوسری طرف فرد و معاشرے میں احیاء اسلام کی بھرپور تمنا ہے۔ جہاں ایک جانب فلک بوس حسین عمارتیں ہیں تو دوسری جانب گاؤں کی پرسکون زندگی بھی دھیمے سے مسکرا رہی ہے۔ جہاں ایک طرف آئینے کی مانند بے شمار شفاف جھرنے اور سمندر ہیں تو دوسری طرف ایسی ایسی جدید سہولیات میسر ہے جنہیں دیکھ کر جنت کا گمان ہو۔ جہاں ایک جانب ہوٹلوں سے میوزک کا شور نکل رہا ہے تو دوسری جانب مساجد سے اذانوں کی دل نشین آواز بھی گونج رہی ہے۔ جہاں ایک طرف ہر پکوان حلال ہے وہاں شراب کی دکانیں بھی عام کھلی ہوئی ہیں۔ (یہ اور بات کہ انگلینڈ کی طرح مجھے ایک بھی شخص شراب کے نشے میں دھت نہیں نظر آیا) گویا اگر میں غالب کے اس مصرعہ "بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے" کو ترکی کے تناظر میں پیش کروں تو کچھ ایسی صورت ہو کہ "مجموعہ اضداد ہے ترکی میرے آگے"۔ دھیان رہے کہ راقم نے اب تک استنبول یا انقرہ جیسے نمائندہ شہروں کا سفر نہیں کیا ہے بلکہ اس کا سفر انطالیہ، الانیہ، ایوسلار، انسیکم اور پاموکالے تک محدود رہا ہے۔

ترکی کے بارے میں ایک اور نہایت فرحت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی عوام بڑی تعداد میں

پاکستانی عوام سے محبت کرتی ہے۔ میرے دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ میرے وطن پاکستان کو ایسی ہی عزت دنیا کے تمام ممالک میں عطا کرے جیسی عزت اسے ترکی کی عوام میں حاصل ہے۔ مجھے جانے سے پہلے کئی لوگوں نے یہ نصیحت کی تھی کہ خود کو برٹش مت بتانا بلکہ پاکستانی کہنا۔ جیسے ایک امریکی عزیز نے مجھے اپنا واقعہ بتایا کہ جب تک وہ خود کو امریکی کہتا رہا لوگ اس سے واجبی سا سلوک کرتے رہے، لیکن جیسے ہی اس نے کسی کے کہنے پر خود کو پاکستانی بتایا تو ہر کوئی مدد کے لیے سبقت لینے لگا۔ یہی معاملہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ اکثر دکانداروں کو جب معلوم ہوتا کہ میں پاکستانی ہوں تو وہ نہایت خوش ہو کر اشارے سے سمجھاتے کہ "ترکی پاکستانی برادر"۔ حیرت انگیز طور پر میرے لیے قیمتیں کم کر دیا کرتے اور کئی لوگوں نے مجھے صرف اس لیے مفت تحفے دیے کہ میں پاکستانی ہوں۔ آپ اگر میری اس بات پر یقین نہ کریں تو میں سمجھ سکتا ہوں کیونکہ اگر مجھ پر نہ بیتی ہوتی تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔ ترکی کے لوگ اپنے وطن سے شدید محبت کرتے ہیں۔ امریکا کے بعد یہ دوسرا ایسا ملک ہے جہاں میں نے کثیر تعداد میں ملک کے جھنڈے لگے دیکھے اور لوگوں کو قومی ترانوں پر جذباتی ہوتے محسوس کیا۔ ترکی میں یورو کرنسی بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی ان کی اپنی کرنسی لیرا۔ معلوم نہیں کہ میرا یہ احساس کتنا درست ہے؟ مگر مجھے بہت سے لوگوں میں رینگنے والے جانوروں سے رغبت نظر آئی۔ جیسے ایک ترک عورت اچانک مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا پاکستان میں کوبرا سانپ ہوتے ہیں؟ پھر اپنے ہاں پائے جانے والے سانپ کی اقسام بتانے لگی۔ اسی طرح کئی دکانوں پر چھپکلی کے ربر والے کھلونے نظر آئے، اسی طرح مجھے کم از کم تین لوگوں کے پاس ایک بڑی چھپکلی جسے شائد اردو زبان میں "گوہ" کہتے ہیں پلی ہوئی نظر آئی جسے وہ ہاتھ میں لے کر سہلاتے رہتے۔ ایک کے ساتھ میں نے تصویر بھی کھنچوائی۔ ترک لوگ اپنی زبان ہی میں بات کرتے ہیں اور مجھے بہت کم لوگ ایسے ملے جو انگریزی بول سکتے ہوں۔ ترکی

کے عوام صحیح معنوں میں صفائی پسند ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان جگہوں پر بھی کچرا نہیں پھینکتے جہاں حکومت کی جانب سے بھی کوئی اہتمام نہ کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے مجھے ترک عوام برطانوی عوام سے زیادہ صفائی پسند معلوم ہوئے۔ ہر کام نہایت مستعدی اور منظم انداز میں انجام دیا جاتا ہے مگر خوبصورتی یہ ہے کہ یہ نظام مغربی ممالک کی طرح پیچیدہ نہیں بلکہ بہت سادہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے بمشکل تمام صرف ایک جگہ کچھ کاغذات پر دستخط کرنے پڑے ورنہ ہر جگہ بس مرحلہ وار کام انجام دے دیا جاتا۔ اس آسان نظام نے مجھے موجودہ مدینہ کی یاد دلائی۔

میرے ترکی پہنچنے کے فوری بعد ہی وہ حالیہ تاریخی واقعہ ہوا جس میں فوج کے ایک باغی گروہ نے اردگان کی حکومت الٹنے کی ناکام کوشش کی۔ عوام نے جس مثالی انداز میں اس کوشش کو ناکام بنایا اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ ترک عوام اس وقت دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو مغرب کے رنگ میں پوری طرح رنگ کر یورپی کہلانے کا متمنی ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو یورپی بننا تو چاہتا ہے مگر اپنے اسلامی تشخص کو قائم رکھ کر۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترکی کی عوام میں اسلام سے قربت بڑھ رہی ہے اور اب ان کا مجموعی شعور ایک بار پھر اسی رفعت کا متمنی ہے جو کبھی خلافت عثمانیہ کی صورت میں ان کا خاصہ تھی۔ میں پوری دیانتداری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترک عوام نے میرے دل کو اپنے اخلاق سے جیت لیا ہے۔ ایسے اخلاق جو برصغیر پاک و ہند میں عوامی سطح پر مفقود ہیں اور جن کا عکس مجھے عرب ممالک میں بالکل نظر نہیں آیا۔ چار ایسے مواقع آئے جو مجھے اپنے اس مختصر سفر میں سب سے زیادہ دل نشین لگے۔ پہلا موقع جب میں نے زندگی میں پہلی بار سمندر کے بیچ "اسکوبا ڈائیونگ" یعنی غوطہ زنی کی اور سمندر کی گہرائی میں موجود مخلوقات کو دیکھا۔ دوسرا موقع جب ایک قزاقی انداز کے نہایت خوبصورت جہاز میں پانچ گھنٹے ہمیں سمندر سے گزارا گیا جہاں میں نے دو رنگ کے پانیوں کو جدا جدا دیکھا اور دونوں

پانیوں میں سے گزرا۔قران مجید کی اس آیت کو یاد کیا جس میں دو پانیوں کو جدا کرنے کا ذکر ہے۔ لوگوں کو پہاڑوں پر چڑھ کر سمندر میں چھلانگیں لگاتے دیکھا۔تیسرا موقع پاموکالے کا وہ ہوشربا پہاڑی مقام جس کے معنی ترکی زبان میں ''روئی کا محل'' ہیں۔ جہاں کاربونیٹ سمندری معدنیات کے سفید پہاڑ قدرتی زینوں کے ساتھ موجود ہیں اور جہاں قدم قدم پر ان ہی معدنیات سے بھرپور چھوٹے چھوٹے گرم پانی کے تالاب ہیں۔ بہت امکان ہے کہ آپ نے اس ناقابل یقین مقام کو انگریزی یا ہندی فلموں میں دیکھ رکھا ہو۔اور چوتھا موقع ''ہاریہ پولس'' رومی سلطنت کا وہ تاریخی پر ہیبت پنڈال جہاں پندرہ ہزار عوام کے لیے گلیڈ یٹرز کے مقابلے کروائے جاتے تھے۔ لکھنے کو بہت کچھ ہے مگر تحریر اختصار کی کوشش کے باوجود طویل ہو چکی لہٰذا اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

سعودی مفتی اعظم اور اردگان کی جماعت

ترجمہ از کتاب الشیخ عبداللہ القعود

سابق مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کا موجودہ ترکی صدر اردگان اور ان کی جماعت کے حوالے سے دلچسپ واقعہ۔

شیخ عبداللہ القعود کہتے ہیں کہ ایک دن عصر کی نماز کے بعد مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز کا فون آیا اور کہا کہ ایک ضروری کام کی وجہ سے آپ کو بلانا پڑ رہا ہے۔ میں گاڑی میں سوار ہوا اور سیدھا شیخ کے گھر پہنچا۔ راستے میں یہی سوچتا رہا کہ اللہ خیر کرے، کون سا ایسا ضروری کام ہوگا کہ شیخ نے مجھے خود فون کر کے بلایا۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو مفتی اعظم میرے انتظار میں تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا، انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ پاکستان جانے کے لیے آپ کا ٹکٹ بک ہو چکا ہے، آپ سفر کی تیاری کیجئے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ خطاب (لفافہ میں بند خط) صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق مرحوم تک بذات خود پہنچائیں۔ پھر اس خط

کے حوالے سے مختصر بات کی، بہر حال میں نہ چاہتے ہوئے (بہت مصروفیت کی وجہ سے) بھی تیار ہوا۔

میں سفر کی تیاری کرنے لگا اور یوں پاکستان کی طرف محوسفر ہوا۔ اسلام آباد ائیر پورٹ پہنچا تو سعودی ایمبیسی کے اہلکار میرے انتظار میں تھے، وہاں سے ہم سیدھا ایوان صدر جنرل ضیاء الحق سے ملنے گئے۔ (جہاں پر ہماری ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی)

جنرل ضیاء الحق نے بڑے گرم جوشی سے استقبال کیا اور پھر ہم ان کے ساتھ بیٹھے طویل ملاقات کی اور لفافے میں خط ان کے سپرد کیا۔ خط دیکھنے کے بعد صرف یہ کہا کہ شیخ کو سلام کہنا اور یہ پیغام دے دینا کہ ان شاء اللہ ان شاء اللہ ضرور کوشش کروں گا اور عنقریب کوئی خوشی کی خبر ہی انہیں ملے گی۔

شیخ عبداللہ القعود کہتے ہیں کہ مجھ سے مفتی اعظم نے کہا تھا کہ اس خط میں ترکی کے نجم الدین اربکان کی جیل سے رہائی کی سفارش تھی۔

(نجم الدین اربکان جسے اس وقت کے ڈکٹیٹر ظالم جنرل کنعان ایورین نے صرف اس وجہ سے جیل میں بند کر دیا تھا کہ یہ ایک اسلامی سوچ کی حامل شخصیت تھی۔)

شیخ عبداللہ سے کسی نے پوچھا کہ جنرل ضیاء الحق کا اس موضوع سے کیا تعلق تھا کہ مفتی اعظم نے ان کے نام سفارش کا خط بھیج دیا تھا۔ تو کہنے لگے کہ جنرل ضیاء الحق اور جنرل کنعان ایک دوسرے کے بہت پرانے دوست تھے تو مفتی اعظم نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے یہ قدم اٹھایا۔ پھر اس سفارش ہی کا اثر تھا کہ کچھ ہی دنوں میں نجم الدین اربکان کو رہائی ملی اور انہوں نے رہا ہونے کے بعد ایک اسلامی جماعت کی بنیاد رکھی اور ترکی میں اسلامی تحریک کی بنیاد رکھی۔

یہی وہ جماعت تھی کہ جس سے آج رجب طیب اردگان پیدا ہوئے اور وہ آج ترکی میں

برسر اقتدار ہیں۔ اللہ تعالی مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کے قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے کہ جنہوں نے ترکی اسلامسٹ حکومت بننے میں اپنا عظیم کردار ادا کیا جس کی وجہ سے آج ترکی میں اسلام کا بول بالا ہے۔

اردگان کا ترکی!

محمد الکوہستانی

انقرہ کی سڑکوں پر عجیب عید کا سا سماں ہے، عوام قومی پرچم لیے سڑکوں پر نکل آئے ہیں، ناکام انقلاب کے خلاف اور حکومت کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں، ترک ناداں نے قبائے خلافت چاک کر کے اسلام کو یہاں کے کوہ دمن سے کھرچ کھرچ کر دیس نکالا دیا تھا۔ عربی رسم الخط، قرآن کریم کی اشاعت، خواتین کے سکارف حتیٰ کہ پانچ وقت مسجد کے میناروں سے خالق کائنات کی کبریائی کے اعلان تک پر قدغن لگائی تھی؛ اور بزعم خویش یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اب ترکی کے در و دیوار اسلام سے نا آشنا ہو جائیں گے، اب یہاں ایمان کی کوئی کونپل پھوٹ پائے گی نہ کوئی کلی کھل سکے گی؛ آئندہ کے لیے کسی ترکش کو ایمان روک نہ پائے گا، بلکہ کفر ہی کھینچے گا، کعبہ دور دور تک نہیں ہوگا البتہ کلیسا ہر جگہ میسر، لیکن الحمد للہ آج اسی ترکی کا چپہ چپہ گلی گلی کوچہ کوچہ بسم اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، کے مستانہ زمزموں سے گونج رہا ہے، عوام کا خوش جذبہ بتا رہا ہے کہ اب

"عزیز ہم وطنو" کی دال گلے گی نہ کوئی طالع آزما اپنے عزائم میں کامیاب ہو سکے گا! یہ منظر صرف انقرہ ہی کا نہیں بلکہ استنبول، ازمیر، دیار بکر، اور فہ غرض ترکی کے ہر چھوٹے بڑے شہر کا ہے، عوام (مرد عورت بچے بوڑھے) دن کو اپنے اپنے کاموں پہ جاتے ہیں اور سرِشام ہی گھروں سے نکل جاتے ہیں اور قریبی شہر میں جمع ہو جاتے ہیں، اور پوری رات ناکام انقلاب اور اس کے تانے بانے بننے والوں پر سات حرف بھیجتے گزارتے ہیں، آج اس سانحہ کو ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے، لیکن عوام کی تعداد اور جوش ولولہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

دین اور اہل دین کی اتنی قدر کہ تھوڑی دیر قبل ایک حاضر سروس فوجی آفیسر جہاز میں میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے، علیک سلیک، تعارف ہوا، مذاق سے کہنے لگے اب لوگ داڑھی والوں سے کم وردی والوں سے زیادہ ڈرتے ہیں، اترتے ہوئے سینے سے لگایا اور اس محبت سے ماتھا چوما کہ خلوص اور پیار روح تک محسوس ہوا پھر رخصت کرتے ہوئے انتہائی ادب سے سر دعا کی درخواست ہے کہتا ہوا رخصت ہوا۔!

اس وقت میں حاجی بیرام مسجد کے سامنے کھڑا ہوں، مسجد کے سامنے لگے خوبصورت فوارے، (جن میں چھپے برقی قمقمے ان کے حسن میں مزید اضافہ کر رہے ہیں) ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور کہیں دور کھلی رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو ہے اور میں ہوں، ایک نظر فواروں سے اچھل اچھل کر اٹھکیلیاں کرتے پانی پر تو دوسری نیلگوں آسمان کی طرف اور تمنائیں خود بخود دعا بن کر لبوں سے جڑ جاتی ہیں کہ اے اللہ اس عظیم قوم، خوبصورت ملک سمیت تمام اسلامی ممالک کی حفاظت فرما اور بے اختیار زبان گنگناتی ہے۔

اسلام کی فطرت کو قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دو گے!

اردگان پر تنقید کیوں غلط ہے؟

سجاد سلیم

محترم عامر ہاشم خاکوانی صاحب کا کالم پڑھا، جس میں انہوں نے طیب اردگان کے پاکستانی حمایتیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اردگان کو بنگلہ دیش کی حسینہ واجد سے تشبیہ دی۔ ترکی کے حوالے سے اس وقت پاکستانی میڈیا عمومی طور پر مغرب اور گولن موومنٹ کے پروپیگنڈے سے متاثر دکھائی دیتا ہے، لیکن چند معتدل مزاج احباب بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ترکی میں گولن موومنٹ کے خلاف کریک ڈاؤن کے حوالے سے چند گزارشات درج ذیل ہیں، میری کوشش یہی ہے کہ تنقید برائے تنقید کے بجائے مسئلے کو سمجھنے کے لیے انصاف پسند لوگوں کے سامنے چند حقائق بیان کیے جائیں۔

سب سے پہلے تو اردگان کو حسینہ واجد سے ملانا درست نہیں ہے۔ حسینہ واجد کی حکومت کے تو آئینی ہونے میں ہی شکوک وشبہات ہیں۔ بنگلہ دیش کے 2014ء کے عام الیکشن میں بی این پی

سمیت ملک کی 18 پارٹیوں نے حسینہ حکومت کی دھاندلی کے خلاف بائیکاٹ کیا۔ جبکہ ترکی کے ہر انتخاب میں نہ صرف باقی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لیتی ہیں، بلکہ حکومت کے خلاف دھاندلی کا بھی کوئی الزام نہیں ہے۔ حالیہ بغاوت میں تمام اپوزیشن نے مشترکہ طور پر حکومت کا ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ اردگان حکومت پر ابھی تک کسی مخصوص ملزم کو پھانسی دینے کے لیے دباؤ ڈالنے کا ثبوت بھی سامنے نہیں آیا، جبکہ حسینہ واجد حکومت کے خلاف بے شمار ثبوت موجود ہیں، جن کو سب سے پہلے معروف انگریزی اخبار دی اکانومسٹ نے شائع کیا، جس میں سپیشل ٹرائل کورٹ پر جلدی جلدی پھانسیاں دینے کے لیے شدید حکومتی دباؤ کی فون کالز موجود ہیں۔ ترکی میں ابھی تک باغیوں کے خلاف ہونے والی کارروائی پر کسی قسم کا قانونی اعتراض سامنے نہیں آیا، جبکہ بنگلہ دیش کے کینگرو ٹرائل میں بے شمار قانونی سقم موجود ہیں، جس میں ملزم اپنی صفائی کے لیے گواہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی ابھی تو کارروائی کا آغاز ہوا ہے اور اس کا کسی بھی طرح سے حسینہ حکومت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا، ابھی تک کسی بھی شخص کو نہ پھانسی دی گئی ہے اور نہ عمر قید۔

گولن موومنٹ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، نمایاں بات یہی ہے کہ یہ ترکی کی عدلیہ، فوج، میڈیا، پولیس اور تعلیمی اداروں میں خطرناک حد تک اثر رکھتی ہے۔ گولن کے زیادہ تر پیروکار ریاست سے زیادہ اپنی تحریک کے ہی وفادار ہیں۔ اس کی چند مثالیں، آگے چل کر بیان کروں گا۔ پاکستان میں اسلام پسند بالخصوص اور باقی لوگ بالعموم، موجودہ بغاوت سے پہلے گولن موومنٹ کے حوالے سے نرم گوشہ ہی رکھتے تھے۔ قاضی حسین احمد صاحب بھی ترکی میں اسلام پسندوں کے عروج میں گولن موومنٹ کا اہم کردار گردانتے تھے۔ کچھ لوگوں کو ابھی تک یہ غلط فہمی ہے کہ حالیہ بغاوت کے پیچھے گولن موومنٹ کا ہاتھ نہیں ہے۔ ان کے لیے عرض ہے کہ یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا کہ گولن نے مارشل لا کی حمایت کی ہو۔ 1997 میں نجم الدین اربکان حکومت کے خلاف

فوجی بغاوت کے وقت بھی گولن موومنٹ نے مارشل لا کی حمایت کی تھی کیونکہ گولن کو نجم الدین اربکان کے ترکی میں اپنا اثر ورسوخ کم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ گولن نے یہ اقرار تو خود بھی کیا ہے کہ اسے 1997 کی بغاوت کا پہلے سے پتا تھا۔ ترکی میں بہت سے لوگ 1997 کے مارشل لاء کے خلاف تحقیقات کا دائرہ گولن تک وسیع کرنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ گولن موومنٹ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے ترک ریاست پر کنٹرول چاہتی ہے۔ گولن موومنٹ نے اپنے پیروکاروں کو ریاستی اداروں میں پہنچانے کے لیے کئی اکیڈیمیز قائم کر رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری امتحانات میں نقل کے ذریعے بھی اپنے پیروکاروں کو آگے بڑھاتی ہے۔ مئی 2016ء میں تقریباً اسی لوگوں کو 2010ء کے امتحان میں نقل وغیرہ استعمال کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ جن میں سے زیادہ تر کے بنک اکاؤنٹس کی جانچ کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ وہ گولن موومنٹ کے لیے باقاعدگی سے فنڈنگ کرتے ہیں۔

اردگان حکومت ریاست کے اندر اس ریاست کو اپنے لیے بڑا خطرہ سمجھتی رہی ہے۔ 2012ء میں حکومت نے گولن موومنٹ پر دہشت گردی کے الزامات کے بعد موومنٹ کے سینکڑوں سکول بند کرنے کا فیصلہ کیا، تو اسے میڈیا، عدلیہ اور پولیس کے ساتھ مل کر ایک بڑے کرپشن سکینڈل کے ذریعے زبردست ردعمل دیا گیا۔ جسے اردگان کے حامیوں نے سافٹ کوپ کی کوشش کہا۔ حکومت کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس کے ذریعے موجودہ حکومت کو تحقیقات کے قانون کے تحت ڈی سیٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ 2015ء میں عدالت نے گولن کے سکولوں کو بند کرنے کے قانون کو بھی غیر آئینی قرار دے دیا۔

حالیہ بغاوت میں بھی گولن کا کردار تحقیقات کے ذریعے واضح ہو چکا ہے۔ باغی جب قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور آرمی چیف نے قبضے کے حکم نامے پر دستخط سے انکار کیا تو باغیوں

نے آرمی چیف کی گولن سے بات کروانے کی کوشش کی۔ جہاں تک ججز کی بات ہے، تو پچھلے تمام مارشل لاء میں ججز کا کردار شرمناک اور واضح ہے۔ اسی عدلیہ کے ذریعے پچھلے مارشل لاء کے دوران لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ آج تک عدلیہ کو مارشل لاء اور ڈیپ اسٹیٹ کے حمایتی ججز سے صاف نہیں کیا جا سکا جو کہ جدید جمہوری ترکی کی ضرورت ہے۔ مصری مارشل لاء کے بعد، مصر میں عدلیہ کا کردار بھی سب کے سامنے ہے جو سینکڑوں لوگوں کو سزائے موت اور پھانسی کی سزائیں سنا چکی ہے۔

ان تمام حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حالیہ بغاوت میں صرف چند فوجی افسران شامل نہیں تھے بلکہ مختلف شعبوں مثلاً عدلیہ، میڈیا، پولیس اور تعلیمی شعبوں سے وابستہ کثیر تعداد میں لوگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ باغیوں کے جرائم کی سنگینی سے بھی کوئی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے نہ صرف پارلیمنٹ اور ایوان صدر پر حملہ کیا، اردگان کو ہوٹل اور پھر جہاز میں ختم کرنے کی کوشش کی بلکہ 200 کے قریب لوگوں کو شہید بھی کر دیا۔ اس کے بعد اگر باغیوں سے صحیح طرح نہ نمٹا گیا تو دوبارہ بغاوت کا امکان موجود رہے گا۔ جہاں تک گرفتار ہونے والوں کے انسانی حقوق کا سوال ہے تو شاید ہی کوئی ذی شعور انسان اس کی مخالفت کرے۔ اردگان حکومت اب تک 1200 فوجی قیدیوں کو رہا بھی کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی میڈیا بھی بڑے شیشوں کی عینک سے تاک لگائے بیٹھا ہے اور جیسے ہی اسے کوئی ہلکا سا شک بھی گزرے گا، تو وہ آسمان سر پر اٹھا لے گا۔

اردگان نے دنیا میں ظلم کے خلاف ایک مضبوط آواز اٹھائی ہے، اسی وجہ سے اسے پسند کیا جاتا ہے اور اس کی حمایت کی جاتی ہے۔ مسلم نوجوانوں کو انتہا پسندی سے دور رکھنے میں بھی اردگان کا اہم کردار ہے کیونکہ اس نے مسلمان نوجوان کو بتایا ہے کہ عسکریت اور انتہا پسندی کے علاوہ بھی ظلم کے خلاف پر امن طریقے سے لڑنے کا راستہ موجود ہے۔ ترکی میں اس وقت آزادی

کے متوالوں اور فاشزم کی نشانیوں میں کشمکش جاری ہے۔ آزادی کے قائد جناب طیب اردگان کو ہماری حمایت کی ضرورت ہے، اور دنیا میں آزادی کا حامی ہر شخص ان کے ساتھ ہے۔ اللہ انہیں کامیاب کرے۔

کیا گولن پرامن مذہبی اسکالر ہیں؟

ایزگی بساران

یہ حق ہر ایک کو حاصل ہے کہ وہ ناکام بغاوت کے بعد، ترک حکومت کے اقدامات میں حقوقِ انسانی کی پامالیوں کی نشاندہی کرے مگر یہ حق کسی کو نہیں پہنچتا کہ حقوق انسانی کے اس نعرے کو مسٹر گولن کی خفیہ تنظیم، جو بلا مبالغہ ریاست کے اندر ریاست کے طور پر کام کر رہی تھی، کی ڈھال کے طور پر استعمال کرے جس نے رواں ماہ ترک سوسائٹی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ترک عوام اور ترک حکومت نے مسٹر گولن کے خفیہ اور غیر قانونی نیٹ ورک سے بہت گہرا زخم کھایا ہے۔ مسٹر گولن کے پچھلے ٹریک ریکارڈ کو میڈیا نے یا تو جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے یا پھر اس نیٹ ورک کی طرف سے گمراہ کن معلومات فراہم کیے جانے کی وجہ سے اصل حقیقت سے ناواقف رہا ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ذیل میں چند نکات کی صورت، مسٹر گولن سے متعلق ان حقائق کو بیان کرتی ہوں۔

1۔ مسٹر گولن کی شخصیت اور ان کی تحریک مغرب میں بین المذاہب ڈائیلاگ اور امن پسند تحریک کے طور پر جانی جاتی ہے، جبکہ اس چیز کا حقیقت سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ مسٹر گولن نے 1999ء میں ترکی کو اس وقت خیر باد کہا جب ان پر اس وقت کی سیکولر حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام لگا۔ بعدازاں، نائن الیون کے حادثہ کے بعد، مغرب میں بڑھتی ہوئی اسلامی شدت پسندی کے مقابلہ میں انہیں اس کے آگے بند باندھنے والے عالم کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ انہی دنوں انہوں نے امریکی شہریت کے حصول کے لیے "ماہر تعلیم" کی حیثیت سے درخواست دی جو اس لیے نامنظور ہوئی کہ وہ خود کسی بڑے تعلیمی ادارے میں استاد ہیں نہ انہیں مروجہ تعلیم کی دنیا کا کوئی خاص تجربہ ہے۔ اس درخواست پر مزید یہ اعتراض بھی ہوا کہ درخواست گزار (مسٹر گولن) ایک بہت بڑی مذہبی جماعت کے رہنما بھی ہیں جو اپنے ساتھ کئی کاروباری سیٹ اپ بھی رکھتی ہے۔

2۔ گولن تحریک کی دو پرتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے چاہنے اور ماننے والے ان کو کسی نہ کسی درجہ میں امام مہدی جیسا تصور کرتے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے ماننے والوں کے نزدیک ایک ایسے منتظم کی حیثیت رکھتے ہیں جس نے عدلیہ، فوج اور پولیس سمیت تمام اداروں میں اپنا ایک ایسا خفیہ جال بچھا رکھا ہے جو میکاولی کے نظریہ مکاری کے مطابق خاص طور پر ترکی میں اپنے اہداف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان کے ماننے والے، پھر چاہے وہ عدلیہ، پولس یا جیسا کہ دیکھا گیا کہ فوج سمیت ملک کے جس بھی ادارے میں کام کرتے ہوں، ادارے کے نظام سمع و اطاعت کے بجائے اپنے اس روحانی رہنما کی بات ماننے کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں اور وہ اپنے ادارے یا ملک کے مقابلے میں اپنے رہنما کے ساتھ زیادہ وفادار رہتے ہیں۔

3۔ طاقت کے مراکز پر قبضہ جمانے کے حوالے سے فتح اللہ گولن خفیہ اور تدریجی عمل پر یقین

رکھتے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''آپ کو سسٹم کی رگوں میں اس خاموشی اور تسلسل کے ساتھ سفر کرتے رہنا ہوگا کہ کسی کو آپ کی موجودگی کا احساس تک نہ ہو اور یوں طاقت کے مراکز تک پہنچنا ہوگا۔ اس وقت تک جب تک کہ پھل پک کر تیار نہ ہو جائے، آپ کو انتظار کرنا ہوگا تا آنکہ آپ اپنا سفر مکمل نہ کرلیں اور حالات موافق نہ ہو جائیں۔ یہ اسی طرح ہوتا رہے گا جب تک کہ ہم اس مقام تک نہ پہنچ جائیں کہ جب دنیا کا وزن اپنے کندھوں پر اٹھانے کے قابل بن جائیں۔ آپ کو اس وقت تک یہ سب کچھ کرتے رہنا ہوگا جب تک کہ آپ ترکی کے تمام آئینی اداروں کی طاقت اپنے حق میں نہ کرلیں۔ اس سے قبل کوئی بڑا قدم اٹھانا، عجلت ہوگی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا کہ انڈے کو وقت سے پہلے ہی پھوڑ دیا جائے اور چوزے کو اندر ہی مار دیا جائے۔''

4۔ گولن نیٹ ورک نے امریکا، برطانیہ اور ترکی میں بہترین لابنگ کمپنیوں کی خدمات مستعار لیں اور ان ممالک میں اپنا امیج بہتر بنانے اور کئی ہمدرد پیدا کرنے میں کامیاب رہا۔ امریکی حکومت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس نیٹ ورک کی مالی استعداد پچیس سے پچاس ارب ڈالر تک ہے اور یہ تحریک دنیا کے 125 ملکوں میں کام کر رہی ہے جس میں اسکولز اور ویلفیئر کے کئی ادارے شامل ہیں۔

5۔ گولن تحریک آج ہی نہیں، 1980ء کی دہائی سے ملکی اداروں کے لیے ایک خطرہ رہی ہے جب اس کے ماننے والوں کو تب کے حکمرانوں نے مختلف حیلوں بہانوں کے ساتھ ایک حد کے اندر رکھا۔ یہاں تک کہ مصطفی کمال کی باقیات اور ترک افواج، جو کہ ایک عرصہ تک خود کو سیکیولرازم کے محافظ باور کراتے رہے تھے، نے بھی گولن تحریک کو اپنے لیے ہمیشہ خطرہ ہی تصور کیا۔ آج وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اس تحریک کو ریاست کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے ایک حد

کے اندر رکھنا، گزرے حکمرانوں کی دوراندیشی اور درست قدم تھا۔

6۔ جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی (AKP) کا دس سالہ دور گولن تحریک کے لیے سنہرے دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب (AKP) کو ملکی سیاست سے فوج کے عمل دخل کو الگ کرنے کے لیے اتحاد کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس اتحاد میں بھی گولن تحریک نے رنگ میں بھنگ ڈالے رکھا۔ سن 2010ء میں (AKP) حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک سازش کا کیس بنا، جس میں ملٹری افسران، حزب مخالف کے ممبران اور کچھ صحافیوں پر الزام آیا کہ انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ گولن سے وابستہ پولیس کے کچھ عہدیداروں نے یہ من گھڑت کہانی تخلیق کی تھی اور افواہ پھیلا کر حکومت کو مس گائیڈ کیا تھا۔ اس ٹرائل کا نام Sledgehammer تھا۔ بعدازاں، 2015ء میں تمام ملزمان کو اس ٹرائل سے باعزت بری اور رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد رجب طیب اردگان نے تسلیم کیا کہ انہیں گولن کے لوگوں نے غلط معلومات فراہم کی تھیں۔

7۔ روزنامہ حریت کے ایڈیٹر نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رواں ماہ وقوع پذیر ہونے والی ناکام فوجی بغاوت دراصل انہی فوجی افسران نے تیار کی تھی جن کو مندرجہ بالاSledgehamme ٹرائل کے نتیجے میں اپنے عہدوں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ سب ڈرامہ اس لیے کیا گیا تھا کہ ان کی جگہ گولن تحریک سے وابستہ افراد کو لایا جائے۔ اس سے یہ معلوم پڑتا ہے کہ اس بغاوت کی منصوبہ بندی اور تیاری بہت پہلے سے جاری تھی اور 2010ء والی جعلی بغاوت دراصل رواں ماہ والی ناکام بغاوت کی تیاری تھی۔

8۔ اسی طرح جن صحافیوں کو اس سازش میں پھنسایا گیا تھا وہ بھی دراصل وہ صحافی تھے جو گولن تحریک کے ریاست کے اندر بڑھتے ہوئے اثر رسوخ اور اس کے عزائم سے پردہ اٹھا رہے

تھے لہٰذا ان کو سبق سکھانے کے لیے ان کے نام بھی اس سازش میں ڈال دیے گئے۔

9۔ حالیہ ناکام بغاوت کا الزام گولن نیٹ ورک پر محض گمانی الزام نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ٹھوس شواہد موجود ہیں جن کو بدقسمتی سے ایک لمبے عرصہ سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ احمد زکی یوکوک، جو کہ ایک ملٹری پراسیکیوٹر ہیں، نے سنہ 2009ء میں، ترک آرمی کے اندر گولن تحریک کے ایک وسیع نیٹ ورک کا پتہ چلایا تھا۔ انہوں نے آرمی کے اندر کئی خفیہ نیٹ ورکس کی نشاندہی کی تھی اور باقاعدہ افراد کے ناموں کے ساتھ تفصیلات بیان کی تھیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ اپنا کام یوں مکمل نہ کر سکے کہ ان پر دو الزامات آ گئے۔ ایک تو ملزمان پر تشدد کرنے کا اور دوسرا وہی 2010ء والی جھوٹی بغاوت کیس (Sledgehammer) میں نام آنے کا۔ اس غریب نے پورے پانچ سال جیل میں گزارے اور رہا ہونے کے بعد گزشتہ اپریل میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ آرمی کے اندر ایک ایک گولنسٹ کو اس کے نام سے جانتا ہے۔ حالیہ بغاوت کے بعد اس کا کہنا ہے کہ اس بغاوت میں سو فیصد وہی لوگ ہیں جن کی لسٹ اس نے تیار کی تھی۔ حالیہ بغاوت کے دوران ایئر فورس کے جہازوں نے ترک پارلیمنٹ پر بمباری کی۔ اس ضمن میں وہ ایئر فورس کے ایک ریٹائرڈ کرنل Selcuk Basyigit کے الفاظ دہراتے ہیں جو گولن تحریک سے وابستہ تھے اور جنھوں نے Sledgehammer والے جھوٹے بغاوت کیس میں عدالت میں بیان دیا تھا کہ اب ہم بہت طاقتور ہیں، ہمارے پاس اب ایف۔16 اور ایف۔4 جہاز ہیں۔ اب ہم گولن کے حکم پر کہیں بھی بمباری کر سکتے ہیں۔ (یاد رہے کہ یہ بیان اس وقت دیا گیا تھا جب گولن، حکومت کے اتحادی تھے)۔

10۔ آخر میں یہ حقیقت کہ اس بارے میں ترک عوام، تمام کی تمام اپوزیشن پارٹیاں اور ان کے رہنما اور فوج کے وہ افسران جو بغاوت کا حصہ نہیں تھے، اس بات پر یکسو ہیں کہ یہ کام گولن

نیٹ ورک والوں کے علاوہ کسی اور کا نہیں۔ پھر یہ کہ آرمی چیف کو یرغمال بنا کران کی گولن سے ٹیلی فون پر بات کروانے کی کوشش، یہ تمام وہ ثبوت ہیں جو اس خفیہ تحریک کو اس بغاوت کا ذمہ دار قرار دینے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آج ہی ترکی کے وزیر انصاف نے یہ بیان دیا ہے کہ بغاوت کی کامیابی کی صورت میں گولن اسی طرح ترکی آنا چاہتے تھے جیسے کسی زمانہ میں خمینی ایران آئے تھے۔ (مترجم)

(ایز گی بساران (EZGI BASARAN) کے اس مضمون کا ترجمہ ابو محمد مصعب نے کیا ہے۔ یادرہے کہ ایز گی اردگان مخالف سیکولر اخبار نویس ہیں، سوشل لبرل ڈیلی Radikal کی کوارڈ نیٹر تھیں جسے حکومت کی طرف سے بندش کا سامنا کرنا پڑا اور اب بھی Dogan Media Group گروپ کو بندش کا سامنا ہے، اس کے باوجود ان کے یہ خیالات کافی اہمیت کے حامل ہیں)

قبیلے کی آنکھ کا تارا

حضرت مولانا عمرین محفوظ رحمانی

گذشتہ سنیچر کی رات ترکی کے لیے ہی نہیں پورے عالم اسلام کے لیے ہنگامہ خیز رہی۔ جیسے ہی یہ خبر دنیا میں پھیلی کہ ترکی میں فوجی بغاوت ہوگئی ہے اور پہلے مرحلے میں یہ اطلاع آئی کہ وہاں کی منتخب جمہوری حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا ہے اور فوج کی حکمرانی قائم ہوگئی ہے، اسلام دشمن طاقتوں کے دل کی کلیاں کھل اٹھیں، اور عالم اسلام سوگوار ہوگیا۔ رات کی سیاہی تابہ کمر آ پہنچی تو خبروں کا رخ بدلنے لگا اور پھر صبح کا سورج باغیوں کی ناکامی اور جمہوری حکومت کی بحالی کا پیغام لے کر طلوع ہوا، اب صورت حال بدل گئی، عالم اسلام کی سوگواری کی جگہ مسرت اور شادمانی نے لے لی، اور دشمنان دین رنج واندوہ کے سمندر میں ڈوب گئے، ان کے کلیجے منہ کو آنے لگے، اور جوش غضب میں منہ سے جھاگ اڑنے لگا اور دور کہیں سے

"قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ"

کا قرآنی اعلان سنائی دینے لگا۔

الحمدللہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیراً موافیاً لنعمہ مکافیاً لمزیدہ۔

ترکی صرف ایک مسلمان ملک نہیں ہے، وہ عرصہ دراز تک خلافت اسلامی کا مرکز رہا ہے۔ وہاں کے جوانمردوں اور باہمت مسلمانوں نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ایک زرین تاریخ رقم کی ہے، پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب کہ ترکی کو لادینیت کے اژدھے نے نگل لیا، اور کمال اتاترک نے اسلامی اقدار کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، یہ تاریک دور بھی گذر گیا، اور اب برسہا برس سے ترکی اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی قیادت والے دور کی طرف لوٹ رہا ہے، ترکی کے موجودہ صدر رجب طیب اردگان باحمیت مسلمان اور دردمند انسان ہیں، وہ نہ تھکنے والے عزم اور نہ ہارنے والی ہمت کے مالک ہیں، زمانہ و زندگی کے نشیب و فراز سے واقف اور اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں و فکرمند ہیں۔ وہ ایک کامیاب سیاست داں اور اپنے ملک سے غیر معمولی محبت رکھنے والے انسان ہیں۔ ان کے عہد صدارت میں ترکی نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور اسے ایسا معاشی استحکام نصیب ہوا ہے جس نے یورپی ممالک کی راتوں کی نیند حرام کردی ہے۔ ترکی سے آگے بڑھ کر انہوں نے عالم اسلام کے حالات اور معاملات میں بھی غیر معمولی دلچسپی لی۔

فلسطین کے سلسلے میں واضح اٹل اور اسلامی غیرت وحمیت سے لبریز موقف اختیار کیا، اور جھجک اور لاگ لپٹ کے بغیر اس کا بار بار اعلان کیا۔ شام میں ہونے والی خانہ جنگی پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا، وہاں کے لاکھوں لاکھ مسلمانوں کو اپنے ملک میں پناہ دی۔ مصر میں الاخوان المسلمون کی منتخب حکومت لاقانونی طریقہ سے برخاست کرنے پر سخت احتجاج کیا۔ مصر کے معزول صدر مرسی کی پرزور حمایت کی۔ برما کے مصیبت زدہ اور پریشان حال مسلمانوں کو اپنے ملک میں بسایا۔ ترکی کی جانب سے روسی طیارہ مار گرائے جانے پر جب روس نے سخت تیور

اپنائے اور ترکی کو دھمکیاں دیں تو ایسے سخت لب ولہجہ اور کڑے تیور کے ساتھ جواب دیا کہ روس کی بولتی بند ہوگئی، اور اس نے خاموش ہو جانے ہی کو اپنے لیے باعث نجات تصور کیا۔ ابھی گذری ہوئی عید پر اسرائیل کو مجبور کر کے غزہ کے مسلمانوں کے لیے عید کے تحائف اور مسلمان بچے بچیوں کے لیے کھلونے بھیج کر انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا، جس کی توقع صرف انہی سے کی جا سکتی تھی۔ بنگلہ دیش میں مولانا مطیع الرحمٰن نظامی کی مظلومانہ شہادت پر بنگلہ دیشی حکومت کو سخت تنبیہ کی، اور اظہار ناراضگی کے لیے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ ان اقدامات نے انہیں عالم اسلام کی ''آنکھوں کا تارا'' اور دشمنان اسلام کی نگاہ میں ''ببول کا کانٹا'' بنا دیا۔ ترکی کے پچھلے انتخابات میں اسلام دشمن طاقتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح اردگان اور ان کی پارٹی کا راستہ روکا جائے اور انہیں اقتدار سے محروم کر دیا جائے، مگر خدا تعالیٰ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہا، اور

''وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ''

کا منظر سامنے آیا، حق فتح مند ہو! باطل مغلوب ہوا، اور باطل تو ہے ہی مٹنے، فنا ہونے، اور برباد ہو جانے کے لیے!

فوجی بغاوت کی حالیہ کوشش بھی دشمنان اسلام کا حربہ اور ان کے سازشی ذہن کی پیداوار ہے۔ خدانخواستہ یہ فوجی بغاوت کامیاب ہوگئی ہوتی تو ایسا ناقابل تلافی نقصان ہوتا، جس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ پاک کے فضل وکرم اور ترک قوم کی جانبازی، ہمت اور زبردست قربانی کے نتیجے میں فوجی بغاوت ناکامیاب ہوگئی، اور بقول اردگان اللہ پاک کی طرف سے ترکی فوج کی تطہیر کا موقع مل گیا، خدا تعالیٰ اردگان کو تادیر سلامت اور برسر کار رکھے کہ وہ اس وقت اقبال کے الفاظ میں ''قبیلے کی آنکھ کا تارا'' ہیں اور ترک مسلمانوں کے اقبال میں اضافہ ہو کہ وہ ''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی'' ہیں۔

دوست ہزار بھی کم، دشمن ایک بھی زیادہ

مؤلف: زبیر منصوری

''جامع مسجد دمشق میں جڑے ہیرے جواہرات اتار کر بیت المال میں جمع کروادیے جائیں۔''

درویش منش پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا حکم سن کر حکومتی عہدیداران پریشان تھے۔ پچھلے خلیفہ نے یہ انمول ہیرے مسجد میں جڑوائے تھے اور اب حضرت عمر انہیں اتارنے کا حکم دے رہے تھے۔ ان کی نظر میں یہ اسراف اور فضول خرچی تھی۔ مسجد میں بھلا ہیروں کی کیا جگہ؟

ابھی ہیروں کو مہارت اور صفائی سے اتارنے کی منصوبہ بندی جاری تھی کہ ایک عیسائی سلطنت کا ایک سیاسی وفد خلیفہ سے ملنے آن پہنچا۔ انہیں دیگر مقامات کے علاوہ مسجد کا وزٹ بھی کروایا گیا۔ وہ عبادت گاہ میں ہیرے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور بولے:

''جو قوم اپنی عبادت گاہوں کو بھی ہیرے جواہرات سے مرصع رکھتی ہے، اسے بھلا کون شکست دے سکتا ہے؟''

وہ مسلمانوں کی قوت وشوکت وسائل کی فراوانی اور طاقت سے نہایت مرعوب ہو چکے تھے۔ یہ بات جب حضرت عمر تک پہنچی تو انہوں نے جوہرات اتارنے کا حکم منسوخ کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ طاقت مرعوب کر دینے کا نام ہے اور دمشق کی مسجد دشمن کے دل میں مسلمانوں کی قوت اور وسائل کی کثرت کا رعب بٹھاتی ہے تو پھر ہیرے اور کس کام کے ہیں؟

اردگان کا وہائٹ ہاؤس سے بڑا محل اسی نیت سے بنایا گیا ہے اور اعلانیہ طور پر کہہ کر بتا کر اعلان کر کے بنایا گیا ہے کہ اس کا مقصد عظیم عثمانی خلافت کا احیا ہے۔ قوموں کے لیے کروڑوں اربوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ حمیت اور غیرت اور عالمی برادری میں شان وشوکت کی اہمیت ہوتی ہے۔ تکبر اور اکڑ کر چلنا اللہ کو پسند نہیں مگر عین طواف کعبہ کے دوران اکڑ کر سینہ پھلا کر چلنے کا حکم اللہ کے رسول کو خود اللہ نے دیا تاکہ دشمن مرعوب ہو اس کی ہمت ٹوٹ جائے۔ وہ چھوٹا بن کر رہے اس لیے کہ عزت تو بس اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔

اکڑنا بری بات مگر واہگہ بارڈر سے لے کر ہر جگہ جہاں ہمارے فوجی دشمن کے سامنے اکڑتے اور سینہ پھلاتے ہیں تو قوم کا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے کہ جن کا معاملہ یہ ہے۔

''حمیت نام تھا جس کا
گئی تیمور کے گھر سے''

پیارے اردگان

عثمانی خلافت، اسلام کی شان وشوکت کی ہر علامت، امید حوصلہ، امنگ کامیابی کے ہر استعارہ کو آگے بڑھاؤ۔ تم نے پہلے اپنی قوم کا پیٹ بھرا ہے اب ان کی عزت وشرف کے تقاضے پورے کرو خوب خرچ کرو۔ یہی نہیں جشن فتح قسطنطنیہ مناؤ بلکہ ماضی کی ہر کامیابی کو نئے جذبے سے منانا شروع کرو۔ دیکھو دل شکستہ پریشان مایوس امت کو جوش حوصلہ ولولے اور کامیابی کی امنگ

دینے کی ضرورت ہے

آگے بڑھو مگر بس ذرا احتیاط سے غیر ضروری دشمن پیدا کیے بغیر کیونکہ

''دوست ہزار بھی کم دشمن ایک بھی زیادہ''

ہم سب تمہارے ساتھ ہیں

رہے یہ کیڑے نکالنے والے تو ان میں سے کچھ

دشمن کے ایجنٹ ہیں

کچھ نادان دوست

کچھ تنقید کے ذریعہ شہرت کے طلبگار

کچھ انا کے مارے ہوئے

کچھ بس کچھ نیا لکھ دینے کے مرض میں مبتلا

اور کچھ بس احمق

مگر کبھی کتوں کے بھونکنے سے کسی فقیر کا رزق کم ہوا ہے؟

میرے اردگان! میرے پیارے اردگان!

تم ہو اک زندہ و جاوید روایت کے چراغ

تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے

تم تو امید بن کر دلوں میں ہمیشہ زندہ رہو گے۔

ترکی میں بغاوت

سینیٹر (ر) طارق چوہدری

ترکی کے عوام تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے غیر معمولی شجاعت اور دلیرانہ مہارت کے ساتھ خالی ہاتھ مسلح باغیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں شکست فاش دی۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے چند گھنٹوں کے اندر ''مسلح بغاوت'' کو کچل ڈالا۔ انقرہ اور استنبول کی پولیس کی بجا طور پر تعریف کرنی چاہئے جنہوں نے بھاری جانی نقصان کے باوجود اپنی قومی، قانونی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کیا۔ عوام اور پولیس کا باہمی تعاون اور تال میل ہی تھا جس کی وجہ سے بغاوت فرو ہوگئی اور اس پر جلد ہی قابو پالیا گیا۔ بغاوت کے اصل محرک پر ابھی کھل کر کچھ بھی نہیں کہا گیا لیکن جو کچھ ہمارے ٹی وی چینلز، تجزیہ کار اور حکومت کے وفادار کہہ رہے ہیں، ترکی کے صدر طیب اردگان اور ان کی حکومت کی رائے اس کے برعکس ہے۔ ہمارے لکھاری اور تجزیہ کار ترک حکومت کی اسلام کی حمایت میں پالیسیوں کے خلاف فوج کے لبرل اور

سیکولر طبقوں کا ردعمل قرار دے رہے ہیں، جبکہ ترکی کے صدر اس کا الزام ''فتح اللہ گولن'' کی تحریک پر دھرتے ہیں۔ انہوں نے ترکی میں فوج کے جارحانہ سیکولرازم کے خلاف بڑی مدلل اور منظم مگر پرامن اور مؤثر تحریک چلائی۔

وہ ایک عرصہ تک طیب اردگان کی رہنمائی اور سرپرستی بھی کرتے رہے۔ ان کی ابتدائی کامیابیاں فتح اللہ گولن کے تربیت یافتہ لوگوں کی حمایت سے ممکن ہوئیں۔ بعد میں طیب اردگان کی سیاسی حکمت عملی اور اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے ترک عوام کے دلوں میں ان کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور وہ مقبول عوامی لیڈر بن کر ابھرے۔ اب انہیں ایک اور سنہری موقع میسر آیا ہے کہ وہ عدلیہ اور فوج میں بھی ان کے حامیوں کو نکال باہر کریں۔ اب فوج میں بہت کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ بعض آئینی ترامیم بھی بہت تیزی کے ساتھ جلد ہی متوقع ہیں جس سے ترکی میں فوج کا کردار اور بھی محدود ہو جائے گا۔ ترکی کے اردگرد حالات پاکستان کے حالات سے زیادہ مختلف نہیں ہیں، اسے بھی اپنے اردگرد بڑی طاقتوں، سازشی ہمسایوں اور علاقائی جارحیت کا سامنا رہتا ہے، لہٰذا ترکی بھی فوج کی تعداد اور قوت کو کم نہیں کر سکتا۔ وہاں بھی فوج ہی قومی سالمیت کا سب سے بڑا عامل ہے۔

ترکی میں جمہوری حکومت کی کامیاب سیاسی، اقتصادی پالیسیوں، سیاسی جماعتوں کے بہتر نظم ونسق، حکومت واپوزیشن کی بقائے باہمی کے طریقہ کار نے جمہوریت کو مقبول اور مؤثر بنا دیا ہے۔ اس لیے ترکی میں مارشل لا کے امکانات آہستہ آہستہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ترکی کا نیٹو میں بھی کافی بڑا اور مؤثر کردار ہے۔ یورپی یونین سے قریبی تعاون بھی جمہوریت کے استحکام اور فوج کے سیاسی کردار کو محدود کرنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ آج ترکی میں جمہوریت اور حکومت پاکستان کی طرح نہیں ہے۔ اردگان کی پارٹی منظم، مستحکم اور انہیں عوام میں بہت زیادہ مقبولیت

اور پذیرائی حاصل ہے۔ پارٹی کارکنوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے جو فوج کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے عوام اپنے لیڈر کی آواز پر لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ عوام کے بے پناہ ہجوم میں کوئی چیز حرکت نہیں کر سکتی، خواہ وہ ٹینک ہی کیوں نہ ہوں جس کا نظارہ ہم سب نے گزشتہ روز ترکی کی سڑکوں پر دیکھا، لیکن ہماری حکومتیں ابھی تک پارٹی کی سطح پر منظم ہیں نہ جمہوری اور نہ ہی عوام کے دلوں پر حکمران، بلکہ ہماری فوجی قیادت عوام کی سطح پر زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہے۔

ترکی میں حالیہ بغاوت کو جمہوریت اور حکومت کے خلاف فوج کی بغاوت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ''فوج کے اندر بغاوت تھی'' چند مہم جو نوجوانوں کا وقتی ابال۔ ترکی کی فوج عالم اسلام میں ایک طاقتور اور بڑی فوج ہے۔ یہ فوج تعداد، نظم وضبط اور پیشہ وارانہ مہارت میں پاکستان کے ہم پلہ خیال کی جاتی ہے، حالانکہ ترکی کی آبادی پاکستان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ترکی نیٹو کا ایک فعال ممبر ہے۔ نیٹو میں امریکا کے بعد ترکی سب سے بڑی فوج کا حامل ہے۔ علاقائی سطح پر بھی روس کے بعد اس کی فوج سب سے بڑی اور پیشہ ور فوج ہے۔ ترکی میں تینوں مسلح افواج کی مجموعی تعداد ساڑھے چھ لاکھ کے قریب ہے۔ جمعہ کے دن فوج کے اندر باغیوں کی تعداد تین سے پانچ ہزار رہی ہوگی، اس میں زیادہ تر نوجوان افسر ہی شامل تھے۔ یہ سب کے سب فوج کی ''چین آف کمانڈ'' سے باہر کے لوگ تھے۔ نہ تو فوج کی سینئر کمانڈ ان کے ساتھ تھی نہ ہی استنبول اور انقرہ کے سوا دیگر چھاؤنیوں کی سپاہ نے ان کا ساتھ دیا، نہ حمایت کی بلکہ عوام پر گولیاں برسانے والے ہیلی کاپٹر کو حکومت اور کمانڈر انچیف کے وفادار فوجیوں نے مار گرایا۔ اس لیے اسے فوج کی بغاوت نہیں، فوج کے اندر بغاوت قرار دیا جا سکتا ہے، جو نہ صرف حکومت بلکہ فوج کی قیادت پر بھی قبضہ جمانے کے ارادے سے نکلے تھے۔ اسے ایک بڑی، طاقتور، منظم فوج کے

اندر بچگانہ مہم جوئی ہی کہا جا سکتا ہے۔

نیم پختہ نوجوانوں نے یہ قدم مکمل تیاری، درست منصوبہ بندی اور قوتِ نافذہ کے بغیر اٹھایا۔ عوام، ذرائع ابلاغ، شہری انتظامیہ اور فوج کے 98 فیصد نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور یہ ٹینکوں کے اندر ہونے کے باوجود بیٹھی بطخوں کی طرح مارے گئے۔ ترکی میں حالیہ بعض فوجیوں کی بغاوت کو ترکی میں 1960، 1971 اور 1980 کے مارشل لاؤں سے کوئی نسبت ہے نہ ہی اس کا پاکستان میں ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاالحق اور مشرف کے مارشل لا سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو ترکی میں 2012ء میں بعض فوجیوں کی بغاوت جو طیب اردگان کے خلاف ہوئی، اس کے مماثل کہا جا سکتا ہے یا پاکستان میں میجر جنرل عباسی اور بریگیڈیئر بلا کی کوشش کی طرح جو ظاہر ہونے سے پہلے ہی پکڑی گئی تھی، اس میں بھی فوج کے چند جونیئر مگر غیر مؤثر افراد ایک انقلاب کی تلاش میں نکلے تھے۔ اگرچہ حالیہ بغاوت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا پھر بھی یہ مہم جوئی اگر طول پکڑ جاتی ہے تو یہ حقیقی مارشل لا نافذ ہو جانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ نقصان دہ اور تباہ کن ہو سکتی تھی۔ مارشل لا یا فوجی حکومت اگرچہ جمہوریت اور سیاسی نظام کے لیے تباہ کن ہے اور بعض اوقات قومی اقتصادیات کو بھی نقصان ہوتا ہے مگر یہ ریاست اور قومی دفاعی نظام کو تباہ نہیں کرتی۔

یہ محدود بغاوت طول پکڑ جاتی تو ترکی کی ریاست اور افواج کی صلاحیت کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر آپس میں الجھ پڑتی۔ اس وقت جب کرد علیحدگی پسند اور داعش جیسی دہشت گرد تنظیمیں ترکی کی سرحدوں پر پہلے ہی دستک دے رہی ہیں، ان حالات میں فوج کو پھر سے اصل حالت میں واپس لانا ممکن نہیں تھا۔ یہ بہت مبارک دن ہے کہ ترک عوام کی خوش قسمتی مہم جوئی کے آڑے آ گئی۔ طیب اردگان اور یلدرم کی حکومت یقیناً ترک عوام کی بھاری اکثریت نے منتخب کی ہے۔ عوامی خدمت کے بہترین ریکارڈ کی وجہ سے آج وہ

عوام کے دلوں میں رہتی ہے۔ایسی حکومت کو چلتا کرنا آسان کام نہیں ہے۔کوئی فوج عوامی ردعمل کا اندازہ لگائے بغیر اس طرح کا احمقانہ قدم نہیں اٹھا سکتی۔حکومت کو فوری انتقامی کارروائی کی بجائے ٹھنڈے دل سے اس کے محرکات کا جائزہ لینا چاہئے۔اس کے پیچھے اصل سازش اور سازشیوں کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ یہ صرف حکومت ہی نہیں فوج اور ریاست کے خلاف کوئی چال بھی ہوسکتی ہے۔اس پورے خطے میں ترکی واحد مسلمانوں کی ریاست ہے جو شدید دباؤ کے باوجود انتشار اور عدم استحکام سے بچ رہی ہے۔آخر وہ کون ہے جو اس خطے میں یہ آخری مورچہ بھی سر کرنا چاہتا ہے۔حکومت کو اس کا درست اندازہ لگانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ پاکستان اور ترکی مسلمانوں میں دو ہی ریاستیں ہیں جو جنگ کے میدان میں اپنے دشمنوں کا سامنا کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ان دونوں پر دشمن کی نظر ہے،انہیں مزید جرأت اور احتیاط سے دشمن کی چالوں کا مقابلہ کرکے ملکی سلامتی اور استحکام کو برقرار رکھنا ہے،غالب نے کہا تھا۔

کہیں ایسا نہ ہو یاں سے وہی کافر صنم نکلے

جب پردہ اٹھے گا تو یقیناً یہاں سے بھی وہی کافر صنم نکلے گا جس نے سب مسلمان خصوصاً مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو غیر مستحکم کرکے زیروزبر کر رکھا ہے۔جنہوں نے ترکی میں فوجی بغاوت کی خبر سن کر دبے دبے لفظوں میں ''تشویش'' کا اظہار کیا اور جب بغاوت ناکام بنادی گئی تو پھر دونوں کی زبان پر مذمت کا لفظ آیا اور ترک حکومت کو اپنی حمایت کا یقین دلانے لگے!

ترکی ترکی ہے

ابو سعد ایمان

جناب خاکوانی صاحب ! آپ کمال کرتے ہیں۔ کیا بنگلہ دیش اور ترکی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ برادرم ! بنگلہ دیش کی حکومت وہی ظلم اسلام پسندوں کے ساتھ اب کر رہی ہے جو ترکی میں سابقہ ستر سالوں میں بار بار کیا جاتا رہا ہے۔ اگر ستر سال تک ایک ملک میں اسلام پسندوں کا تختہ الٹا جاتا رہا اور ان کو پھانسیوں پر چڑھایا جاتا رہا اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے رہے، اس تاریخی پس منظر رکھنے والے ملک میں ایک بار پھر کسی اسلام پسند حکمران کا تختہ الٹنے کی کوشش کو کیسے وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرے گا۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک فوجی ٹولے کی طرف سے اس ہوٹل پر بم دھماکہ کیا گیا جس میں اردگان چند لمحے پہلے موجود تھے، تاکہ انہیں ہلاک کر دیا جائے، ان کے طیارے کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی، بغاوت کا حصہ نہ بننے والے فوجی جنرل اور بعض فوجیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس بغاوت پر قابو پانے کے بعد اگر اردگان

اس بغاوت کی تحقیقات کے لیے پانچ دس ہزار لوگوں کو گرفتار کرے اور غیر ملکی ایجنڈے پر چلنے والے مشکوک اداروں کے خلاف کارروائی کرے (حالانکہ نہ ابھی کسی کو پھانسی دی گئی ہے، نہ ہی ماورائے عدالت قتل کیے گئے ہیں) تو اس میں کیا غلط ہے، اور بغاوت جیسے بدترین جرم کے خلاف محض تحقیقاتی اور انضباطی کارروائی کو بنگلہ دیشی حکومت کے اسلام پسندوں کو غیر قانونی اور ظالمانہ پھانسیاں دینے کے برابر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ واہ! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ کیا اسلام پسند بنگلہ دیش میں بغاوت کے ویسے ہی مجرم ہیں جیسے ترکی میں اسلام پسندوں کی حکومت کے خلاف امریکی و اسرائیلی سازش کا حصہ بن کر بغاوت کا بازار گرم کرنے والے عناصر۔ کیا ترکی میں کسی غیر جانبدار عالمی ادارے نے حکومت پر ویسے ہی عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے جیسا بنگلہ دیشی حکومت کے حقوق انسانی کے خلاف اقدامات اور غیر قانونی پھانسیوں پر کیا گیا تھا؟

آپ کا تجزیہ اس لحاظ سے قابل گرفت ہے کہ آپ نے ترکی میں گھناؤنی بغاوت کے خلاف اسلام پسند حکمران کی محض کارروائی کو اس ظلم اور بربریت سے مشابہ قرار دے دیا ہے جو بنگلہ دیش کی اسلام مخالف حکومت اسلام پسندوں کے خلاف فرضی جرائم کی فہرست بنا کر انہیں مسلسل پھانسیوں پر لٹکا کر، کر رہی ہے۔ آپ اور آپ جیسے دیگر قابل احترام دوستوں کا یہی استدلال ہی آپ کے نقطہ نظر کو غیر متوازن اور غیر صحت مند ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اردگان خونی بغاوت کے خلاف تحقیقات ہی تو کروا رہا ہے، آپ دوستوں کو اسے حسینہ واجد کی طرح ظالم ثابت کرنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ بالفرض تحقیقات کے بعد اگر کسی بے قصور کو سزا ملتی ہے یا کوئی شخص اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے باوجود دبوچ لیا جاتا ہے اور ترکی کا میڈیا اور عالمی ذرائع ابلاغ اس خبر کو نشر کرتے ہیں تو اس صورت میں اردگان پر تنقید کرنے اور اس کے غیر شفاف کردار پر انگلی اٹھانے کا کوئی جواز بنتا ہے اور تب میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔ لیکن محض

تحقیقات اور کارروائی ہی کے مرحلے میں ظلم ظلم کا شور مچا دینا اور محض کارروائی ہی کو حسینہ واجد جیسی غیر ملکی قوتوں کی آلہ کار اور اسلام پسندوں کی دشمن حکمران کے عمل سے مماثلت دینے لگ جانا سخت ناانصافی ہے۔

گولن بہت بڑا صوفی ہے، بہت بڑا اسلام کا رہنما ہے، بہت بڑی اسلامی تحریک کا قائد ہے تو پھر اسے ڈر کس بات کا ہے، کیوں امریکا میں چھپا بیٹھا ہے۔ ترکی آئے، عدالتوں میں پیش ہو، اپنے خلاف مقدمات کا سامنا کرے اور اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ ترکی کا ایک بہت بڑا طبقہ اس کا پیروکار ہے، عالمی طاقتوں کی اسے پشت پناہی حاصل ہے تو پھر اسے ڈر کس بات کا ہے؟ اگر بے قصور ہے تو اپنے ملک میں آکر مقدمات کا سامنا کرے، اور اپنی اخلاقی برتری ثابت کرے۔ آخر بنگلہ دیش کے اسلام پسندوں نے بھی تو مردانہ وار جھوٹے مقدمات کا سامنا کیا اور بہادر شیروں کی طرح پھانسیوں کا پھندا چوم کر اس پر جھول گئے۔

ترکی میں سیکولر طبقات اور ان کی نمائندہ فوج کے اسلام پسند حکمرانوں کے خلاف ظلم و جبر کے طویل تاریخی پس منظر کے ہوتے ہوئے اردگان اس خونی بغاوت کے بعد جب اسے زبردست عوامی تائید حاصل ہے، اگر ایک ہمہ گیر تفتیش، تطہیر اور صفائی کا عمل شروع نہیں کرتا تو اسے چاہیے کہ وہ حکومت کرنے کے بجائے سبزی کی دکان کھول لے کہ یہی اس کے لیے زیادہ مناسب ہوگا۔

محترم خاکوانی صاحب! قدرت نے اردگان کو ترکی میں اسلام پسندوں کے خلاف 70 سال کا پھیلایا ہوا زہریلا جابرانہ جال کاٹنے کا بہترین موقع عطا کیا ہے، اس کے لیے اسے محیر العقول عوامی تائید حاصل ہے۔ اس کے بعد اگر وہ اس موقع کو ضائع کر دیتا ہے تو اس سے بڑا نادان کوئی نہیں، اس سے بڑا کم فہم اور کودن کوئی نہیں، اس سے بڑا موقع بے شناس کوئی نہیں۔

آپ نے اردگان کو بھٹو سے غلط طور پر تشبیہ دی۔ بھٹو جاگیردارانہ پس منظر رکھنے والا لیڈر تھا، اپنے مخالفین کو ماورائے عدالت قتل کرانے کے سنگین الزامات اس پر عائد تھے، پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے میں اس کا بہرحال ایک کردار تھا، شیخ مجیب نے اس کے خلاف فوجی بغاوت نہیں کی تھی بلکہ الیکشن جیتا تھا، جبکہ اردگان ایک غریب خاندان کا پس منظر رکھنے والا کردار ہے، اس پر اپنے مخالفین کو قتل کروانے کا کوئی الزام نہیں ہے، اور آخری بات یہ ہے کہ اردگان کے خلاف کسی نے الیکشن نہیں جیتا کہ وہ اس کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے ادھر ہم ادھر تم کا نعرہ بلند کررہا ہو بلکہ وہ تو قومی مجرموں کو کٹہرے میں لانا چاہتا ہے، بغاوت برپا کرنے والے اور ملک میں خانہ جنگی اور انارکی پھیلانے والے پورے نیٹ ورک کو تہس نہس کرنا چاہتا ہے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کیا وہ غلط کرنا چاہتا ہے؟

موجودہ تناظر میں ترکی میں اردگان کو قتل کرکے اس کی حکومت کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرنا محض ایک شخص کی حکومت کا خاتمہ نہیں ہے۔ یہ درحقیقت اسلام پسندی کے خلاف اس نفرت کا اظہار ہے جس کا ارتکاب ترکی میں بطور ایک سسٹم سابقہ ستر سالوں سے کیا جارہا ہے۔ اس کے باوجود اردگان پر الزام عائد کرنا کہ وہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے اور اپنی شخصی آمریت کو مسلط کرنے کے لیے ایسا کررہا ہے تو یہ ایک انتہائی بدگمانی اور خلاف حقیقت بات ہے۔ کیا اس کا ماضی اس طرح کا سازشی رہا ہے؟ ٹھیک ہے آپ نے یہ الزام عائد نہیں کیا لیکن بعض لوگ دبے دبے لفظوں میں اس کا اظہار کررہے ہیں۔

آپ کو یہ فکر ہے کہ اس کا انجام بھٹو جیسا نہ ہو۔ میرے محترم! بھٹو کا انجام معلوم ہے ایسا کیوں ہوا تھا کہ وہ پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں ہر امریکی ڈکٹیشن اور دھمکی کو جوتے کی نوک پر رکھتا تھا، اور پھر اسی جرم کی پاداش میں ضیا کو بھی فضا

میں اڑا دیا گیا۔لہٰذا اب اگر ترکی میں اپنے ملک کے تحفظ، بہتری اور اسلام پسندوں پر خونچکاں جبر کا راستہ بند کرنے کے لیے اردگان ہر امریکی ڈکٹیشن کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے صفائی کا ایک ملک گیر پروگرام روبہ عمل لایا ہے تو وہ عین ایک درست اور فطری راستے پر ہے۔اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ ہمارے پاس درست یا غلط صرف راستہ منتخب کرنے کی چوائس ہے، رہا انجام تو اس کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔اردگان کو قدرت نے بہترین موقع دیا ہے کہ وہ شیر کی طرح جیے، ان لمحات کو اگر وہ گیدڑ کی طرح جیتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے موت کب آتی ہے اور کس طرح آتی ہے۔گیدڑ گیدڑ ہوتا ہے چاہے سو سال بھی جی لے اور چاہے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ ہی اس کی تدفین کی جائے جبکہ شیر شیر ہوتا چاہے بستر پر موت آئے چاہے بہادر شیروں کی طرح حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دے۔

ان معروضات کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ اردگان کوئی معصوم فرشتہ ہے، اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی اور یہ کہ وہ اسلام کا واقعی کوئی بہت بڑا علمبردار ہے، بالکل نہیں، ہمیں ایسی کوئی بھی غلط فہمی نہیں ہے۔ بلکہ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اردگان اگر غیر مسلم بھی ہوتا تو ظلم اور جبر سے تارتار جس قسم کا تاریخی پس منظر میں نے اس کا بیان کیا ہے، اس کے ساتھ اس سے فطرت اسی کردار کا مطالبہ کرتی جس کا مظاہرہ اس وقت وہ کر رہا ہے۔انسان کے کردار کو اس کے پورے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ پرکھنا چاہیے۔اس موقع پر اگر اردگان دو چار ہزار نامی گرامی اور طاقتور لوگوں کو پھانسیوں پر بھی لٹکا دیتا ہے تو اس کا جواز اس کے پاس موجود ہے۔ مجھے اور آپ کو اس سے اختلاف کا حق تو حاصل ہے لیکن معروضی حالات اور پس منظر و پیش منظر سے آنکھیں بند کر کے محض اعتراض کرتے چلے جانا کسی طور دانش مندی نہیں۔

دشمن کم دوست زیادہ

غلام اصغر ساجد

عجب ہے کہ جس بات پر ترک قوم، حکومت، اپوزیشن جماعتوں اور فوج میں کسی ایک کو بھی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس تاریخی لمحے کے تاریخی حالات سے اتحاد و یکجہتی کے ساتھ نبٹنے کے لیے باہم ایک ہو چکے ہیں، اسی معاملے پر باہر والے گہری تشویش کا شکار ہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں صرف ایک سال کے اندر اردگان دور کا خاتمہ دیکھ رہے ہیں اور خانہ جنگی کی پیش گوئیاں فرما رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سر وہاں سے اٹھا ہے جو ہر رات اردگان حکومت کے دھڑن تختے کا خواب دیکھتے ہیں، ان کی ''حساس'' طبعیتوں نے سیاسی نجومیوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ درحقیقت ایسے منظرنامے میں جینے والے ترکی میں پچھلے کئی سالوں سے جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کا درست ادراک نہیں رکھتے۔ اگر انہیں کچھ معلوم ہے تو صدارتی محل، کرپشن الزامات، صحافیوں کی گرفتاریاں اور اب ناکام بغاوت کے بعد گرفتاریاں اور معطل سرکاری ملازمین۔

ہمیں ابتداء میں ہی کچھ باتیں سمجھ لینی چاہییں:

اولاً: اگر اردگان ایسے عناصر کو مزید ریاستی اداروں میں رکھتے ہیں تو انہیں مزید سازشوں کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ یہ بات محض اگر کی بنیاد پر نہیں کہی جا رہی بلکہ ان کی طرف سے ایک بڑا ثبوت دیا گیا ہے۔ ناکام خونی بغاوت کے بعد بدقسمتی سے وہ مزید کوئی خطرہ نہیں پالنا چاہتے، اور آج کی پریس کانفرنسز کے بعد تو اپوزیشن جماعتیں بھی نہیں چاہتیں کہ ایسے عناصر ریاستی اداروں میں پھلیں پھولیں جو نظام کے لیے دوبارہ خطرہ بن سکیں۔

دوم: ترک قوم ابھی اردگان سے بیزار نہیں ہوئی بلکہ غلطیوں کے باوجود (وہ غلطیاں نہیں جو ہم سمجھ رہے ہیں بلکہ وہ غلطیاں جو خود ترک عوام سمجھ رہی ہے، مثال کے طور پر شامی شہریت جس پر عوام نے اردگان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، مجبوراً انہیں وضاحت کرتے ہوئے مہارت فراہم کرنے کے ساتھ مشروط کر کے اس اوپن آفر کو محدود کرنا پڑا) ان کی حامیوں کی تعداد ترکی میں ہی نہیں دنیا بھر میں بڑھ رہی ہے۔ اگر ان سے کوئی بیزار ہوا ہے تو وہ ان کے مقصد سے عناد رکھنے والے ہی ہوئے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے پاس اردگان کا اپنا ہی پرانا ساتھی ہے، لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ فتح اللہ گولن 2002ء والا گولن نہیں رہا، جس کی مدد کے بغیر شاید رجب طیب اردگان نہ جیت پاتے۔ اب فتح اللہ گولن 2016ء کا گولن ہے جو امریکی ریاست پینسلوانیا میں رہتا ہے۔ دنیا میں اس کا نیٹ ورک اگرچہ مضبوط سمجھا جاتا ہے لیکن ترکی میں وہ اپنی مقبولیت کھو چکا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ وہ اپنے اثر سے فوجی بغاوت کامیاب نہیں کروا سکا بلکہ ترک قوم کی نگاہ میں مزید ناپسندیدہ ہو چکا ہے۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اردگان نے اس کی مخالفت کے باوجود کئی ریفرنڈم اور انتخابات جیتے ہیں، حالیہ انتخابات میں جس میں ایک مرحلے پر ان کے ووٹوں کا تناسب کم ہوا تب بھی وہ عددی لحاظ سے اپنے سابقہ ووٹوں سے زیادہ

ووٹ لے چکے تھے۔ ہمارے ہاں یہ عمومی تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ اردگان باغیوں کو پھانسی پر لٹکانا چاہتا ہے لیکن یہ تاثر بھی مغربی میڈیا کے زیر اثر پیدا ہوا ہے البتہ جو احباب ترک حالات کو براہ راست مانیٹر کر رہے ہیں، وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ پھانسی کے نعرے عوام کی طرف سے اٹھ رہے ہیں۔ طوبیٰ اوزکال، سرکاریا شہر کی رہائشی ہیں اور استنبول میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں، خوش قسمتی سے ایردگان کی کٹر مخالف ہیں مگر کہتی ہیں:

''وہ رات پاگل پن کی رات تھی، ٹینکوں اور گولیوں کے بجائے آگ کے الاؤ بھی ہوتے تو لوگ اردگان کو بچانے کے لیے ان میں بھی کود جاتے، لوگ سچ میں پاگل ہو چکے ہیں، وہ سڑکوں پر بیٹھے ہیں لیکن کچھ بھی کر سکتے ہیں، میرے والد نے مجھے سرکاریا میں واپس بلا لیا ہے۔''

یہ ایک اردگان مخالف کی گواہی ہے اور حقیقت کی غماز بھی۔ اردگان جس مساوی ریاست کے خدشات کو ایک عرصے سے بیان کر رہے تھے وہ حقیقت بن کر سامنے آئے ہیں۔ یہ بغاوت کوئی راتوں رات نہیں اٹھی، 2007ء میں ایک ایسی فوجی بغاوت کا منصوبہ پکڑا گیا، 2012ء میں گولن پراسیکیوٹر کی طرف سے ایم آئی ٹی چیف کو گرفتار کر کے کرپشن تحقیقات کے لیے اردگان کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، 2013ء میں دوبارہ کرپشن کے الزامات لگا کر بڑے پیمانے پر حکمران پارٹی کے وزراء، اردگان کے بیٹے اور اردگان کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی گئی، 2014ء میں اے کے پارٹی کا انتخابی ترانہ جو رجب طیب اردگان کی آواز میں قومی ترانہ تھا اور ساتھ ایک ایسی فلم تھی جو ایسے ہی خطرات کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی تھی، ایک بڑے ٹاور پر لگے ترک جھنڈے کی رسی کوئی شخص کاٹ دیتا ہے، اردگان کی آواز ابھرتی ہے، لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور ہزاروں لوگ اس ٹاور کے ساتھ چپک کر انسانی ٹاور کے ذریعے جھنڈے کو سنبھال لیتے ہیں، یہ سیاسی بصیرت کی انتہا تھی کہ اردگان نے ایسے خطرات کے لیے قوم کو پہلے سے تیار کیا، پھر 2015ء میں

ترک انٹیلی جنس ایجنسی ایم آئی ٹی نے خطرات اور خدشات کا اظہار کیا تھا۔ یہ بغاوت کوئی اجنبی بغاوت نہیں تھی بلکہ عوام الناس اس سے آگاہ تھے، اسی لیے ایک زبردست جذباتی ردعمل دیکھنے کو ملا جس کے آگے ایک طاقتور منصوبہ بند بغاوت جسے ٹینکوں اور فضائی مدد بھی حاصل تھی، ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ اسی لیے قوم اب پھانسی کے نعرے بلند کر رہی ہے، استنبول کی مسجد فاتح میں جب شہداء کی نماز جنازہ پڑھائی گئی تو اردگان کے سامنے زبردست نعرہ بازی کی گئی کہ باغیوں کو پھانسی پر لٹکایا جائے تو اس وقت اردگان نے بڑے ذمہ دارانہ انداز سے کہا کہ جمہوریت میں عوام کی رائے سے تجاہل نہیں برتا جاتا، یہ آپ کا حق ہے اور ہم اس رائے پر پارلیمان میں بحث کریں گے۔

کل تینوں اپوزیشن جماعتوں نے وزیراعظم بن علی یلدرم سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں اور پریس کانفرنسز کیں، تینوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ اداروں کو باغی گولن عناصر سے پاک کرنا ضروری ہے اور اگر حکومتی پارٹی پارلیمنٹ میں پھانسی کی سزا بحال کرنے کی قرارداد لاتی ہے تو ہم اس کے حق میں ووٹ دیں گے۔

بظاہر پارلیمنٹ میں بیٹھی جماعتوں نے پھانسی کی بحالی کے معاملے کو اردگان اور قوم کا معاملہ بنا دیا ہے۔ غالب امکان ہے کہ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا جائے گا جس کے بارے اردگان نے کہا ہے کہ وہ اس اجلاس میں اہم فیصلے کریں گے۔

دوسری طرف 79 ملین آبادی رکھنے والا ترکی عددی اعتبار سے دنیا کی آٹھویں اور ناٹو کی دوسری بڑی فوج رکھنے والا ملک ہے جو 7 لاکھ 20 ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں جنرل/ایڈمرل کی تعداد 365 ہے، بغاوت کے الزامات میں 6000 (0.00383 فیصد) فوجیوں کو حراست میں لیا گیا ہے جس میں جنرل کی تعداد 103 (28 فیصد) ہے جن میں سے 25 پر سنجیدہ الزامات ہیں، ترک ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں اساتذہ کی تعداد 2001ء میں 5 لاکھ 78

ہزار سے زائد تھی، گولن عناصر 15000 (2.6 فیصد) کی تعداد میں محکمہ جاتی طور پر فارغ کر دیے گئے ہیں، اگرچہ اردگان کی تعلیمی اصلاحات اور معاشی ترقی کے بعد یہ تعداد زیادہ ہو چکی ہوگی۔ 21 ہزار پرائیویٹ اساتذہ کے ٹیچنگ لائسنس منسوخ کیے گئے ہیں جبکہ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے 1500 ڈینز کو استعفیٰ دینے کی تجویز دی ہے۔ ان تمام اقدامات میں قوم، حکومت، اپوزیشن جماعتوں اور فوج کی باہم اتفاق رائے سے نظام کے لیے خطرہ بننے والے عناصر کو اداروں سے علیحدہ کر کے تفتیش کی جاری ہے تو اس پر باہر کے حلقے کیوں پریشان ہیں؟ یہ عناصر ایک لمبے عرصے سے سازشوں اور بغاوتوں میں مصروف رہے ہیں اور اب ایک بڑی خونی کوشش کر بھی گزرے ہیں تو ایسے میں ان کے لیے جذبہ رحم کی اپیل کرنے والے دراصل یہ چاہتے ہیں کہ اردگان حکومت کو مسلسل تناؤ میں رکھا جائے تاکہ وہ ہدف 2023ء کو حاصل نہ کر پائیں جو دراصل ترکی تو ٹاپ ٹین میں لے جانے کا خواب ہے۔ ترک قوم اردگان کے کردار اور تاریخ سے واقف ہے کہ اگر اس نے عزم باندھا ہے تو یہ خواب تعبیر پا کر رہے گا۔ وہ اس کے لیے عملی اقدامات بھی کر رہے ہیں۔ ''دشمن کم، دوست زیادہ'' یہ ان کی تازہ خارجہ پالیسی ہے، اس کے پہلے مرحلے میں اسرائیل اور روس کے ساتھ تعلقات بحال کیے گئے، شام اور مصر اس کے اگلے، مگر مشکل مرحلے ہیں۔ درمیان میں یہ بغاوت پھوٹ پڑی لیکن ناکام ٹھہری، اب کون کم فہم اردگان کو یہ مشورہ دینا چاہتا ہے کہ جن منفی خارجی اثرات سے محفوظ بنا کر وہ اگلی منزل کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ایسے منفی اندرونی عناصر کو وہ بغاوتوں کے مواقع دیتے رہیں اور ان کو سنبھالتے رہیں!!

پنسلوانیا کا صوفی

محمد دین جوہر

ہم نے اپنے گزشتہ مضمون میں ترک فوجی بغاوت کو ایک ایسے تناظر میں زیر بحث لانے کی کوشش کی تھی، جو ہمارے ہاں مسلسل نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں جس طرح کی بے چینی اور ردعمل سامنے آیا وہ ناچیز کے لیے غیر متوقع نہیں تھا، کیونکہ وہ ہمارے ہاں معمول ہے۔ یہاں تو زیادہ تر لوگوں کی رائے میں یہ اردگان کا اپنا رچایا ہوا ایک ڈرامہ ہی تھا۔ اکثر اسے نہایت استہزائی انداز میں زیر بحث لایا گیا اور اس واقعے کو یہاں کے غیر متعلق حالات پر منطبق کرنے کی بھونڈی کوشش بھی کی گئی۔ ہاں اگر اسے نو گیارہ کے فوراً بعد پیدا ہونے والے یہاں کے حالات پر منطبق کیا جاتا تو بات سمجھ میں آتی تھی۔ اس مضمون کا مقصد اردگان کو اسلام کا ہیرو بنا کے پیش کرنا بھی نہیں تھا۔ بس اپنی نارسائی کو دیکھنے کی ایک سعی ضرور تھی۔ ضمناً عرض ہے کہ جب قومی ذہن کی حالت انکار اس قدر گہری ہو تو اس کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا۔

دوسری طرف فتح اللہ گولن کو "بدترین غدار" کہنے پر بھی، اور ہم اسے بجا طور پر یہی سمجھتے ہیں، کچھ دوستوں نے ناگواری محسوس کی۔ ہمیں حزمت تحریک کی خدمات، اس کے بانی کی زندگی، اس کے علمی کام اور اردگان سے اس کے سیاسی اشتراک کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ وہ تہجد گزار، راسخ العقیدہ دیندار اور پکا صوفی ہے اور اس کی تحریک نے سماجی خدمت کے بڑے بڑے اور حیرت انگیز کام سرانجام دیے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس وقت ایک ارب پتی آدمی ہے اور نہایت "سادگی" کی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ 2013ء میں اردگان کے ساتھ اس کے سیاسی اختلاف کی بنیادی وجوہات دو تھیں: ایک اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی، اور دوسرے شامی مہاجرین کو ترکی آنے کی اجازت۔ وہ اسرائیل سے ہر شرط پر تعلقات کو باقی رکھنا چاہتا تھا، اور شامی مہاجرین کی ترکی آمد کے سخت خلاف تھا کیونکہ یہ مہاجرین یورپ اور امریکا کے لیے مسائل کا باعث بن رہے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مغربی سیکولرزم کا زبردست حامی ہے اور اس کی تعلیمی تحریک سی آئی اے کے لیے دنیا بھر میں ایک آڑ کے طور استعمال ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردگان کے اقتدار میں آنے سے پہلے سے دنیا کے کئی ملکوں میں اس پر پابندی ہے یا اس کے خلاف تحقیقات کی گئی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک ڈچ قانونی فرم نے اس کی تحریک کے بارے میں سی این این امریکا پر جو معلومات جاری کی ہیں، وہ نہایت چشم کشا ہیں۔ اور جب ہالینڈ میں اس پر پابندی لگائی گئی تو وہاں کی خفیہ ایجنسی کے محض ایما پر یہ پابندی ختم کی گئی تھی۔ اگر ہمیں خوش فہمی ہے کہ ایسا مسلمان "بدترین غدار" نہیں ہو سکتا تو ہمیں اپنی انسانی بصیرت کو از سرِ نو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں اجتماعی امور، قومی بقا میں اول اہمیت رکھتے ہیں اور ان کو انفرادی دینداری کے تناظر میں زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

ہمارا مقصد ترکی کی فوجی بغاوت کو طاقت کے اس علاقائی اور عالمی تناظر میں دیکھنا اور یہ عرض کرنا تھا کہ مسلم ممالک اور معاشروں کی بقا کے امکانات کس تیزی سے معدوم ہورہے ہیں۔ ترک فوجی بغاوت کے سلسلے میں کچھ واقعات کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ 17 جولائی کو نیویارک ٹائمز نے امریکی وزیرخارجہ کا ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے نہایت غصے میں ترک لیبر منسٹر کے ٹی وی پر دیے گئے ایک بیان کی سخت لفظوں میں تردید کی تھی۔ ترک لیبر منسٹر کے بقول ترک فوجی بغاوت نہ صرف امریکی منصوبہ تھا، بلکہ اس کی براہ راست نگرانی بھی امریکا ہی نے کی تھی۔ 18 جولائی کو واشنگٹن پوسٹ نے امریکی وزیرخارجہ کا ایک بیان شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ فوجی بغاوت کے بعد کی جانے والی داخلی کارروائیوں کی وجہ سے ترکی کی نیٹو ممبرشپ خطرے میں ہے۔ اگرچہ بعد میں اس بیان کی تردید بھی سامنے آئی لیکن یہ کوئی معمولی بیان نہیں تھا۔

ہمارے خیال میں یہ امر نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ روس کے خلاف نیٹو کی ممبرشپ بڑھانے کے لیے امریکا نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے اور ترکی اس کے اہم ترین ممبران میں سے ہے۔ اہم تر یہ ہے کہ ایسا کیا ہوا ہے کہ بات ترکی کی نیٹو ممبرشپ تک جا پہنچی ہے؟ گزارش ہے کہ ان واقعات کے پیچھے اصل کہانی کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ فوجی بغاوت کے فوراً بعد ترک امریکی تعلقات ایک دم شدید ترین تناؤ کا کیوں شکار ہو گئے ہیں؟ ہمارے لیے نیٹو کی ترک ممبرشپ کا معاملہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ کیونکہ نیٹو ممالک بھارت کو میزائل سسٹم میں شمولیت کی پیشکش پہلے ہی کرچکے ہیں اور ترک فوجی بغاوت اور ترکی کے نیٹو سے اخراج کے بعد اس امر کا قوی امکان ہے کہ بھارت نیٹو کا مکمل ممبر بن جائے۔ ہم احباب کی ناراضگی کے باوجود صرف یہ عرض کرنا چاہ رہے ہیں کہ ترکی فوجی بغاوت اپنے نتائج میں ہماری قومی سلامتی پر بھی براہ راست اثرانداز ہوسکتی ہے۔ اس بغاوت کا ایک بڑا مقصد روس اور ترکی

کے تعلقات میں پیش رفت کو روکنا تھا جو علاقے میں بڑی تبدیلیوں کا عندیہ دے رہی تھی۔

گزارش ہے کہ ترکی وقت کے مطابق رات ساڑھے دس بجے جب بغاوت شروع ہوئی، تو ابتدائی مرحلوں میں باغیوں کو برتری حاصل تھی۔ اس بغاوت کا مرکز دراصل ترک فضائیہ تھی، لیکن وہ بھی منقسم ہو چکی تھی۔ مرمارا سے استنبول آتے ہوئے اردگان کے طیارے پر دو ایف سولہ طیاروں نے حملہ کیا جو اس کے ساتھ محو پرواز دو حامی ایف سولہ طیاروں نے پسپا کر دیا اور دوسری اطلاع یہ ہے کہ اس طیارے نے یہ بتایا کہ یہ ایک عام ایئر لائنر ہے۔ بہر حال رات کے تقریباً ڈھائی بجے جب باغیوں کے پاؤں اکھڑنا شروع ہوئے تو ترک حکومت نے پہلے اور فوری اقدام کے طور پر انقرہ اور انسرلک کے ہوائی اڈے پر نو فلائی زون کا اعلان کیا اور ساتھ ہی امریکا کو بھی مطلع کر دیا کہ اگر کوئی طیارہ اس اہم ہوائی اڈے میں داخل ہوا یا وہاں سے اڑا تو اسے مار گرایا جائے گا۔ ترک حکومت نے اس نو فلائی زون کو حامی فضائیہ اور حامی فوج کی مدد سے باقاعدہ نافذ کر دیا۔ اس اعلان کی خاص اہمیت ہے۔ یاد رہے کہ عدنہ شہر کے پاس واقع انسرلک نیٹو کے اہم ترین ہوائی اڈوں میں سے ہے اور وہاں موجود ایٹمی ہتھیار پورے یورپ کے کسی بھی دوسرے اڈے سے زیادہ ہیں۔ یہ وہ رپورٹیں ہیں جو عالمی میڈیا میں بڑے پیمانے پر شائع ہوئی ہیں، اور ترک حکومت کے بیانات اور ترکی پریس میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

لیکن 17 جولائی کو سی این این امریکا کی رپورٹ کے مطابق اصل کہانی اگلے روز یعنی 16 جولائی کو شروع ہوئی۔ اس کی اطلاع کے مطابق، ترک حکومت نے امریکا سے اڈے میں جانے اور وہاں باغیوں کو تلاش کرنیکی اجازت طلب کی۔ امریکا نے یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن ترک حکومت نے نہ صرف اس انکار کو مسترد کر دیا، بلکہ اس کے جواب میں ترک خصوصی دستوں نے اس ہوائی اڈے کو گھیرے میں لے لیا، اور امریکی اجازت کے بغیر اڈے میں داخل

ہو گئے۔ اس وقت اڈے پر ترک فضائیہ کے دو ایف سولہ طیارے موجود تھے جو کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے تھے۔ اڈے کی تلاشی کے بعد وہاں سے ایک ترک جرنیل اور ترک فضائیہ کے گیارہ پائلٹ دستیاب ہوئے، جنہیں وہاں کے خفیہ خانوں میں باقاعدہ چھپایا گیا تھا۔ ترک فوج نے ان باغیوں کو گرفتار کر کے اپنی حراست میں لے لیا اور اب استنبول لا کر ان کی تفتیش کی جارہی ہے۔ ترک فضائیہ کے باغی طیاروں کی مڈ ایئر ری فیولنگ کا پورا انتظام بھی امریکا کے زیر کنٹرول اور زیر استعمال اسی ہوائی اڈے سے کیا گیا تھا۔ یہ وہ رپورٹ ہے جو سی این این امریکا نے جاری کی ہے۔ سی این این امریکا کی اس رپورٹ کے بعد، جو ایک طرح کا غیر سرکاری اعتراف ہے، اب اور کیا تجزیہ باقی رہ جاتا ہے؟ ترک امریکی تعلقات میں شدید ترین بحران اسی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ ترکوں نے ''ثبوت'' دینے میں کوئی کسر باقی ہی نہیں رکھی اور امریکا کو یہ بات بہت بری لگی ہے۔ پاکستانی تو بیچارے چپ کر جاتے ہیں لیکن اردگان چپ نہیں رہا۔ اس بغاوت کی اصل نوعیت ترکی پر براہ راست استعماری حملے جیسی ہے۔ واضح رہے کہ فوجی بغاوت کی ناکامی کے فوراً بعد ترک امریکا تعلقات اب تک کے سب سے بڑے بحران کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور یہ بحران ترکی کی سلامتی کے لیے از حد تشویشناک امکانات کا حامل ہے۔ یہاں مسئلہ اردگان کا نہیں ہے، بلکہ ترکی کی سالمیت کا ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہوا ہے، ہم اسے changeregime کی ایک ناکام کوشش سمجھتے ہیں، جو ضروری نہیں کہ دوبارہ نہ دہرائی جائے۔ اس ناکام فوجی بغاوت کے جو ممکنہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، وہ ترکی کی ملکی سلامتی اور یورپ اور مشرق وسطیٰ میں طاقت کے توازن پر بھی براہ راست اثر انداز ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ ہم پاکستانی چیزوں کو جس تناظر میں دیکھتے ہیں، اس میں ایسی رپورٹس کی

بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہماری غیر سنجیدگی میں اگر پوری بغاوت ڈرامہ ہوسکتی ہے، تو ان رپورٹوں کی کیا معنویت ہوسکتی ہے؟ ہمارے نزدیک "ہاتھی" کو "دیکھنے" کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آنکھیں بند کرلی جائیں اور اسے ٹٹول کر دیکھا جائے کیونکہ اس طرح تسلی زیادہ ہوتی ہے، اور آنکھوں سے دیکھنا ہمارے لیے باعثِ عار ہے۔ اگر ہمارا کوئی صحافی اس وقت ترک امریکا تعلقات میں شدید ترین کشیدگی کی واقعاتی صورت حال ہی کو دیکھ لے اور اس کا تجزیہ سیاسی طاقت کے موجودہ تناظر میں سامنے لے آئے تو ساری صورت حال بالکل پانی ہوجاتی ہے۔ لیکن کوئی بھلا یہ کیوں کرے؟ ڈرتے ڈرتے عرض ہے کہ عالمی طاقت کو زیر بحث لاتے ہوئے جو نظری پہلو اور فکری تناظر دنیا بھر میں معروف ہیں، ہمارے ہاں اگر کوئی اس کا ذکر بھی کردے، تو لوگ اسے ذاتی ہتک شمار کرتے ہیں۔ اور کوئی بات کسی کی "سمجھ" سے تھوڑی سی ادھر ادھر ہوجائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ طاقت کے نظام کی اپنی ایک حرکیات ہوتی ہے جس میں نظریات، پالیسیاں اور واقعات یکساں اہمیت رکھتے ہیں، اور جن کے پیچھے تاریخ کو دیکھنے کا کوئی نہ کوئی خاص نقطۂ نظر بھی موجود ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ صحافت کا مقصد معلومات اور تفریح فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ طاقت کے عالمی اور علاقائی نظام کا علمی اور فکری تجزیہ کرنا بھی ہے۔ بہر حال ہمارے تجزیے سے جن دوستوں کی دل آزاری ہوئی، ہم ان سے معذرت خواہ ہیں کیونکہ ہم دیانت داری سے اور حلفاً ان سب کو اپنے سے بہتر انسان اور عزت میں بڑا سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ اگر ہم نے متفقہ طور پر قومی حالت انکار ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے تو کم از کم ناچیز اس کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں۔

پاکستان اور ترکی ساتھ ساتھ

انٹرویو: ڈاکٹر ندیم احمد خان

خبیب فاؤنڈیشن پاکستان کی واحد تنظیم ہے، جس نے 16 جولائی کو ترکی میں ناکام فوجی انقلاب کے خلاف اسلام آباد میں مظاہرہ کیا۔ یہ پاکستان میں ہونے والا اب تک واحد مظاہرہ ہے، جو طیب اردگان اور ان کی حکومت کے حق میں پاکستان میں کیا گیا ہے۔ خبیب فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ندیم احمد خان صاحب نے ترکی کی فلاحی تنظیم آئی ایچ ایچ (انسانی یاردم وقفی) کے اشتراک سے پاکستان میں کئی فلاحی کام کیے ہیں۔ اسی تنظیم کے تحت وہ ترکی سے غزہ کے مظلوم فلسطینیوں کی مدد کرنے کے لیے فلسطین "فریڈم فلوٹیلا" لے کر پہنچے تھے۔ ترکی سے وہ مسلسل رابطے میں ہیں اور تازہ ترین صورتحال سے واقف ہیں۔ "امت" نے ان سے ترکی کی موجودہ صورتحال پر گفتگو کی، جو نذر قارئین ہے۔

س: پاکستانی میڈیا آج یہ سوال کر رہا ہے کہ ترکی میں باغیوں کو پھانسی دینے کا اعلان کیوں کیا جا رہا ہے۔ کیا ترک حکومت اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو پھانسی دے سکے گی؟ نیز یہ کہ اس

ساری صورتحال سے پاکستان کیا سبق حاصل کرسکتا ہے؟

ج: ترکی میں جن لوگوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی، انہیں آستین کے سانپ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ یہ لوگ ریاست ترکی کے خلاف سازش کررہے تھے۔ بالکل ایسی ہی صورتحال پاکستان میں ہے۔ جولوگ ریاست پاکستان کے خلاف سازشیں کررہے ہیں، ان کے خلاف قبائلی علاقوں میں ضرب عضب اور بلوچستان اور کراچی میں آپریشن کیے جارہے ہیں۔ ہماری وہ توانائی جو ملک کی ترقی کے لیے استعمال ہونی چاہیے تھی، وہ ریاست کے دشمنوں سے لڑنے میں صرف ہورہی ہے۔ پاکستان میں متحدہ قومی موومنٹ کے سربراہ لندن میں بیٹھ کر جمہوریت کے نام پر ایک مافیا کی شکل میں کام کررہے ہیں۔ انہوں نے بھی میڈیا کو اپنے پیغامات پہنچانے کا ذریعہ بنایا۔ بالکل اسی طرح فتح اللہ گولن نے امریکہ میں بیٹھ کر اس سازش کو انجام دیا۔ یہ ریاست کے خلاف سازش ہے۔ ہم شاید یہ سازش برداشت کرلیں، لیکن ترک قوم اس سازش کو برداشت نہیں کرسکتی۔ پاکستان نے بھی تو بعض سیاسی رہنماؤں کی تقریروں پر اسی لیے پابندی لگائی ہے کہ وہ ریاست کے استحکام کے خلاف ہیں اور ان کا پاکستان کے دشمن ملک کے ساتھ رابطہ ثابت ہوگیا ہے۔ پاکستان میں ملک دشمنوں سے نمٹنے کے لیے فوجی عدالتیں قائم کی گئی ہیں۔ پھانسیوں پر اسی لیے عملدرآمد کیا جارہا ہے۔ ترکی میں اس سے زیادہ خطرناک صورتحال ہے، جو دنیا کے سامنے ہے کہ وہاں ایک عالمی سازش ہوئی ہے اور اس سازش میں ترکی کے اپنے ہی آستین کے سانپ شامل ہیں۔ اسی لیے گولن کے میڈیا اور اس کے صحافیوں پر پابندی لگائی گئی ہے۔ ترک فوج کے 6 4 فوجی ہیلی کاپٹر، 6 جیٹ طیارے اور ایک بحری جنگی جہاز غائب ہے اور ابھی تک ان کا سراغ نہیں مل رہا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ ان جیٹ طیاروں میں ایف سولہ بھی شامل ہیں۔ سیٹلائٹ سسٹم بھی ان کو تلاش نہیں کرپارہا ہے۔ ایک بات اور بھی معلوم ہوئی کہ جن پولیس

والوں کو گولن کے ساتھ شامل ہونے کی وجہ سے پولیس سے نکال دیا گیا تھا، وہ برطرف پولیس والے ہی فوجی ٹینک چلاتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ 3 ہزار ججوں کو بھی گولن کی جماعت کے ساتھ تعلق کی بنا پر برطرف کیا گیا ہے۔ ان میں سپریم کورٹ کے دو جج بھی شامل ہیں۔ گولن گروپ نے اپنا انتظام مکمل کر رکھا تھا، تا کہ ملک عدم استحکام کا شکار ہو اور ان کا گروپ بہ آسانی اقتدار پر قبضہ کر سکے۔ وہ فوجی اور سابق پولیس والے جنہوں نے اس سازش میں حصہ لیا، آپ ہی بتائیں کہ کس سزا کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ترک صدر کو قتل کرنے کی سازش کی۔ عوام پر گولیاں برسائیں اور ترک عوام بڑی تعداد میں شہید ہوئے۔ پاکستان اس وقت ایسی صورتحال سے دوچار نہیں۔ وہ لوگ اس وقت درس انسانیت پڑھا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ وہ جو فوج کی وردی پہن کر لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ اگر ان پر مقدمہ چلے تو گولن کے حامی جج ان کو رہا کر دیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

س: عوام کیوں اردگان میں سامنے آئے اور اس قدر شدید ردعمل دیا کہ باغیوں کو روکنے کے لیے ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے۔ اس کی وجہ اقتصادی ہے یا سیاسی؟

ج: عوام اپنے لیڈروں کے ساتھ دو وجوہات کی بنا پر ان کے حق میں سڑکوں پر آتے ہیں۔ نظریاتی اور اقتصادی۔ طیب اردگان کے معاملے میں عوام کی اکثریت ان کے ساتھ نظریاتی تعلق کی بنا پر سڑکوں پر آئی ہے۔ اس نظریاتی تعلق کی مزید تقسیم کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام ترکی اور اس کی جمہوریت کو بچانے کے لیے میدان میں آئے ہیں۔ ان لوگوں میں صرف ترکی کی حکمران A K پارٹی ہی نہیں، بلکہ سیاسی جماعتیں جن میں CHP، اور ایم ایچ پی اور کردوں کی ایبولک سرلک پارٹی بھی سڑک پر نکل آئی۔ اردگان کی سابق جماعت سعادت پارٹی بھی اس فوجی بغاوت کے خلاف نکل کر آئی۔ یہ ترک نیشنل ازم کی بہترین مثال ہے۔ ترک قوم کی شرح خواندگی 3.98

فیصد بتائی جاتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی شرح خواندگی 100 فیصد ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس سازش کے پس پردہ کون ہے؟ سازشیں پہلے سے جاری تھیں۔ وہ پائلٹ جس نے روس کا جہاز گرایا تھا، اس نے جہاز گرانے کے لیے ترک حکومت یا ایرفورس کے سربراہ یا کسی اور ذمہ دار کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا، بلکہ گولن کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ترک صدر کو روس سے معافی مانگنی پڑی۔ دونوں ملکوں کے تعلقات میں تلخی آ گئی۔ یہ کس کی خواہش ہو سکتی ہے، ساری دنیا جانتی ہے۔ کیونکہ امریکی ائربیس سے ہی ہیلی کاپٹرز کے ایندھن کی ریفیولنگ ہو رہی تھی۔ یہ بین الاقوامی سازش نہیں تو اور کیا ہے کہ ترکی کے اسٹریٹیجک اثاثے لاپتہ ہیں۔ ترک حکومت کے لیے مشکل ترین دور ہے، انہیں مشکل فیصلے کرنے ہیں۔ پاکستان کے عوام اور حکومت دونوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

س: فتح اللہ گولن تو مختلف ملکوں میں فلاحی کام کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی ان کی تنظیم صحت اور تعلیم کے شعبے میں کام کر رہی ہے۔ ان کی کتابیں بھی اردو میں ترجمہ ہو رہی ہیں؟ ان کا اگر اردگان کے ساتھ سیاسی اختلاف ہے تو یہ سازش کیسے ہو گئی؟

ج: اردگان نہیں بلکہ تانسوچلر کے انٹیلی جنس چیف اور ترکی کے قومی سراغ رساں ادارے کے سابق سربراہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ فتح اللہ گولن کی ہزمت تحریک سی آئی اے کی ایک کور تنظیم ہے، جس نے 1990ء کی دہائی میں سی آئی اے کے 130 اہلکاروں کا ازبکستان اور کرغیزستان میں اساتذہ کے روپ میں تقرر کیا۔ بعد میں روس نے فتح اللہ گولن کے سی آئی اے سے رابطوں کا بھید کھلنے کے بعد روس سے انہیں نکال دیا تھا۔ جبکہ سات وسطی ایشائی ممالک میں بھی ان کی تنظیم کو نکال باہر کیا گیا۔ اب وہاں اس پر پابندی ہے۔ دراصل ان کا کام ایسا ہی ہے، جس طرح عیسائی مشنری کام کرتی ہے کہ لوگوں کی فلاح کے بدلے ان کا ایمان خریدتی

ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، وہ انسانیت کی خدمت کا درس دیتا ہے، لیکن تبلیغ اور فلاحی کاموں کا گوشہ الگ الگ ہوتا ہے۔ انسانیت کی خدمت بلاتخصیص ہوتی ہے۔ گولن کی طرح اپنے نظریات ٹھونسنے کے لئے نہیں ہوتی۔ فتح اللہ گولن کوئی سیاسی آدمی نہیں وہ تو متحدہ قومی موومنٹ کی طرح ایک مافیا ہے۔ آپ سوچیں جیسے سیودی چلڈرن نے پاکستان کو ایبٹ آباد جیسے شرمناک واقعے سے دوچار کروایا اور ڈاکٹر شکیل آفریدی جیسے غدار کو پیدا کیا۔ آج کل دنیا میں انٹیلی جنس ایجنسیاں این جی اوز کے بہروپ میں کام کرتی ہیں۔ پاکستان میں بھی گولن کے ادارے سی آئی اے کے لئے کام کررہے ہیں۔ پاکستان میں ان کے اسکول کیا مفت میں تعلیم دیتے ہیں؟ ان کی فیسیں تو کوئی عام شہری برداشت ہی نہیں کرسکتا۔ یہ اپنے اسٹوڈنٹس کے والدین کے عہدے دیکھتے ہیں اور پھر ان کو اپنے خرچ پر ترکی کی سیر کراتے ہیں۔ اس میں کہیں اسلام کا ذکر نہیں ہوتا۔ وہ باثر والدین پھر گولن کی تنظیم کے لئے اچھا سرمایہ ثابت ہوتے ہیں۔ پاکستان میں گولن کا ٹیلی ویژن SEE TV کے نام سے کام کررہا ہے۔ اس میں کہیں بھی اسلام کا درس نہیں ہے۔ پاکستان کو ہوشیار ہونا چاہیے کہ یہ اپنے ملک کے نہیں بنے تو پاکستان کے کیسے وفادار ثابت ہوں گے؟ فتح اللہ گولن کا سعید نورسی سے اب کوئی روحانی یا قلبی تعلق نہیں ہے۔ اس نے صرف بدیع الزماں نورسی کا نام استعمال کیا ہے۔ سعید نورسی کے اصل وارث سعید نوری ہیں، جن کی نوری جماعت ترکی میں زیادہ بڑا کام کررہی ہے اور مولانا روم کی تعلیمات سے بھی فتح اللہ گولن کوسوں دور ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ امت کراچی)

مختصر فوری درخواست بنامِ جناب اردگان

مؤلف : نامعلوم

عالی مقام والاشان جناب اردگان

جناب عالی

مؤدبانہ گزارش ہے کہ ترکی کے داخلی حالات کی وجہ سے آنجناب آج کل بہت مصروف ہیں، لیکن چند انتہائی ضروری معروضات پر غور کے لیے آپ کا تھوڑا سا قیمتی وقت درکار ہے۔ جناب کے الطاف عمیم سے امیدوار ہوں کہ فدوی کو مایوس نہیں فرمائیں گے۔

گزارش ہے کہ عظیم پیشوا اور متبحر عالم عزت مآب فتح اللہ گولن مدظلہ العالی نے، ترکی میں جو خون خرابہ ہوا، اس پر اپنے پہلے الہامی فرمان میں اسے ''آپ کا اپنا رچایا ہوا ڈرامہ'' قرار دیا ہے۔ معاً بعد دنیا کے واحد حق گو میڈیا نے، ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف مغربی میڈیا ہی ہوتا ہے، اس کی فوری تصدیق فرمائی ہے۔ پاکستان میں بھی ترکی سے محبت رکھنے والے لوگ اس خون

خرابے کو بھول کر اس عظیم پیشوا کے فرمان کو ہی اہم سمجھتے ہیں۔لیکن کچھ نا ہنجاز ابھی بھی متردد ہیں، حالانکہ حق پرست مغربی میڈیا نے اس الہام واجب الاذعان کے درست ہونے کی گواہی دے دی ہے اور اسے چار دانگ عالم میں مشتہر بھی کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں ترکی کی سالمیت، ترک جمہوریت اور عوام کی جانوں کا ضیاع ایک بالکل معمولی اور ضمنی مسئلہ ہے جسے خاکم بدہن آپ غیر ضروری اہمیت دے کر خواہ مخواہ الجھا رہے ہیں۔ دنیا کی کمزور قوموں اور مسلمانوں کے ساتھ یہ روز کا معمول تھا۔ خاکم بدہن! آپ نے معمول میں خلل ڈال کے ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔ آنجناب سے گزارش ہے کہ اپنے محترم سفیر کو ہدایت جاری فرمائیں تاکہ وہ یہاں ایک بیان دے دیں کہ یہ معمول میں خلل نہیں تھا بلکہ آپ کا اپنا رچایا ہوا ڈرامہ ہی تھا تاکہ ہماری پریشانی ختم ہو۔ بھائی چارے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ترکوں کی وجہ سے ہمیں پریشانی ہو کیونکہ ہمیں اور بہت کام ہیں۔ ہم آپ کے سفیر محترم کے بیان کی ایک کاپی عالی مقام سیسی کو خود ہی بھجوا دیں گے، اس کی فکر نہ فرمائیں۔ اس معاملے میں ذرا جلدی کی التجا ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ نیٹو کے ساتھ وابستہ ترک فوج کی جن بٹالینوں اور دیگر فوجیوں نے اس مسئلے میں شاندار کردار ادا کیا ہے، وہ ٹینکوں میں سوار سرِ شام سیر سپاٹے کے لیے باہر نکلے تھے۔ وہ اصل میں باسفورس کے نئے پل اور آپ کے ''ذاتی'' نئے محل کی سیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ عظیم پیشوا اور متبحر عالم اپنی صلاح مشورے کی مصروفیت اور صحت کی وجہ سے ابھی ترکی نہیں آسکتے، اور دونوں نئی جگہوں کی تصویریں ان کو وٹس ایپ کرنی تھیں کیونکہ یہ ان کے جانے کے بعد بنی تھیں۔ خاکم بدہن! آپ کان کے انتہائی کچے واقع ہوئے ہیں اور لگائی بجھائی میں آ کر ان کو باغی سمجھ لیا، حالانکہ مغربی میڈیا نے بتایا ہے کہ وہ ترکی میں ''جمہوریت'' کو فروغ دینے کی خوش خرامی پر تھے۔ واللہ! پتہ نہیں آپ کیوں کسی کی بات نہیں مانتے۔ حیرت ہے کہ آپ کو یہ

چھوٹی سی بات سمجھنے میں غلطی لگی حالانکہ پہلے سے یہاں اڑی ہوئی ہے کہ آپ بہت سمجھدار ہیں۔
یہ ''جمہوریت'' دراصل پنسلوانیائی سلوک کی نئی مشق ہے جو ٹینکوں پر بیٹھ کر کی جاتی ہے۔اس مشق کے دوران عوام کو گھر بیٹھ کر وظیفہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ان کی غلطی ہے کہ باہر نکلے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس غلطی کی وجہ سے ان کو پس مرگ سزا دلوانی چاہیے۔لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں، ایسی مکھیاں روز مرتی رہتی ہیں۔ گزارش ہے کہ ایف سولہ میں بیٹھ کر سیر آفاق کرنے والوں کو آپ معاف فرمادیں، کیونکہ لڑائی اچھی نہیں ہوتی، دونوں کا نقصان ہوتا ہے اور بندہ خواہ مخواہ گناہگار بھی ہوتا ہے۔ان سب کو اعلی اعزاز کے ساتھ نوکریوں پر بحال کردیں اور نئے صدارتی محل کو اس عظیم پیشوا کا زاویہ (خانقاہ) بنادیں تاکہ اوباما اور مرکل وغیرہ کو وہاں وعظ کے لیے بلایا جاسکے۔ ان دونوں کا وعظ نہایت سریع الاثر ہے، اور شفائے تامہ رکھتا ہے۔اس اچھے رویے پر آپ یقیناً عنداللہ ماجور ہوں گے۔اگر ہمارے ہاں سے بھی کچھ واعظ بلا لیے جائیں تو ثقافتی اور تہذیبی بوقلمونی پیدا ہو جائے گی اور آپ کے درجات انتہائی بلند ہو جائیں گے۔ثواب کا کام کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے،لیکن ساتھ ساتھ آپ کو فوری توبہ کے بارے میں بھی غور کرنا چاہیے۔

تیسری گزارش ہے کہ نیٹو اور جدید پنسلوانیائی تصوف کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ترکی کی سیاست اور عوام سے تو بالکل ہی کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات سمجھنے کی جلد از جلد کوشش کریں کہ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔ واللہ! یہ درخواست گزار آپ کا والہانہ بھی خواہ ہے، یہ مشورہ صرف آپ کے فائدے کے لیے ہے۔اگر سمجھ نہیں آتی تو عظیم پیشوا اور متبحر عالم کے کسی ٹیوشن سینٹر میں داخلہ لے کر تیاری کرلیں اور پھر اس کے کسی اسکول سے سند بھی لے لیں۔ کیونکہ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ آپ پاکستان آرہے ہیں۔ حضور! یاد رہے کہ آج کل یہاں ڈگری کی بڑی سختی ہے۔آپ

اتنے بڑے سیاست دان بن گئے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ نیٹو ایک گولف کلب ہے اور اس نے گولف کو جس طرح فروغ دیا ہے، اس کی اصل اہمیت کا اندازہ صرف روس کو ہوا ہے یا ہمارے ہاں کچھ تجزیہ نگاروں کو ہوا ہے۔ باقی لوگوں نے اس کی بڑی ناقدری کی ہے۔ آپ کو بھی اسی ناقدری کی وجہ سے چین نصیب نہیں ہوا اور نہ لگتا ہے کہ ہوگا۔ عظیم پیشوا اور متبحر عالم نے جس طرح امیر طبقے میں تعلیم کو فروغ دیا ہے، وہ ترکی کی ترقی کے لیے زیادہ اہم ہے، بلکہ صرف وہی اہم ہے اور اعلیٰ نوکریوں میں آ کر خفیہ منصوبے سے اقتدار پر قبضہ کرنا ان کا پیدائشی حق ہے اور وہ انعام واکرام کے سزاوار بھی ہیں۔ آپ نے ٹٹ پونجیا، کٹ کھنی اور چیڑ قنات عوام کے ووٹوں سے اقتدار پر قبضہ کیا ہوا ہے جو جمہوریت کے مبادی کے بالکل خلاف ہے۔ یہ تو کھلا تضاد ہے۔ حق گو مغرب نے صاف کہہ دیا ہے کہ آپ بھی مرسی کی طرح آمر بن گئے ہیں، جبکہ انہیں سیسی جیسے آمر کی فوری ضرورت ہے۔ آپ نے اچھے خاصے پروگرام میں کھنڈت ڈال دی ہے۔ آپ کو گولف کے مزید فروغ اور اشرافیائی تعلیم کے لیے پنسلوانیا میں ایک دفعہ ضرور حاضری دینی چاہیے۔ یہ ثواب دارین تو ہے ہی، فلاح دارین بھی یقیناً ہے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ ترکی میں کوئی سیاسی اور فوجی جھگڑا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کہ کسی دشمن نے شرارت سے اڑائی ہے۔ کچھ لوگوں نے ایسی لغویات پر یقین بھی کر لیا تھا اور فقیر بھی گمراہ ہونے لگا تھا۔ وہ تو بھلا کرے ہمارے ایک دوست چند سال قبل ترکی کی سیر کو گئے تھے، اور واپسی پر انہوں نے ایک نیا تہذیبی تناظر فراہم کیا ہے جو ہمارے ہاں نہ صرف کارآمد ہے بلکہ اسے بہت پسند بھی کیا گیا ہے۔ اگرچہ کسٹمز سے گزرتے ہوئے اس تہذیبی تناظر کو پکڑ لیا تھا لیکن منت سماجت سے چھوٹ گئے۔ شکر ہے کہ وہ ترکی جا نکلے ورنہ یہاں تو دند ہی مچی رہتی۔ انہوں نے واپس آ کر فرمایا کہ ۱۹۹۷ء میں جب آپ ازمیر گئے تھے اور نماز پڑھنے اور عظیم پیشوا

اور متبحر عالم کا وعظ سننے ان کی مسجد میں بھی گئے تھے۔ نماز کے بعد اس مسجد کے لان میں لگے درختوں سے آپ نے ایک پاؤ انجیر اور آدھ پاؤ زیتون توڑ لیے تھے۔ جب عظیم پیشوا اور متبحر عالم کو اس کی خبر ہوئی تو بات بگڑ گئی۔ آپ کو بھی چاہیے تھا کہ پہلے اس کی اجازت لیتے۔ تب سے دلوں میں فرق آ گیا۔ دلوں میں فرق آنے سے بندہ خواہ مخواہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اللہ معاف فرمائے، سنا ہے کہ آپ کو ایسے کام کرنے کی بچپن سے عادت ہے۔ ہمارے دوست بہت راست گو ہیں اور اب میں بھی انہی کی بات کو درست سمجھتا ہوں۔ اصل میں ان کا ارادہ تھا کہ وہ ازمیر جا کر ان درختوں کو دیکھ آتے تا کہ بات بالکل قطعی الدلالہ ہو جاتی، لیکن وقت کی قلت سے نہ جا سکے۔ اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ایک آدھ کلو انجیر اور زیتون واپس کر کے اس مسئلے کو حل کر دیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت جو مسئلہ ترکی میں پیدا ہو گیا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ آپ دونوں لگتا ہے کہ بھولے نہیں ہیں، بھولے ہیں۔ معاف رکھیے! پتہ نہیں آپ بھی کس طرح کے سیاستدان ہیں کہ نمازوں کا شوق بھی پالا ہوا ہے۔ صبح شام مغرب میں آپ کے خلاف ہجو، کردار کشی، آمریت، چور بازاری وغیرہ کا الزام لگتا ہے اور آپ کے تقویٰ کو تو کوئی ماننے نہیں دیتا۔ ایسے تقویٰ کا کیا کرنا جس سے امریکا ہی راضی نہ ہو۔ جبکہ عظیم پیشوا اور متبحر عالم کے تقویٰ کی گواہی تو امریکا بھی دے رہا ہے، میڈیا بھی دے رہا ہے، سی آئی اے دے رہی ہے، پورا یورپ اٹھ کھڑا ہوا، نیویارک ٹائمز دے رہا ہے، ہمارے ہاں بھی لوگ پورا زور لگائے ہوئے ہیں۔ چونکہ امریکا اور یورپ بالکل غیر جانبدار، حق گو اور اعلیٰ ترین اخلاقیات کا صالحانہ نمونہ ہیں، اس لیے آپ ہی قصوروار ٹھہرے ہیں۔ اصل تقویٰ تو اس جادو کی طرح ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ آپ اپنی مصروفیت کے وجہ سے محل سے باہر نہیں نکلتے، کسی سے پتہ کروا لیں کہ کس کا جادو کس کے سر

چڑھ کر کیا بول رہا ہے یا ہمارے ہاں سے ہی رپورٹ منگوا لیں، ان شاء اللہ شافی ہوگی۔

الحمد للہ، ثم الحمد للہ، ثم صد شکر کہ آپ کا امریکا سے بھی کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بات سن کر ہماری تو جان میں جان آئی۔ پتہ چلا ہے کہ اوباما صاحب نے بہت کھل کر آپ کی حمایت کی ہے اور بہت مشکل وقت میں آپ کی یاوری کی۔ ہمارے ہاں بعض لوگ رقت جذبات میں یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ ۱۴ جولائی سے ہی اس نے آپ کی حمایت شروع کر دی تھی۔ وہ ایف سولہ بھی آپ کی حفاظت ہی پر تعینات تھے ورنہ آپ کے مالیکیول کی دریافت کے لیے نوبل پرائز دینا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے بچ جانے پر نوبل کمیٹی میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ الحمد للہ۔ ہمارے جو دوست ترکی گئے تھے، وہ ترکی ڈرامے کے بعد واپسی کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے دوبارہ ترکی جانے کی ٹھانی لیکن ہماری بھابھی آڑے آ گئیں۔ وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی عینک ایک ہوٹل میں بھول گئی تھی۔ اسی بہانے وہ عازم سفر تحقیق ہوئے۔ ان کو عینک بھی مل گئی اور اللہ کا خاص کرم یہ ہوا کہ اب تو وہ ترکی کا پورا انسائیکلوپیڈیا بن کر آئے ہیں۔ ان کی عینک بھی اب زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اتفاق سے استنبول کے قہوہ خانوں میں کئی یورپی تحقیقی صحافیوں اور دانشوروں سے ان کی ملاقات رہی اور الحمد للہ بہت روشن دماغ لوٹے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ امریکا نے عین وقت پر آپ کی حمایت بلاوجہ نہیں کی۔ آپ کی اوباما صاحب سے دوستی تب سے ہے جب اوباما صاحب اور آنجناب اعلیٰ تعلیم کے لیے پاکستان تشریف لائے تھے تو آپ دونوں ہم جماعت اور ہم سبق تھے۔ یاد رہے کہ مواعظ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دنیا بھر سے لوگ اپنے بچوں کو چند دہائیاں قبل تک پاکستان بھیجا کرتے تھے، اب ضرورت نہیں رہی کیونکہ نیٹ پر سارے اخبار میسر ہوتے ہیں۔ ہمارے دوست کے ذرائع نے اسے یہ بھی بتایا کہ گلستان، بوستان سے فارغ ہونے کے بعد اسماعیل میرٹھی بھی آپ کو پڑھایا گیا تھا تاکہ ہمارے واعظین

کے مضامین باقاعدہ پڑھنے کی سعادت آپ کو تاعمر حاصل رہے۔ اوباما صاحب بچپن میں ذرا کمزور تھے اور جب زبانی امتحان ہوا تو آپ نے میرٹھی کی نظم فرفر سنا دی، اور وہ کچھ اٹک گئے تھے۔ اس طرح کچھ شکر رنجی پیدا ہوگئی تھی۔ اسے کافی سنجیدگی سے لیا گیا کیونکہ اصل میں یہی ایک بہت بڑا سیاسی مسئلہ تھا۔ اگر بچے یہاں کے ہوں تو ایک دھکے میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں، لیکن آپ کا اور اوبامہ صاحب کا معاملہ اور تھا۔ یہاں کے واعظین کی چشم بصیرت نے دیکھ لیا تھا کہ عنقریب تاریخ عالم آپ دونوں کی دوستی پر منحصر ہونے والی ہے۔ اس پر پاکستان کے قلم قبیلہ واعظین کی ایک کانفرنس ہوئی، جس میں کئی دن کی گفت وشنید کے بعد یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ اب عین وقت پر اوبامہ صاحب نے حق دوستی ادا کر دیا، اور آپ کی یاوری کی ہے۔ دوستی ہو تو ایسی۔ اللہ کا بڑا شکر ہے کہ یہاں کی اعلیٰ تعلیم کا رنگ آپ دونوں پر چوکھا آیا۔ آنجناب سے التماس صرف یہ ہے کہ اسی طرح کی ایک کانفرنس استنبول میں بھی منعقد کی جائے تاکہ باقی مسئلے جو رہ گئے ہیں ایک ہی دفعہ حل ہو جائیں۔ اس میں اوبامہ صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے تاکہ وہ سرشام نکلنے والوں کے سرغنہ کے لیے نوبل امن انعام کی سفارش کر سکیں۔

آنجناب کا وقت قیمتی ہے۔ اسی اجمال کو تفصیل پر محمول فرما کر جلد کارروائی فرمایئے گا۔ بھول نہ جایئے گا۔ ثواب بھی پائے گا۔ ہمارا دل بھی لبھایئے گا۔ بندے کو وفادار ہی پایئے گا۔ کسی کی باتوں میں نہ آجایئے گا۔ ہمارا شکریہ بھی قبول فرمائے گا۔

العارض

واعظِ تجزیہ نگار، سکنہ فسونِ کارساز،

ضلع میڈیائے شیریں مقالاں، خط خوش خصالاں

اے میری قوم ممکن ہے کہ میں شہید ہو جاؤں

 نظم: رجب طیب اردگان

اے میری پیاری قوم!

مجھے سب سے زیادہ محبوب

اے میری محبوب قوم!

زمین پر میرے مقصد کو طول نہ دو

کیا ملک کے پرندے تمہیں کوئی خبر نہیں سناتے؟

یہاں تمہارے شہداء کی قبروں سے بہار امڈ رہی ہے؟

جب محبوب کا ساتھ ہو تو بے جان انسان سے بھی محبت پھوٹتی ہے

اس طرح جیسے زندگی اور موت کے درمیان ایک منفرد زندگی

میں تم سے مایوس نہیں ہوں

لیکن ایک شیطانی آنکھ ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے

ہمیں پھر یہاں محبتوں بھرے گیت گانے ہیں
ہمیں کوئی پروا نہیں ہمارے مدمقابل کیا کرتے ہیں
کیونکہ کچھ چیزیں آسمان (اللہ) کی طرف سے طے شدہ ہیں
کیا ہوتا ہے جب دن ڈھل جاتا ہے؟
کوئی (اللہ) تو ہے جو رات گذارنے کے سبب پیدا کرتا ہے
ممکن ہے کہ میں اس راستے میں خاکستر (شہید) ہو جاؤں
لیکن میری خاک سے کامرانی کے قلعے تعمیر ہوں گے
کیونکہ ہر شکست کے بعد ایک فتح ہے
تمہارے پاس ہر راز (کامیابی) تک پہنچنے کی کنجی (قرآن کریم) موجود ہے
وہ تمہارے دل کی پکار ہے
جو تمہیں تمہارے ماضی (خلافت عثمانیہ) کی طرف بلاتی ہے
میں کبھی تم لوگوں سے مایوس نہیں ہوا ہوں
کیونکہ تمہارے دلوں میں جذبوں کا ایک طوفان ہے
اے میری پیاری قوم!
مجھے سب سے زیادہ محبوب
اے میری محبوب قوم!
میں تمام تعریفیں رب کے لیے خالص کرتا ہوں
میں حمد بیان کرتا ہوں اس رب کی
جس نے اس دور میں ہمیں اپنے مقصد کے لیے چنا

جس نے ہمیں حوصلہ اور جوش عطاء کیا

جس نے ہمیں صبر کی تعلیم دی

مزاحمت کا حوصلہ عطا کیا

تعریف اس کے لیے جس نے ہمیں خوبصورت اقدار بخشیں

جس نے ہمارے دلوں میں محبت بھر دی

اس ملت اور ملک کی بہتر خدمت کا موقع اور جذبہ دیا

میں اس اللہ تعالی کی طرف تمام تعریفوں کا رخ موڑتا ہوں

یہ جو کچھ میں نے بیان کیا وہ اس وجہ سے ہمیں اس سے محبت کرنا چاہیے

اس طرح ہم سب دوستوں کو سجدہ کرنا چاہیے

ہم سب کو اسی کی پیروی کرنی چاہیے

جو اس ہال میں موجود ہیں یا باہر سڑک پر دور تک بیٹھے ہیں

کہ دل کی گہرائیوں سے اس کی بہت زیادہ حمد بیان ہو جائے۔

SİMİT SATTIK
SU SATTIK
VATANI
SATMADIK
باسفورس کے کنارے
تصویری البم: بغاوت کے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد ترکی کے دین سے بے زار ہونے کے وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغربی تمدن کی اشاعت نے مشرق میں سخت کشمکش پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف قدیم افکار ہیں، دوسری طرف جدید اصول، یہی کشمکش عالم اسلام میں بھی جاری ہے۔ اس سے تین جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک جماعت قدیم سکول کی ہے جو اپنے تمام تقلیدی رسومات وخیالات پر سختی کے ساتھ جمی ہوئی ہے، کسی طرح کی لچک اور حرکت اس میں نہیں پائی جاتی۔ دوسری جماعت نئی نسل کی ہے۔ اس نے مغربی تمدن کی ہوا میں پرورش پائی ہے لیکن اسلامی تعلیم و آداب سے بہرہ ہے، وہ متعصب اور جامد علماء اور عوام الناس کے عقائد ورسوم کو ہی اسلام سمجھتی ہے اور انہیں ترقی میں مانع دیکھ کر متوحش اور مضطرب ہوگئی ہے۔ تیسری جماعت معتدل فکر و نظر کی ہے، یہ ان دونوں کناروں کے وسط میں ہے۔ یہ نہ پہلی جماعت کے طرح تقلید میں جمی ہوئی ہے، نہ دوسری کی طرح مغربی سیلاب میں بہہ گئی ہے۔ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ مغربی تمدن کی تمام خوبیاں حاصل کی جاسکتی ہیں، بغیر اس کے کہ اسلام کی حقیقی اور خالص روح کو نقصان پہنچایا جائے۔ بدقسمتی سے ترکی میں صرف پہلی دو جماعتیں پائی جاتی ہیں، تیسری جماعت مفقود ہے، میرے خیال میں ساری دقتیں اور مشکلات اسی کا نتیجہ ہیں۔'' (تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر)

▪▪▪
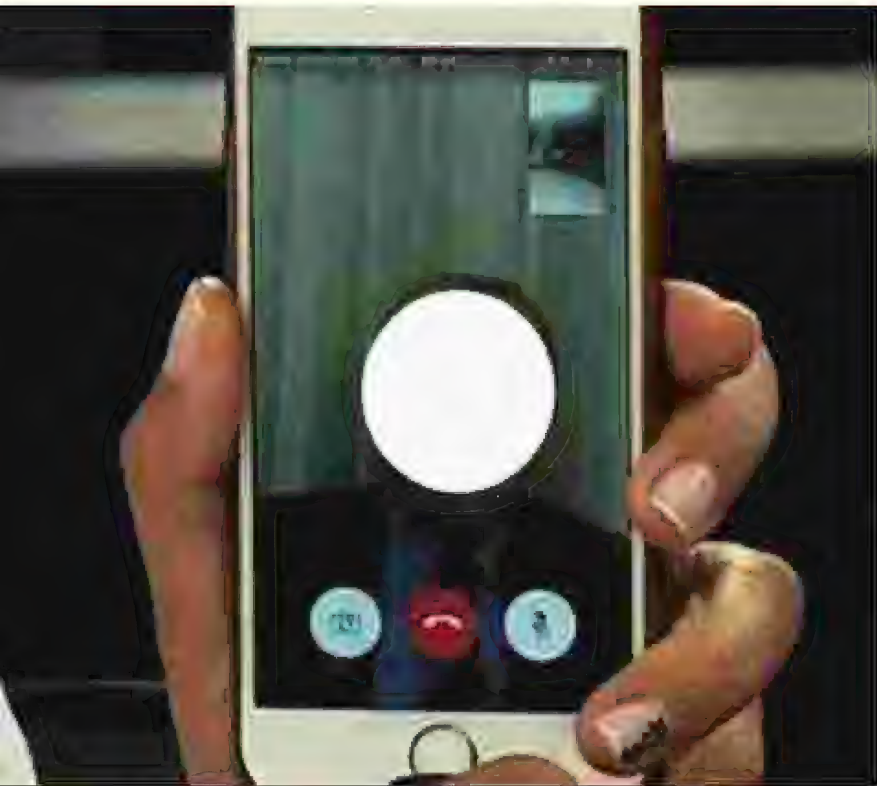
وہ تاریخی فون جس سے کی جانے والی ایک کال نے دنیا کی تاریخ میں انوکھے واقعے کا اضافہ کیا۔ اردگان کی ایک فون کال سے اسلام پسند بہادر ترک عوام سڑکوں پر نکل آئے اور دنیا کو ایک تاریخی واقعہ تحفے میں دیا۔

Daily Times

Erdo-Ğone

▪▪▪

دنیا بھر کے سیکولر میڈیا نے "غیر جانبداری" کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغاوت کے آغاز میں جو تبصرے کیے تھے اُن سے سیکولر اور لبرل حضرات کا انصاف، مساوات اور مغرب نواز میڈیا کی غیر جانبدارانہ خبر رسانی کا جو "صاف شفاف" اور "بے داغ چہرہ" سامنے آتا ہے، وہ جھوٹ اور فریب کو سچ اور حق کہنے کی وہ مثال ہے جو عرصے تک مغربی میڈیا کے متعلق عبرت آموز سبق دیتی رہے گی۔

انسان اپنے حامیوں اور مخالفوں دونوں سے پہچانا جاتا ہے۔ جس طرح بغاوت کی کامیابی پر دنیا بھر کے سیکولر ولبرل حضرات خوش نظر آرہے تھے اسی طرح بغاوت کو ناکام بنانے کیلئے ترکی کے علماو مشائخ اردگان کی حمایت میں نکل آئے۔ تصویر میں ترکی کے ایک مشہور عالم کا صاحبزادہ ایرپورٹ پہنچ کر باغیوں کی لینڈنگ ناممکن بنانے کی عوامی مہم کے دوران توحید کا اشارہ کر رہا ہے۔ دوسری تصویر میں حضرت شیخ محمود آفندی کے مریدین عوام کے ساتھ سڑکوں پر بیٹھے ہیں۔

بالا تبصرہ: گولن کے حامی باغی فوجی ہاتھ پیر بندھے باسفورس پل پر پڑے ہیں اور اردگان کے حامی سڑک پر شکرگزار ہیں۔

عوام ہوں یا خواص سب نے اردگان کی ملی وقومی خدمات کی بنا پر اس سے جس طرح کی محبت دکھائی اور بغاوت سے نفرت کا اظہار کیا، اس کی نظیر معاصر تاریخ میں نہیں۔ ایک لڑکا روٹی بیچ رہا ہے اور سینے پر لکھا ہے: ''ہم نے روٹی بیچی، پانی بیچا، وطن نہیں بیچا۔''

یہ ترکی کے ایک قہوہ خانے کی رسید ہے۔ ترک پولیس کا ایک گروپ اس قہوہ خانے پر چائے پینے کے لیے رکا۔ جب قہوہ خانے کے مالک سے قیمت پوچھی گئی تو اس نے یہ بل دیا جس پر لکھا تھا: ''اس چائے کی قیمت 14 اور 15'' کی درمیانی شب پولیس اہلکاروں اور عوام نے اپنے خون اور قربانیوں کی صورت میں ادا کردی ہے۔''

Adet	Cinsi	Tutarı
XX1	Çay	
XX	Poğaça	
XXX	Su	

Ücretini: 15-16 Temmuz tarihinde canlarınızla ve yoğun mesainizle ödediniz.
Afiyet olsun.

بغاوت کا انجام ان دو تصویروں سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اوپر زخمیوں کا ایوان صدر میں استقبال کیا جارہا ہے اور نیچے قبرستان کا وہ گوشہ جو گولن باغی حضرات کی آخری منزل کے طور پر مخصوص کیا گیا۔

اوپر کی تصویر میں صدارتی محل کی وہ مسجد نظر آرہی ہے جس میں بغاوت کی صبح صدر اردگان نے خود آذان دی۔

آج کا مغرب خود کو مہذب و متمدن کہلوانے پر اصرار کرتا ہے۔ زیرِ نظر دو تصویریں اس دعوے کی قلعی کھول رہی ہیں۔ یورپ ہجرت کرنے والے ایک شامی بچے کی لاش سمندر کے کنارے فریاد کر رہی ہے۔ دوسرا حیرت انگیز نظر سے "آج کے انسان" کو دیکھ رہا ہے جو مہاجرین کے لیے عالمی معاہدات کے باوجود اپنی سرزمین بند کیے کھڑا ہے۔

جہاں میں کہیں نہ امان ملی، جو امان ملی تو کہاں ملی؟

ایک بے آسرا شامی خاندان۔ نفسا نفسی کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اردگان اور اس کی جماعت کو شام کے مظلوم مسلمانوں کے لیے سہارا بنا دیا۔

مسجدیں ہماری چھاونیاں ہیں، اس کے گنبد ہمارے ہیلمٹ ہیں، اس کے مینار ہمارے میزائل ہیں، اور نمازی ہمارے سپاہی ہیں؛ پوری دنیا کو فتح کرنا ہمارا مشن ہے؛ اسلام غالب آکر رہے گا خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔
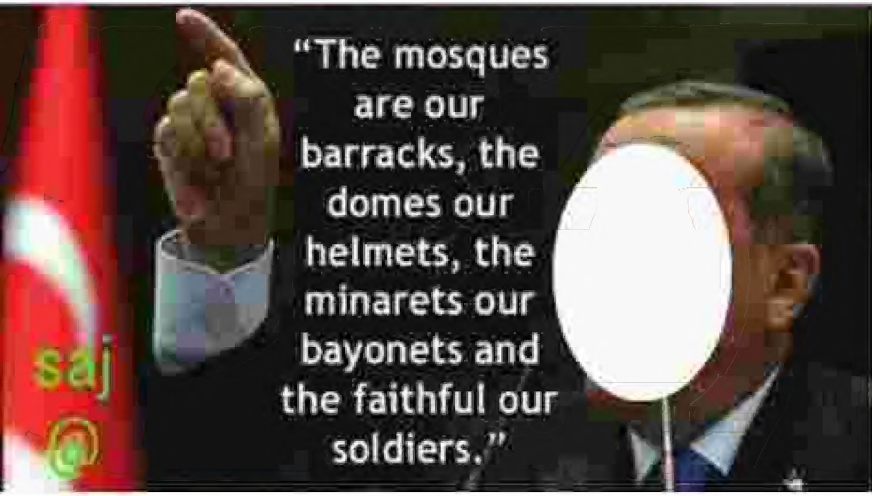
مغربی میڈیا کی طرف سے کسی شخص یا تحریک کے خلاف مہم میں کس قدر جھوٹ بولا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس تصویر سے ہو سکتا ہے۔ اس میں ان مشہور زمانہ اشعار کا ترجمہ ہے جو اردگان اور اس کی تحریک کے لوگ پڑھتے ہیں اور یہی اشعار پڑھنے پر اردگان پر پابندی بھی لگی تھی۔ ان کے ترجمے میں جان بوجھ کر اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے مقصود اہل مغرب کو اردگان کے خلاف بھڑکانا ہے۔ جو قارئین انگریزی نہیں جانتے وہ کسی انگریزی دان سے اس خیانت کو سمجھ لیں۔

عالم اسلام کا قریب آنا اور خصوصا پاکستان، سعودی عرب اور ترکی کو ایک دوسرے کا دست و بازو بن کر تمام عالم اسلام کی خدمت کرنا اس کتاب کا پیغام ہے۔

اسلام زندہ باد

امت مسلمہ پائندہ باد

Ref. #: ____________

Date : ____________

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

0092-42-7720944

فخامة الرئيس السيد طيب اردغان رئيس جمهوريه تركيا حفظه الله ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تسر جمعية علماء الاسلام باكستان بتقديم التهنئة والتبريك على ما نصركم الله وايدكم وحفظكم ورعاكم فيما حققها لشعب التركي من نجاح في مواجهة المحاولة الانقلابية العسكرية الفاشلة ووفق الله قيادتكم الرشيدة القبول الصادق في قلوب الاتراك الشقيقة

ان الشعب التركي العظيم قدم مثالا رائعا في الوحدة والمسئولية والاستعداد للتضحية دفاعا عن الوطن والحرية والديموقراطية والتصدى للخيانة والمؤامرة

MUFTI MUHAMMAD TAQI USMANI

Chairman Shariah Council, AAOIFI, Bahrain
Member International Islamic Fiqh Academy, Jeddah
Vice President Jamia Darul Uloom Karachi - Pakistan

المفتي محمد تقي العثماني

رئيس المجلس الشرعي [illegible]
وعضو مجمع الفقه الإسلامي الدولي
ونائب رئيس جامعة دار العلوم كراتشي باكستان

12 شوال 1437هـ/16 يوليو 2016م

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

أما بعد:

فخامة الرئيس رجب طيب أردوغان، رئيس جمهورية تركيا

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته. نرفع إليكم أسمى آيات التهنئة والتكريم على ما نصركم الله تعالى نصراً عزيزاً في خذل أهل البغي والطغيان، وأطفأ شرهم بقيادتكم الرشيدة ويقظة الشعب التركي الحبيب بصورة قلما يوجد نظيرها في تاريخ الأقوام والملل، حيث قام الشعب التركي بأجمعه ضد البغاة الطاغين، وأصبح سداً منيعاً أمام الدبابات والطائرات والقنابل الفتاكة، وليس له سلاح إلا شعارات التكبير، والثقة بالله، وعزمه الصارم، ورسالته الخالدة، وعواطف التضحية للبلاد [illegible]، والتي تغبط وتفتخر بها الأمة الإسلامية قاطبة في مشارق الأرض ومغاربها.

خلافت عثمانیہ کے ساتھ تاریخی تعلقات ہمارے اکابرین کا وہ سنہری ورثہ ہیں جو ان کی ایمانی بصیرت اور عالمی سوچ کے آئینہ دار ہیں۔ 14 جولائی 2016 کی ناکام بغاوت کے بعد بھیجے گئے درج بالا مکاتیب ان تعلقات کی تجدید اور تسلسل کا قابل فخر نمونہ ہیں۔